برائے ریکارڈ

خدابخش لائبریری

جرنل

۲۱ ۲۲ ۲۳

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۲،۲۴/۸۰

اکیسواں، بائیسواں اور تئیسواں شمارہ ۱۹۸۲ء

اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت : ۴۵ رُپے

سالانہ خریداری	اندرون ملک	:	۶۰ رُپے
	پاکستان	:	۱۲ ڈالر
	یوروپ	:	۸ پونڈ
	امریکا اور دیگر ممالک	:	۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے اُردو حصہ نظیر لیتھو پریس نور منزل لین پٹنہ ۴ میں اور انگریزی حصہ ہندوستان پرنٹنگ ورکس، رامپور (یو.پی) میں چھپوا کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

●●

اس شمارے کے لکھنے والے

- ڈاکٹر برکات احمد: (پ ۱۹۱۹ء) سڈنی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے؛ امریکن یونیورسٹی بیروت سے پی ایچ ڈی اور تہران یونیورسٹی سے ڈی لٹ۔ مختلف ممالک میں ہند کے ہائی کمشنر۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۵ ملاحظہ ہو۔
- جناب حسنین سید: (پ ۱۹۱۷ء) ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی اے؛ جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے سابق ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالہ "جوہر" کے سابق ایڈیٹر۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۷۴ ملاحظہ ہو۔
- ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی: (پ ۱۹۲۴ء) قاہرہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، علیگڑھ سے عربی ادب میں پی ایچ ڈی؛ یکم مارچ ۱۹۸۳ء سے کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۸۷ ملاحظہ ہو۔
- جناب اشتیاق محمد خاں: (پ ۱۹۳۱ء) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بی اے اور بی ایڈ۔ علیگڑھ کے محبوب ترانے کی دُھن کے خالق۔ بمبئی میں یونین بینک آف انڈیا میں کنزیکٹا آفیسر ہیں اور جعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل کے وارڈن۔ تفصیل کیلئے صفحہ ۲۰۶ ملاحظہ ہو۔
- جناب امان اللہ خاں شیروانی: (پ ۱۹۲۶ء) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور برمنگھم یونیورسٹی (برطانیا) سے تعلیم یافتہ، معاشیات اور سیاسیات میں ایم اے۔ ایک تعلیمی پروجکٹ کے لئے حکومت اتر پردیش کی طرف سے انعام یافتہ۔ تفصیل کیلئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۱۴ ملاحظہ ہو۔
- ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس: (پ ۱۸۹۷ء انتقال) علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے، لندن سے پی ایچ ڈی۔ کالج آف کامرس پٹنہ کے سابق پرنسپل۔ فروری ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۲۴ ملاحظہ ہو۔
- جناب سید بہار الدین احمد: (پ ۱۹۱۱ء) بہار کے سابق ڈسٹرکٹ سیشن جج۔ ۱۹۷۶ء میں بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۴ ملاحظہ ہو۔
- جناب سعید انصاری: (پ ۱۹۰۴ء) کاشی ودیاپیٹھ بنارس اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ سے تعلیم یافتہ؛ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے تعلیمات میں ڈگری۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۶ ملاحظہ ہو۔
- حکیم عبدالاحد: (پ ۱۹۱۲ء) مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے عالم اور طبیہ کالج دہلی سے فاضل طب و جراحت، حکومت بہار کے شعبۂ صحت عامہ کی طبی شاخ کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۳ ملاحظہ ہو۔
- جناب اونل فے: (پ ۱۹۱۹ء) پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء بہار اکیڈمی آف میوزک ڈانس اینڈ ڈراما کے اسوسیٹ سکریٹری رہے۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۹ ملاحظہ ہو۔
- حکیم ظل الرحمٰن: (پ ۱۹۴۰ء) دارالعلوم ندوہ اور اجمل خاں طبیہ کالج، علیگڑھ کے تعلیم یافتہ، ۱۹۷۸ء سے شعبۂ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے صدر شعبہ ہیں۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۴۵ ملاحظہ ہو۔
- جناب نقی احمد ارشاد: (پ ۱۹۳۰ء) سید حسین خلف شاد عظیم آبادی کے صاحبزادے، تاریخ میں ایم اے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈپٹی اور ۱۹۷۷ء میں جوائنٹ سکریٹری ہوئے، ۱۹۷۹ء میں پنشن پائی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۴۹ ملاحظہ ہو۔
- جناب عبدالحی بیتاب صدیقی: (پ ۱۹۲۷ء) مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل، جنگ آزادی کے رضاکاروں میں سے ایک، پہلے جرنلسٹ تھے، پھر ۱۹۴۹ء سے رام موہن رائے سمنری میں اردو فارسی کے استاد ہیں۔ تفصیل کیلئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۵۳ ملاحظہ ہو۔
- جناب سید محمد احمد: (پ ۱۹۳۵ء) علیگڑھ سے ابتدائی تعلیم، رانچی سے زراعت و کاشتکاری میں ڈگری اور ٹوکلائی (آسام) سے چلے کا اعلیٰ ڈپلوما۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۵۷ ملاحظہ ہو۔

• شاہ ریاض الرحمٰن: (پ ۱۹۲۱ء) پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، پٹنہ میونسپل کارپوریشن کے سابق ممبر۔ تفصیل کے لیے صفحہ ۲۶۰ ملاحظہ ہو۔

• جناب انوار کریم: (پ ۱۹۱۶ء) ۱۹۳۹ء میں علیگڑھ سے ریاضی میں ایم ایس سی، ۱۹۴۱ء میں بہار میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں آئی اے ایس کے سینیئر اسکیل پر ترقی پائی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۱ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر مسعود الحق: (پ ۱۹۰۱ء) پٹنہ میڈیکل کالج سے گریجویشن، پٹنہ میڈیکل کالج کے شعبۂ اناٹومی کے سابق صدر اور نالندہ میڈیکل کالج پٹنہ کے سابق پروفیسر ایمریٹس۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۴ ملاحظہ ہو۔

• جناب سید علی عباس: (پ ۱۹۱۱ء) پٹنہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، ۱۹۳۶ء میں انڈین پولس سروس (آئی۔ پی۔ ایس) میں داخل ہوئے۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۵ ملاحظہ ہو۔

• جناب حسن احمد قادری: (پ ۱۹۲۳ء) ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے تعلیم یافتہ۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۸ ملاحظہ ہو۔

• جناب سید احمد علی آزاد: (پ ۱۹۰۷ء) جامعہ سے تعلیم یافتہ، جامعہ کے جاں نثاروں میں سر فہرست، ۱۹۷۶ء میں وفات۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۹ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر رشید الوحیدی: (پ ۱۹۴۳ء) دیوبند سے فاضل، دہلی یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی، ۱۹۷۳ء سے جامعہ میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۲ ملاحظہ ہو۔

• جناب سدانند منڈل: (پ ۱۹۳۶ء) سبور ایگریکلچر کالج (بھاگلپور) سے زراعت میں ڈگری۔ راج بھون پٹنہ میں شعبۂ باغبانی کے انچارج ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۳ ملاحظہ ہو۔

• حکیم اشرف کریم: (پ ۱۹۲۳ء) مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے سابق پرنسپل۔ تفصیل کے لیے صفحہ ۲۷۶ ملاحظہ ہو۔

• جناب شاہد رام نگری: (پ ۱۹۲۷ء) ابوالکلام اکادمی کے "الکلام" کے سابق ایڈیٹر اور امارت شرعیہ بہار کے ترجمان "نقیب" کے مدیر اعلیٰ۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۷ ملاحظہ ہو۔

• جناب محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی: (پ ۱۹۲۹ء) جامعہ کے تعلیم یافتہ، آگرہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے، دیدار بخش ہائی اسکول بیرنگر پورنیہ سے منسلک۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۸۱ ملاحظہ ہو۔

• جناب شاہ منظر حسین: (پ ۱۹۲۴ء تقریباً) علیگڑھ کے بی۔ ایس سی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۹۹ ملاحظہ ہو۔

• پروفیسر سید وحید الدین: (پ ۱۹۰۹ء) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور ماربرگ یونیورسٹی جرمنی سے تعلیم یافتہ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے سابق پروفیسر اور صدر شعبہ، ۱۹۷۳ء سے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن نئی دہلی میں ریسرچ پروفیسر اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کے شعبۂ فلسفۂ مذاہب کے صدر۔

تصانیف: فلسفہ، تصوف، اخلاقیات اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ اقبال، حافظ، گوئٹے وغیرہ پر پچیس سے زائد کتابوں کے مصنف۔ آپ کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی جو جرمن زبان میں "تجربۂ قدر" (Experience of value) کے نام سے ہے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔

(بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱، ۱۲، ۱۹ اور ۲۰)

پیش گفتار

دیوانِ موبد : یہ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ پر پہلی معروضی کتاب "دبستانِ مذاہب" (جو غلط طور پر محسن فانی سے منسوب چلی آتی ہے) کے مصنف کا دیوان ہے، جس کا تخلص موبد تھا۔ دبستانِ مذاہب کی نولکشوری طباعت کا آغاز مندرجہ ذیل غزل سے ہوتا ہے، جو دیوان کے صفحہ ۲۷ پر دیکھی جا سکتی ہے:

ای نام تو سردفتر اطفال دبستان ✣ یاد تو بہ بالغ خردان شمع شبستان الخ

دیوان کا یہ نسخہ جو غزلیات، مثنویات، قطعات، رباعیات اور فردیات پر مشتمل ہے، اب تک کی اطلاعات کے مطابق دنیا کا واحد نسخہ ہے جو خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ نسخۂ خدابخش کا عکس پیش خدمت ہے۔

یہ دیوان جو "املاً" ۱۱۰ اوراق پر مشتمل ہے اور جو ۱۹۶۰ء میں خدابخش لائبریری میں منجملہ متعدد پارسی دینی کتابوں کے ایک پارسی کی معرفت "داخل ہوا"۔ قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) کی رائے میں اس دیوان کا مصنف 'موبد' دراصل آذر کیوان کا بیٹا ہے۔ اور آذر کیوان آبادیوں / ساسیوں / آذریوں کا پیغمبر ہے جو اکبر کے عہد میں ایران سے ہندستان آیا اور عہد جہانگیر میں جس کا انتقال پٹنہ میں ہوا۔

مشکل پسندی کی وجہ سے موبد نے اپنے دیوان کی تدوین کو خاصا دشوار بنا دیا ہے۔ دیوان موبد کے کاتب نے 'نہلے پر دہلا' لا کے جا بجا ایسی بے احتیاطی یا لاپرواہی کے ساتھ لکھا ہے کہ موبد کی مغلق پسند روح مزید خوش ہوئی ہوگی کہ میرا اصل قدرداں تو یہ کاتب نکلا جس نے ہر پانچویں شعر کو شمع کا معمہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ یہ عکسی پیشکش اس لحاظ سے ہند و ایران کے فارسی عالموں کی امتحان گاہ بن جاتی ہے، اس امر کی آزمائش کے لیے کہ اس کے متن کو کہاں تک صحت کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔

موبد، جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۵ھ کے آس پاس پٹنہ میں پیدا ہوا۔ والد کے بچپن میں انتقال کے بعد اپنے مربی موبد ہوشیار کے ساتھ ۱۰۳۳ھ میں بنارس میں کچھ عرصہ چتروید اور گنیش من برہمنوں میں گزار کے اکبرآباد میں مقیم ہو گیا۔ ۱۰۴۰ھ سے ۱۰۵۲ھ تک وہ کشمیر اور پنجاب (خاص کر لاہور) میں گشت کرتا رہا۔ ۱۰۵۳ھ میں لاہور سے کابل ہوتا ہوا مشہد پہنچا۔ ۱۰۵۴ھ میں ملتان ہوتا ہوا ہندستان کے مختلف مقامات میں پھرتا پھراتا ۱۰۵۷ھ میں حیدرآباد ہو کے پھر سورت آیا۔ ۱۰۵۹ھ میں اور پھر ۱۰۶۳ھ میں چندے اڑیسہ کے اس وقت کے

دارالسلطنت سری کا کل میں اس کے قیام کے شواہد ملتے ہیں (یہ سب شواہد خود دبستانِ مذاہب میں پائے جاتے ہیں)

موبد ایک اہم علامت ہے اس معروضی علمی بیداری اور سچ کی پیاس کی جو سولھویں صدی کے اواسط میں شروع ہوئی اور سترھویں صدی کے اواخر تک چلتی رہی۔

اس پیاس اور اس بیداری کا جیسا اظہار دبستانِ مذاہب کی شکل میں ہوا، اس سے بہتر ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ ایک معروضی مطالعہ تھا۔ اس میں وہ اپنے ذاتی افکار و عقاید کو منعکس نہیں کر سکتا تھا ورنہ معروضیت کا توازن کھو بیٹھتا۔ اس کے لیے اظہار کا راستہ اُس نے فنِ شعر میں تلاش کیا اور دیوان کی صورت میں وہ سترھویں صدی میں دانشوری کی ایک اہم دستاویز محفوظ کر گیا! اس دانشوری کے پرت مطالعہ کے بعد آپ پر خود ہی کھلتے چلے جائیں گے، میں چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں:

دانشوری اور ابلہی کے مختلف جہات پر کسی ایک شاعر نے بھی ہیچ کے اور پلٹ پلٹ کے اتنا اور ایسا کچھ ابھی تک نہیں لکھا جتنا اور جیسا موبد لکھ گیا۔ چند شعروں سے اندازہ کیجیے:

زیرکی اندوہ زا و عاقلی ایذا بود　　　ابلہی دنیا فزا و ابلہان جنت فزا
ابلہی دارد حبیق راحتی آسان در وطن　　　بوعلی از دانش خود میگریزد جا بجا
پای فرعون است بر تخت فتن آسانی بخواب　　　باید بیضا شتابی میکند موسای ما
من گنگ خواب دیده و عالم تمام کر　　　بی بہرہ من ز گفتن و قوم از شنیدن اند
موبد زبان دراز مکن زانکه ابلہاں　　　از گفتہای خود ہمہ در لب گزیدن اند

ہندستان کے عہد ما بعد کے عظیم ترین دانشور شاعروں کی پیشرو آواز جس صفائی سے دیوانِ موبد میں سُنائی دیتی ہے دوسری کسی جگہ مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلے میں پہلے موبد کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو پھر چند شعر:

جمعی از پروانگان گفتند با پروانۂ　　　رو برای ما خبر آر از چراغ خانۂ
زین سخن پروانۂ بیرون شد و ہم بازگشت　　　گفت دیدم گشتہ روشن شمع در کاشانۂ
زان میان پروانۂ خندید و گفت ای بیخبر　　　یا نۂ پروانۂ یا گفتی در دغ افسانۂ

از گدائی و شہی فرقی جز این ظاہر نشد　　　سنگ شہ را بر سر و درویش را زیر سر است

این کعبہ و بتخانہ دو جلوۂ یک ذات است　　　اینجا حجر الاسود آنجای جگناتست

موبد ما آن کہ ز اوّل خرد آزادہ ہاست　　　تا کہ ترک مذہب و ملت بکرد اسلامست

رستگان رانکر دین و مذہب وارشاد نیست   آنکہ او در بند آزاد نیست ہم آزاد نیست
جز وجود گو ہر عرفان درین فانی سرا   آدمی را بہرہ غیر از خور د و مرد و زاد نیست
دوزخ و رنج و عذاب قبر، بدخوئی بود   خُلق نیکو بود خواہد حور و غلمان شما
فرداست وعدہ گوید دیدار دوست زاہد   موبد ترا خدا داد امروز چشم فردا
از مسلمانی و طاعت میگریزم زاہدان   تا نگردد از وجودم تنگ جنت بر شما
برای خویش خواہد ہر کسی کس   ز بہر کس نخواہد کس کسی را
چون کشور خوبی ہمہ را محبوبست   ہر راہ بسوی خانۂ مطلوبست
پوئندۂ ہیچ کیش گمرہ نبود   از ہر رہ و ہر کو کہ در آیی خوبست
واقف ز دین احمد ای فقیہہ نیست   از عالمان مجوی رہ انبیا نہ را
از سجدہ و قدسیاں ہمگی آدمی شدند   باشد خدای آدم و ہم آدمی خدا
بگذشت ثلث عمر اطاعت ولی چہ سود   چون زین دوگانہ روی تو بیم یگانہ را
غسل و تیمم تو نمازی نمی شود   با حرص ز آب زمزم و از خاک کربلا
وقت نماز مرتبۂ آدمی بود   دریاب وقت را کہ مبادا شود قضا
پا بر فراز عرش بنہ و دست زن بدوست   بگزار گفش جسم نشیب آشیانہ را
نی مسلمانم نہ مومن زین سبب روز جزا   حشر من جز با خدا با دیگری نبود روا
بہشت چیست جز ادراک مطلب موبد   صراط دقّت معنی کہ در کلام منست

موبد کے بارے میں اشعار میر کی طرح میں یہ تو نہیں کہتا کہ پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند لیکن جا بجا وہ اچھا خاصا فضول گو نظر آتا ہے، اور کبھی کبھی تو شبہہ ہوتا ہے کہ یہ شخص محض اپنے چھلکتے ہوئے جامِ علم کی نمائش کر رہا ہے۔ اس کے باوجود جہاں جہاں وہ سنجیدہ ہے اور راست اظہار پر تُل گیا ہے، اپنے معاصروں سے بڑھ گیا ہے۔ کس کا جگرا ہے کہ ہندستانی دانشوروں کے ارتقائی منازل کی مختصر ترین تاریخ میں بھی ان اشعار میں سموئی ہوئی کنواری فکر کو نظر انداز کر سکے! ●●

اہلِ نظر فارسی دانوں کی خدمت میں : غلط نویس کم سواد کاتب کے ہاتھوں ریش ریش اور داغ داغ اس مشکل پسند لیکن بڑے شاعر کے دیوان کے اس تنہا خطی نسخہ کے متن کی اشاعت صحیح قرأت کے ساتھ منظور ہے۔ یہ تنقیدی متن تیار کرنے کے لیے تمہیدی مرحلے کے طور پر اس عکسی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک پروف نسخہ بھی لگ کے چھاپ لیا گیا ہے، جو اہل نظر کے آخری مشوروں کے بعد اشاعت پذیر ہوگا۔ عکسی اشاعت تو اس جرنل میں شامل ہے۔ یہ تمہیدی (پروف) نسخہ تحفۃً ہند و پاک کے ان تمام اہلِ نظر فارسی دانوں کی خدمت میں ان کی فرمائش پر بھیجا جا سکتا ہے جو اس کام میں شرکت کرنا پسند کریں گے اور جن کی فرمائش لائبریری کو موصول ہو گی۔ پھر انھیں یہ زحمت کرنی ہوگی کہ پروف کاپی اور اس اصل (عکسی اشاعت) کو سامنے رکھ کے پروف کاپی کے حاشیہ پر اپنی تصیحات اندراج کرتے جائیں۔ ان کی تصیحات موصول ہونے پر ان کے نام اور شکریہ کے ساتھ تنقیدی متن میں درج کی جائیں گی۔ اس طور پر یہ دیوان، جس کا تمہیدی نقش تیار کر دیا گیا ہے، ایک مشترکہ پنچایتی کام ہوگا، اپنی نوعیت کا پہلا کام، ——— جو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اس دیوان کے باب میں ضروری تھا!

پروف کاپی کی 'تصیح اغلاط' کے سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ 'نقطوں' شوشوں کی طباعتی اغلاط' ایسی جو قاری خود ہی بآسانی درست کر سکے، ان کی طرف توجہ دلانا ضروری نہیں ہے۔ تصیح ان واقعی اغلاط کی کرنی ہے جو غلط کتابت یا غلط قراءت کے نتیجہ میں پروف کاپی میں راہ پا گئی ہیں۔ تصیح کا کام جاری ہے اور اس میں اہل نظر کی شرکت کی توقع بھی جاری ہے۔

اہل نظر کے مشوروں کا ہمیں نومبر تک انتظار رہے گا۔ دیوان کا یہ تنقیدی متن ان مشوروں کی روشنی میں دسمبر ۱۹۸۳ء میں شائع کر دیا جائے گا۔

●●

دیوان موبد

(نسخہ خطی)

مخزونہ

خدابخش لائبریری، پٹنہ

بنام ایزد بخش بنده بخش تکیه مهربان

ای برتر از حواله ذات و صفات ما … در ما چگونه شده پنهان ز ذات ما
هر صنعت کرده ذات تو در جهت … ای بی جهت چگونه اندر جهات ما
ما را ببار کشت ز آغاز کار نیست … چون نیستیم چیست فنا و ثبات ما
در وصل و فصل نیست تو صلش هر ایکار … از اصل ما لیفصل نیا مدبرات ما
فرعونی و موسائی بی نار جدل دیدم
تا قطره زدم موید دریای محبت را
دستان جنگ رو بمن تن مونی زنم ها … جلوه سیمین تنان شایسته میدانیم ما
چین ابروی بتان پیوسته از کرده … چون ز ما چین بر جبین دارند خاتونهاء
بیدود در ما دلایل پالی از دانش وری … شهر بشهر چو ز خسروی بر هانیم ما

آبجو از بهر فراز آورد بخش کردد ظهیر … کرد کندم چون نبات کینه ور کردد
آشنای ما نشد بیگانه در بحر وجود … ناخدائی میکند در کشتی مو بد خدا

جو خسرو ندارد تیشه فرهاد ما … ورنه تقصیری کز شیرین نمیت امداد ها
سنک راه وصل شیرین فرق کوه کن … تا نباشد فرق بی سرگشت از ارشاد ها
یاری از کس چون نمی بینیم بی یاریم ما … نیست چون ما رنجه کس مانند کی داریم ما
بیکس و یاریم و همتا لیک می نجد فقیه … نزد او زین راستی سر خیل کفاریم ما
جمع کی کردد حدیث ما و قول زاهدان … پرده داران دیشان پرده برداریم
دست و همکی رسد با گرفته پای نگار … لشکر منصور را سرهنگ و سرداریم ما
خرق تیغ آبدار ماند از دو التیام … کز زبان موبدان ذو الفقار آریم ما
آشنا بود است ذری با سبوی می از آن … کاسه سر را بدوش خویش میداریم ما
با وجود که سلوکهای بخت دیر خواب … شکوه از اخلاق یاران هم کسی داریم ما
مصطفی را همتیم و بو لهب را دولتیم … با فریدون اختر و ضحاک را ماریم ما
نیزه سامی قلم شمشیر بهرامی زبان … دستگاه بهمنی هنگام بیکاریم ما
خرق تیغ آبدار ماند از دو التیام … ذو الفقار خامه را هو بد چو برداریم ما
بر ما تو نداد دندان پی افشان نشانرا … چون نیست به یمنی مرشد ما

بهادر [illegible] دنر از پی نشان نشانرا — چون هستی چرچنی هر هستی نهان را
ارغایت عیانی و خفیت گوهراد — موبد چگونه دید پوشیده سان را

بر شاه است ایوانان مردم آگاه را — تاج و تخت کشور تحقیق زیبد شاه را
تاکنون از هم جدا بد دولت و دنیا و دین — جمع کرشه دیدم آن دارائی و دین جاه را
در بلندی آستانش آسمان نه فلک — نیست سوی در کمش ره چرخ سال و ماه را
گرچه در درویشی انبازند درویشان هم — کی سزد همسر شدن با ژرف دریا چاه را
لو درویشان دیگر نیست جز بیکو جها — نیست با بیکو چه نسبت شاه راه شاه را

آغاز ما ستایید انجام کا شمارا
نبود جدائی اصلا موبد ستا و مارا

از گل چشم است چشم با بهاران آشنا — می توان گشت من آنگه بهاران آشنا
عشق را راهی است بس دشوار دانند ره پیر — غیر جانبازی که شد با جان بسیاران آشنا
پا به دامان بیشتر رفتند من در پای دار — کی توانند خود کیش [illegible] آشنا
[illegible] معنی بیگانه شد موبد دلم — نیست لفظ من عجوزی [illegible]
من چراغ دوده زردشت نورد ختم زبا — آنکه با ما [illegible] زردشت [illegible]

آذر زردشت میگوید دست شهر خرمت — چون کرد زردشت [illegible] باز بند ازل امروز
رفته از نا پیدا و کتاب تا مینو روان — یافت زر دهب سیاوش شاه و عادل [illegible]
گر از زدان هستی کو [illegible] زر دیا لب شد — گشت روئین تن از و اسفندیار [illegible]
یافت زر و خوان دم زریر از چار [illegible] — از اشارات و عالم [illegible] داد و شفا
خورش زردشت جان بخش زند [illegible] — آذر زردشت باشد اعتدال خشم ما
مرکب روح است تن در باب [illegible] بهشت — پارسائی و شجاعت حکمت و داد است پا
تا نخست چون رودیش تن [illegible] طفل [illegible] — عارف یزدان شده جاماسب [illegible]
جان و دل باشد زر [illegible] حضرت [illegible] سیاه — جهل بیجا است عرفان گشت [illegible]
ملکت تن را دل بخ قوت زند جان زردشت شد — عقل موبد جبرئیل او همچو ان و هم را

پوینده و چو هست چون موجد را — واجب بود ارشاد به دو مرشد را
عقلان به راست و نقل او نیست غلط — یارب بخرد حشر کنی موبد را

شده دعای شبی باید ابروی شما — [illegible] ادعیه خوانی حلقه موی شما
زنده درمان روای ماست عشق موی تان — سرکرده چنیان شدی خوی شما
از آنکه شتق ارغوان [illegible] چشم شهلا [illegible] — آب چشم در ورس افتاده در کوی شما

لیلة القدر و برات از زلف و رو گفت | روز نوروز هم آمد پرتوی روی شما

زیر راست صد کمان دیدیم الفهای شما | مصدر هر شبهه شکست برهان شما
هم روان آصف خرد تن اهرمن شد خوار | بر سلیمان حکم میراند دیوان شما
الکنائی و طمع چون کردید از یکجائی | میرود آزرده خاطر خانه مهمان شما
آرزوی دیدن قوم و وطن دارید لیک | صاحب جا بند خویشان چیست سامان شما
گوهر آب طبائت ار فیض خدا | باز خواهد ماندن این لعل بدخشان شما
خلق را خلق بد انباز است زانرو غافلند | ادمیدا مانده است این نفس شیطان شما
مار و دانه هوس امروز اگر طاوس دار | میکند از جلوهٔ مینو نیزه الوان شما
دوزخ و رنج و عذاب تیره خوئی بود | خلق نیکو بود خواهد حور و غلمان شما
شاخی از طوبیست میکویند در هر خانه | میدهد آن بر که خواهد زود داد جان شما
زین اشارات عقل را خواهد که طوبی داد | خانهای جنت تحقیق ابدان شما
چراغ تن عنصر هم باشد بر نیروی عقل | با مثالی تن توانند بود جولان شما
روح یوسف عنصری تن چو توی اخوان او
حضرت عقلست موید بر کنعان شما
آغاز کهی گشته سرانجام مهی را | انجام مهی بر خورد آغاز کهی را

دل را بجهان گذران رسته نبندد | زنجیر شود آب روان سرو سهی را
از دام چو طمع رفت گدا خسرو وقتست | بالنفس طمع نفس گدا است شهی را
چون آتش می را مزه تا باست بهی و خوش | گر باشه گرفتیم دل دین بهی را
دارند معنبر ز ملکان تاج مرصع | هر گونه زند سنگ فلک تاج شهی را
وارسته چو موید شو از دیدهٔ انصاف | اسباب گدائی است مگر یاد شهی را

دو صدی بی سیصدی بود است از جوش خط | جز هزاری زاده نبود با نصدی رای خط
ششهزاری کی شوی موید درین دوران خموش | هفت هزاری کس نشد جز بوالبشر ز اجداد ما

لب نوش تو جان بخشید خط حفظ نما | خط یاقوت خرانا ساخت روی مصحف آسا را
شدی تا چار ابرو چار مصحف آشکارا شد | بدین سان ارزدادی چار مصحف خاص و الا را
خط او خال فرقان خوب است تفسیر | ز عنبر زد رقم کتاب پیشاوی بیضا را
چو با خاقان چین ابروی دلدار پیوستم | ز ابرویم مردم خوار دیدم کیش ترسا را
ز ابروی کمان در ناوک مژگان مسلمانی | بر انگیزی چنین چنگیز حقیقت نیست یاسا را
رخ او کعبه اما دور از راه مسلمانیست | بچین زلف او پیچیده دیدم راه ترسا را
شه ایران رود کام از می کوثر لب داده | بلکه گون موید به پیماره تر راده
عزوراری هنوز فیابم مشارا

دل الهی

بادت ... اسلام ... بشتر اند   بگلگون می ای موبد به بیماره تر سارا

مشکاف بنیاز نیست بشکافته را   شایسته کانقل بود کافته را
زو نیست فریب خورده تر در عالم   آنکس که وجد یافته نایافته را

میتوان کشیرین خسرو جاه خواندن یار را   داد داز کوی ذقن چون نسیم دآ افشار را
از لب لعل دو دُر دندان دالماس سخن   گنج دارد بنگر از زلف سیاهش مار را
از ترشرویی ذقن را کردی آچار ترنج   پند بشنو نیست نه کمتدار نوک آچار را
غیر خانی کرچه ابزار است بهر زبان   بد بود از کفشش لا تهوری درم دستار را
غبار دل بود سد سکندر دستدار انرا   رفقش کل چه غنچه است خار فرقت دلدار یار را
روشن اباد است روی زلف تا بر بستان ترا   مید ملاز پیش صبح و میدود شام
عالم بالا جنس این بالا بلا بالا مجوی   شهر بالا پور بالای بتان باشد مرا
فطرت را ز بالا و ز بلا یا ... کس   دل چو بالا جوی کشد پیوند زین بالا بلا
... تست و بالا هستی هستی   چون روی بالای لا بنگر سوی الا و لا
... بالا فوق بالا عین ... کشی   این بود الا ... این خود ... برا
ما سوا الله لفت ممکن را فقیه مدرسه   ما سوی ... الا ... یا ... خدا ... جو ... یا

بکر بر خاک درت سودیم شد   آینه آینه را نو ... ما
از سحاب حادثات املا یذید   آفتاب بخت مو ... ما

فلک زاختر زند سنگم بمینا   به کام من نگشت این ساغر ...
... اختر ... کودی   جبل ذب میکند زینده دیا
ندارد مستقیم احوالم از کین   که او نار است ره من ... پیا
بنفس کام بر پا م ... بند   زر ک بر دست من ... ما
زاختر جز خطر ناید به پیشم   جز از گردون نیست گردون ... جا
نه گردون کهت گردون از چه دارد   نبر بر پای دونان فرق دانا
جهان با بود خویش نیز درگر دست   چو شور اکشت عقدش کشت شورا
زدست دهر بجا یدلانم   بیای آه راه بام حضرا
چو نای نای کالکست از تن من   دسلی در نار باشد صور آور
مراز تهمات امید بر خاست   بجویم آب قدر خود ز آبا
ز ابر آسا بروی بحر اشکم   چو کریم کرد این دو لا لب ... لا
ز نیل گریه ام از پا در افتد   اساس قصر این نه بام ...

دلی او بر ستون آه من ماند — ز دست گریه ام زین گونه بر پا
شکافد آهم جوشن چرخ — بحرق ار چه بود داود بذیرا
تم نیل لباسی راهب آمد — غبار بخت من در شام غبرا
مرا از رشته مریم چه باشد — چو در حلقم رسن کردند آنرا
چو بینم مرغ عیسی تیره بختم — روانم عین روح الله اما
مآل آتش من غم برایم — کمین بنویسم و مال از درکرد
زحل طبعی حساب از من ستاند — گر بنویسم بکلک تیره اسما
نه بیند پیش خود بشم چرخ ازرق — ره سر روزه چون عید بد زرقا
مرا دارد به بند تیره روزی — بشب روشن چراغ از دی برابا
مرا دلهد چار بند عنوان آرد — نه بینی سیه صدی باشد آنا
ذلیلی را ذلیل خویشتن کرد — عزیز مصر عزت شد سلیما
زنیکو قتل در دل درد کرد — وحیدا در فنیاو معتما
مدان منجلی میان حیلا در حیرت — کفن چو را کتن تهود بهر مردا
برای مرگ داد کشی مرحانی — بامر خویش این چرخ تبه ارا
لب دربان بدو جرح بخیه دارد — چو جوجی مجلس لغوای بغیرا
منم عریان قتل در بیک دارد — غلام در پی دو رشید کمی

پیاده ای سپهر من در ره غم — سوار اسب از دیول در دغدغی بغا
تهلی بوش ایدوم [illegible] — لحاف انداز خاتم خطی اقا
شد ایوتوک خان آیت [illegible] — کیک ولیشیش برن [illegible]
برای انهدام کعبه دل — هزاران فیل نا محمود پیدا
رهای گلگری زن بلبل روز — خروس بیکوی شبخوان رنیعا
بتکیه پهلوان بنبه بالش — بصحرا مانده بر بالین زنبرها
بلبخی نرم کرد این چرخ خوارم — مرا شد فرش خارا سنگ خارا
برهنه رهن غم در دخت باشم — بشهر آیم بیرا فکنده چو چا
نزنم هیچ کام از شاد کامی — سواد هند بیمودم به بودا
مکوبید اسهت طالع نیک خود — کراز لیمو مرا افسرده صفرا
زعیلی غیر دست خرنمانده است — بقول اهل دین در دار دنیا
چو علیی باید ار ایدر غمانده — چرا می بخشد ز دست خر زبها
زیکدار بلا بگریخت عیسی — برادرین می جوید نصارا
زکردون یاری عیسی ندید هست — یهودی بدیه برکشد بر مسیحا
تاسف چیست کر یوسف بچه رفت — نه آخر کور شد همه بودا
امان از قول خواهد ابن یامین — عقب یعقوب را ماند ابنها

اگر یعقوب نبی و نی غنی بود   بگو چون این با بین شد هویدا
برای خویش خواهد هر کسی کس   ز بهر کس نخواهد کس کسی را
دلی کاول ندید از معرفت جلا   در آخر نه زیبد کس ز کس حاجا
اگر آبانه اند چار ما در   روا انشر درای جنس بر دیا
زنا شد کار کردون با عناصر   برای حد زن از شرعست مرا
موالید نو چون زینکو نزاده   حلال ای دل کر زاینده است حالا
عجب نبود کر از تایید شعرم   شود خامه درخت دست موسی
روان آبی ز اشکم بجز آبی مردم   ز چشم خانه مهمان را مهیا
ز صورت سیرت خود دارانم   حراکر داند ز بند بیدلی ا
منیره دری و بیشتر روانم   تهمتن همه در تن چاه بلدا
ز فیض دانش توحید جز خود   اگر جویی ندارم یار و هم
ز بس وارسته ام از کر خود   نخواهم بودن با خویش مانا
صدف کونین در آن [illegible]   چو ذاتم گوهر یا آب یکتا
ز دست سیلی دوران و   نبودم بوده پهلو چرخ آسا
در آب و گل دلی دارم که چو بد   فروغ نورش از بیضا دی [illegible]
وجود دوستان معدوم [illegible]   عدو آسا فسر و انندم اعدا

ز یاران هیچکه یاری ندیدم   خبر از یار و نه همت را [illegible]
[illegible] ت دوستان در ماند کم   نشد دشنام دشمن رنجش افزا
شد و می ردی اهلیت ندیدم   از برانی جدا کشتم از ایرا
نهاد هستند از راستی نیست   بسان هند پای بوده اجزا
ز ترکان ترک دیدم مردمی را   ز تورانی بدین کردم تبرا
نمی خواهم ملک [illegible] مردم ملک را   نه در تسخیر مردم دارم ابها
بانگ نی ز آرزوی خویش بانم   نه از جفتای دارم چشم اعطا
نمانم سر بدر کاه قزلباش   نباشد آز چون او باش حمرا
مرا از مادر عنصر طلب نیست   ز جهو تیلی بی پی و هم از بطا
مرا از [illegible] دم عنصر هست فریاد   که هم در خار چشم است غوغا
ز [illegible] نفس لختی باز گویم   بدل کو مست تال حق تعالی
ازین سه کر هست از چار عنصر   نکشتم نیغ فرخم فوت [illegible]
جهات سته را چون شب کرفتی   [illegible] هفت کشور مرد پاما
نه بهشت جنت بهر نزد [illegible]   [illegible] زبانم [illegible] کرد دست کویا
چو زکند زمین کشتی فرود [illegible]   [illegible] ظلمت شب صبح پیدا
سر خود دراز ا ذمی نهادم   نه جواب پدم ای [illegible]

هنوزم سال کم بود است از سی … که دیدم چلّه تا چهل وقت سا
بچشم معرفت دیدم بهمت … نهان هفت کشور آشکارا
عروض و قافیه درست از من … ز داد طبع میزان شد هویدا
براه کشف اشراقی شدم من … سلوکم نیست بر آیین مشا
چو ساقی گشت دل صوفی بخواند … مرا خیت اسم با مسیح
بکردم صرف حق هر نحو او وقت … همین صرف میرد شرح ملا
مرا شد مختصر مو بد د بانش … مطول زلف آن دلدار رعنا
ز چشم دوست دیدم حکمت العین … اشارات و شفا زابروش پیدا
میانش علم او سط کرد تعلیم … از آن بالا عیان شد علم اعلی
دبستانم سرای وحدت آمد … نکردم خواندن خود را متمنّا
بدین علم و عمل یاری ندیدم … ز کیش مومنان در دار دنیا
ز چشم خویش تن را حق بر بخند … ز پیوند کر عذار بهور عذرا
شکر دیدست مومن گریه دست … چنان یاری کند درد از عقبی
هنوز دیندینی از از امروز … دلی با دین پی زر نامش ادنی
چنین گویند سیداران کردی … ندارد در زر نزد دوست دنیا
چنان در پی سنک انکس را که … بلکو سنگین چنان بخشد او را

کسی کو یاری از سپهل بیارد … چنان انفرات دید و رکار رو الا
بکلام روز نا دار است ایزد … که بد هد وعده وز راهبر ابودا
چو باری نیست از اسلامیانم … شوم ساکن سپه و دیر سکوپا
مسلمانان اگر یارم نباشند … هم و هم زدرت از کیش نصارا
لب من کمتر از ناقوس نبود … چو صور آوردشس سازم زین قولا
بجویم تازه را سیه به تازی … برم از دین تا فیضیا
ز خشکی بر زین ایکا به بندم … بر زنار هم چون پور سینا
مرا از چار سو سینه دین نکوتر … نشستن در سر سوق الثلاثا
ز رو سه راستی آویزم از بر … ز دست دار غم دردم چلیپا
مسیحا مردگان را زنده کرد بی … کنم آنکس روح الله احیا
فلک مهد و دم معصوم ناقی … مسیحا روح و کلم گل خرما
ز کنه از من فرهنگ کرد … منم مالک سر زد مملوک ملکا
ز سطر نام ام نسطور خیزد … بود یعقوب ز اعقاب کنها
شود دیوان من انجیل تخییل … حواری را ز حرف من مسیحا
بیونانی و لاتینی و عبری … تو لیسم نامه نامی او لا
وگر ز ایشان از ننیم آدمیت … نگیرم پند زن کردسته نو

... را بدانش کنم آیین موسا را چو موسی
بتوریت کلیم الله کنم زود بطور خوب تفسیر مطهر
جهود از جهد و فیض من سینه ... در سینه نور طور سینا
کنم ترک از یهودی گر بباشد مرا از جان و دل خواهان دجویا
یهودان گر بسی خواهند امید مرا آیینه مرا از دون موسی
پذیرم دین داینش حضرت عیسی شانزنت انکونی را چو بستا
مرا گوید بزرگ قوم از جان بگویم ما ولا مسی بی لم و لا
به پیش خان خاقان قدر قادر افکند ادن بگویم در حی کا
ز هر کام از پرسند خوانم ز ترک یافت در نوع معلی
هر آنکس نیست هر سال دانیم ز جنگیز در جنگ جنگ دیگه
بگویم قوت جوچی و تولی وفا دست خفتائی داد کرد
سپه چون کرد در دو آل عباس هلاکون خان به تیغ برق سیما
هلاکو خان هلاک عالی بود ... سپه اشت چون تولی ترلا
کلاخوا شنید یونانی در قرنها چس ائی دا آت
گرید جوچی قشوا انکرا و کشت شکری عنبر نزدیک
... اندازه آشنا ابسرم خان خبر ...

... پنیم مردمی زایشان آری دل کنم کیش برهمن را ... سا
کنون عزت پژرده ام زعنری قرآنش آسانست بر ... تولا
ز اهل جان اسلام طریقت ندارم غیر کیش گفت علی
مرا گر هندوان خواهند در دم بکافری فرد جویم موسی
ز خط سرو میسازم دو صد بید برین قلب صنوبر شکل پیدا
جنید بر میان جان بربندم بهتر چون خود آنست کشتی گویا
... شی بخوانی صحف خانه بخوانم چار بید شهر دیدا
گران هر سه کاران را نمایم که نبود آن بجز ایزد تعالی
ز روی هر سه برانی تازه سازم مقالات مهیش و بشن برها
کمیت انجن چون بپرد چرا گردد باد تاران مطهرا
... بوستان اورکشن نمایم اجنم و جنم داد و انت اشیا
برهم کیاسان سازم مبین کدامی سبد آیین است دیکتا
بگویم گر زمین پرسد بر همن چه باشد سود شکت کرشن داد
هدا است انگه مرلی بر رو ... از رح از جس خود به سینه
... می جای را خواند رکسه ... پس مهادان کیست ... را
... ی ارچه شد ایع شد کلیجی گر ... در دست جاک دو ابر بر تیا

چه باشد چار جگ پس باز گو چیست   منتر نام چندین چو کر بیا
کدامی راه بنمودست یا بیست   برام اوتار از بهر لتلی
ز دیوان دیویان و ذات اکبر   ز اندر گویم و عمر بر مها
شیرین مچ و دج که همراه برکنگ   گوای روح پوشیدست تنجا
بمقدار سه کام اول زمین اوگرفت   که بد از بل در آخر بونه بالا
چرا چهتری کشی کردی پرسرام   شرا از برهمن چون بود ادرا
بدست رامچندر این دسرت   چرا شد کشته راون بهر سیتا
بچندان حجره کوبی جهل بود   سری جکدیو سندر سیام تنها
چرا بودست در کوهی نشسته   چسان خواهد شدن کرکی هویدا
چرا هرگز نمیرد مچهندر   زهر روز دین خود در دار دنیا
چسان گورک بود جاوید زنده   ز نیرد عنصری جسم وی اصلا
پذیرد جسم چون آزاد گوهر   ز اوتاران کند عالم مطلا
بود هشتاد و چار آکی دو سه کم   بتدریج از نفس کبری بعمدا
بکموده هفت چکر جسم عنصر   بتارک کر ترا گیرد نفس جا
زبیم مرگ و بیماری گذشتی   زان منتهای لحنهای اینها
ولی پران دایان لنشان اول   که باشد اسم باد شیب بالا

اداد بگلاد

اداد بگلاد و سکهنا شد   ز بهر این عمل نزد شناسا
اگر چه رگ فراوانست در تن   چرا زیشانست کافی این شناسا
روان سازم برای غسل اشر   ز رنگ چشم خود گنگا و جمنا
ده و دو دلنگ الشیرو اعمایم   بدیوی چو همیپال دیونا با
بهین اوتار گر خواستند ز بید   مرادانند کان شاستر ها
کمال کشن من در جمع بنگر   بر و حم عین علم و عقل یکجا
ز من ارام ذات رام یابند   رسند از من دد و دیوان صحرا
ز بده اوتار بده من نیز اوست   کنم گر مرده باشد دل من احیا
برهمن حسن بره من بخوبند   بسوی برهما گر هست پویا
دگر زیشان نیارم کامگاری   برهمن نیست بر من شاه والا
بسوی کبیر بکرام گرا گنون گرگو خواهند   زبید نیان مرا عزی دگر جا
بکیش کبیر بکرام گرا گنون   ز من نو تابین شود نیش انوشا
بلفظ زند آذر زنده سازم   منم استاد دشن زرد هشت سیتا
اوستا چیست چه بود زند و پازند   چه دارد هست و یک نسک معنی
کدام آن هشت لفظ آمد گرانبها   بردن آمد چنین زند گجا
چسان خواهید در هنگام آذر   زرادشت آن که بنی آذر افزا

حدود هیچ سی و هشت از آن / که باشد اگر بخوبی الفل شیب آ
کنم تعبیر خواب چو بغداد / به بیداری اجمد شرح جوها
چسان شد خشک دست شاه او / که در سر داشت او آهنگ ایذا
چسان گلنار شد آتش برهنه شت / چسان وا ردی بدر اگر د جدا
چسان پر در د جهان گاه جوانی / چسان بود مست کویم پری ازا
چو آمد سوی ایران شاد و خرم / بگویم چون گذشت از آب دریا
چو او زان راه را پیمود شب شد / نمود شد آنه خوابی دید جویا
چسان بگذشت زاب و اینی باز / ز قسمتش در گذشتن بود دیدار
مر این راچیست تعبیر از معبر / بگویم چون ازمن پرسند حقا
چگونه بهمن آمد پیش زردشت / چراهش برد نزد حق تعالی
بدو یزدان چه فرمود و چه جست او / کدامی راز را کرد او تمنا
چه باشد خواهش دادار هر خر / چه داشت اهرمن مردود دارا
بگویم تا که چندین سال باید / سر پور چرخ چپ پار جیرا
چسان معدوم خواهد شد او چو / چسان گرد آید این پاشیده اجزا
بزرد کشتی نبی یزدان چه جست / بگویم با تو چون پیری لشا تنها
ز حق پرسید چون طوار نبا شش / سوال این بود و ازا حق چه گفتا

چه گفت از نور و ظلمت پاک یزدان / بزردشت نبی بهر آن ایما
چسان استاد زند بس داد زردو / فرستادش سوی گشتاسب تنها
چه گفتندش دگر مرد اسفندیار / تختش بهمن فرشیده آنی
چه گفت اوی بهشت انگاه او / وزان بس شهره شهر یور ایشان
سفندار آمد و خرداد انگه / چسان مرداد هریک را ز کشا
چو سوی عالمی علی چرا امید / چسان بشکست دیو و جادو ازا
به فرزانگان راگرد ملازم / چو آمد سوی شهر بلخ پیدا
چسان گشتاسپ را بنمود جنت / سپارم بر تو این رکش مها
بخوتن زنده جاوید زود شد / بهشت گشت زود جاماسب دانا
از رو رویینه تن شد پور خسرو / کردو این ورشد زا اینک جگرها
چگونه پیش شاه آمد ملایک / نصیحت کرد هر یک پادشا را
بلهراسب وز زریر رنجه گشته / کری کفتند ایشان را الها
همه زنیستن زین هر دو یکی / شفا زردشت بخشید از دعا ها
ز بیم کی چه پرسید است از زردشت / هم بلخ یافت از داد ازپا ها
چه خواهد بود در آخر هر دو / خرداد دست ناگاهی هما نا
که بد تو را با تو زانکه شد شد / وان پور پیر ز شیپ سیحا

[illegible]

چسان از سبزه زر دشت آذرخش | که بد با تیغ تیز برق سیما
چو جوشش دارد بگویم از خورشید | که ایدر او کند در دیو مدارا
کنند گر بسر روزی که سر باس من | مرا آبادی کش بادا
ز آبادی بو برانی بنایم | ز ویران بر مرا یاد ما دا
بگویم راز پای و شای ناپای | که حق بی جوهر و جسمت و یکتا
ز سویان سوی بی سو باز گویم | ز بی سو کیش سوئی گشت گویا
وزان سوی از دو سو آمد پدیدار | سوی بی سوی جسمی پاک والا
ز هر سو گاه چنین سویان و اجسام | پدید آمد لقبول داد پیدا
سراسر باز گویم پیش موبد | چو گشت پرورد کار و گوشه دارا
روان جون و اسد از بند پیکر | که چند ذات نفس و عقل اعلا
چرا از پیکر انسان که از و | بجسم جانور بی شخص گویا
ز تن بست و تن آزادی زادن | ره آزادگی و زاد زیبا
ز راز خانگاه و آشیان ساز | بر اندیشش و نگارش گاه جویا
چو باشد زند بار ای مرد عاقل | گر اخواند آخر تند یارا
ز کم خواری و پیداری دو چیز | را تو اری که چند سالک اینجا
نخست از مینوان میندایم | دگر ره گویم از مینوی مینا

برین مینو چو باشد بر تو خوا ام | فرود دین مینوی امرز فردا
چو قابل گشت یزدانیش گوید | تو حید وجود حق تعالی
ولی یزدانی تحقیق داند | که جز حق نیست موجودی
حنکم لمخصوص شد ز اخلاق فرخ | طهارت جسم را از آب مصفا
نماز ایزدی یاد جنابی | بجو دکو کب از اندام اعضا
بظاهر روزه گشت احسان خوردن | بباطن در گذشتن از بدیها
بصورت که خدائی خواستن را | بمعنی حقیقی از نیکو عملها
بود آزاده کردن از زه خواست | بلفظ هر بنده بی تکلیف
بمعنی نفس را آزاد کن زود | ز قید شهوت و بند عقبها
محقق بنده را نفرو حنت هرگز | بر بند خویش را الفردوس یارا
درستی بایدت در عهد و گوینده | بعهد بندگی اول نکو یا
که اخلاق بد از شیطان بذیرد | گریزد از ره عقل معلی
بهر سالی که زر و ضارب مجفرد | ز بند ز کشی بی دیت از در کر بجل
بزن ضربی بنفس شوم کو روح | بضرب خشم شهوت کشت در وا
ولی از بهر شیطانی نشاید | زیا افکندن حقانی اصلا
دیت ده با اله گرفتن نیز تادیب | مراد راد اجب آمد از همه جا

[illegible]

دیت ده خشم و شهوت در رد عقل / بکش هر نفس شیطان کیش را
اگر حیوان دو در از ریخ انگشت / چو یزدانی نیست او را زان بس عنا
دگر شیطانی آمد گشتنش بیچ / چو یزدانی شود هشتن به آما
پس از تا دیبای مرد خردمند / بکش نفس بهیمی طبع خود را
وزان پس نفس ناطق را ادب کن / که حقانی شود از بیم حالا
همی بر ترند شرم اندام زانی / چنین یعنی و گوش زانیه را
سوم باره ولیکن نفس شهوت / تو اول قطع کن از بیم احفا
بقول مردم یزدانی آمد // مرین تاویل حر احکامشان را
بزدان و دساتیر و مه آباد / بعقل و نفس و چرخ اختر آرا
بهم بر سپم و نور ز دشتن / بهمدین و دستنا فور وادوستا
بشود کش کرم و هوم و جام / هر رب در نبی و قرا ۱۰۱
بگون کنف از دراه مریم / بدلت یا دری و پای
به طبع سالک دراه طبیعی / بهر هری بهر ده عقل
ایش صابی و کیش صوابش / بسوف فیلسوف صوفی ارا
با سلام و با یمان نستن / بر کشیعی و آمکن ده نهیا
تو حیه موجد از ره کشف / بر بان حکم و فیض اصون

ازین گفته

مرا زین گفت کرگان سه گامی / شدن همراه فغفور و جا
کر شهر دان تحن زیر نکس داست / نبوده طبع من آن سوی بیجا
نه میل مال دارم کز ماکش / ملال آرست اکاهم زمو ۱۱
بود عمر از طبع دلق تن بس / بنای بس غذا از گیاها
بدست خشم و شهوت بنده سلطان / برم خشمت و شهوت بندبرها
مرا گنج سروشی هست دانش / نخواهم گنج کاو دارد ارا
زضا هستم بایین بخشش که حق کرد / بدانش غالب دنیا و عقبی

چسان راضی نباشم چون علی گفت
رضینا قسمت الجبار فینا

در بند تیم ار روان کوانه را / سود از قفس چو مرغ سپهر شناز را
یا بر فراز عرش شد دوست زان بدوست / بگذار کفش جسم نشیب آشیانه را
آوازه سخاوت من زال زر شنید / آتش زدم تفنگ صفت تا خزانه را
مجنون زردی لطف مرا گفت کوش کن / این سودمند پند خوش عاشقانه را
بکرشت ثلث عمر بطاعت ولی چه سود / چون زین درد کاسه ردی پیدا نکانه را
دافقه ز دین احمدی فقه بنیت / از عالمان مجوی ره امتیازه را

زان گنش ره گوید آتش پرستها
زردشت در یافت زبان زبانه را

بسکه هر پای خسان از بیکسیها رفتم | آسیای چرخ می گردد ز آبروها

مطول می کنم امشب بیان را | بوصف زلف تو شد داستان را
حریم تخصیص شد کز تعجب | چو آوردم طلب نام دهان را
میان یار خود دیدیم دو دادیم | بره جویان نشان بی نشان را
الهی علم ایشان را عطا کن | با عالی که شاید نیکوان را
بکار عام مخصوصند مردم | امور عامه می خوانند آن را
مرا علم نظر در دیده باشد | خبر دری دیدم بردی بتان را
ز سوز سینه آتش میفروزی | تو موبد زردشتی موبدان را

نقطهٔ خال دلبر ابروی او در عجم | از بوی باده می خوانیم بجز در کوه ها
خواهی که بری چو موبد اره بخدا | باید بکنی حیله جور و باده بها
در پیش حیدر و خیبر جو یاد حق | چون شیر خدا بگو کشتن خود خدا

آغاز ما تمنا یک انجام ما تمنا | بنود جدائی اصلا موبد کشته ها را
کور روان تن نشست در خانه | بهرام را ز نفس کور بودن بعجا

ذی ۱۰۵

زین چار سوی ملت از هر | خواهد شدن دو چارت این
زین پیشتر چه گویم زین بیشتر چه گویم | او را بچشم او پاس کرد دست دیده
فرد است و عشره گو دیدار دوست | موبد تراخدا را دادا مرد رحم
دست مار البت موبد پا پی ما | تا بگوی او رسید از جای ما
موبد ا پیوسته می خواهیم از عین الیقین | معنی نکهت بلند ابروی آزاده را

بود از اول مقصد ما
در اوائل وقت ...

معراج نبی نکرد والا او را | یعنی که بود پایه اعلی او را
خود چون آمد فرد در ذات کل | موبد بچه کار برد بالا او را

بزن چوب عصا بر کاسه فغفور چینی | کر تا دشمن قوت چلیپت مردم خوب چینی را

بلبل بستان قدرتم تن قفس باشد مرا | شب روان را رهبرم پس نفس خضر مرا
زنده رود جان کشید تا کو غز معنی ولی | این روان نارسان آب ارس باشد مرا
می توان بی دم زدم ان تا عالم دیگر رسید | گر نه در پای کشیدن یکدم مرس باشد مرا
بخت کوتاهی نباشد ور نه بالا قلم | نسر طایر گردم ار بال مگس باشد مرا
احتیاج از کشور امکان نهد بیرون قدم | گر بقدر همت من دسترس باشد مرا

نفس کاوی بکام خویش گردد انسان
گر عقاب همت مرغ قفس باشد ترا

در راه گرت کعبه و دیر است بجا رای   خود سنگ نشانیست دو این راه روان را

بجز رستم نگیرد تاج و تخت خسروانی را   که تنها یافت خواهی زود با شکوه خاقانی را
بنفس خویشتن با کاه اسپان اسپ آدم   کنار سبزه یابی و سکندر یار الان نانی را
مگر عرفان پرستی بیوفائی های دنیا را   بیابان ها چان بسیاری ساز شهیار ان خانی را
بسی جادو از این دیو سپید رز همی آید   شبستان می کند کاوس چشمان گیانی را
ازین دیوی سپید جوی پیری گشته موی یانم   درین بازندران عمر کاوس جوانی را
ازین دیو سپید ریش شیخ مکرمی موی یم   نه از اولاد رستم خسرو مازندرانی را
بردن از خانه تن مرگ خواهد کرد جانرا   جزین مغنی سپید ایم ما میری و خانی را
جوانی میرد آزرده خم شد ازان پیرم   تو اضع میکنم شاید گر گردانم جوانی را
خمیدن سبب اینست راه عمر پیموده   ز دوش افکند خواهد پیر بار زندگانی را
بچوب از خویشتن میرانند گر زندگانی   عصا بنود برای تکیه دفع ناتوانی را

ز شیخ العقد لا محمدی خلق دیو   بیشک ملک الملوک اقلیم رفا

ازحکمت ارسطو و افلاطون   یونان هنر شد است و مصر حکما

تا برده بیت الحکمان شد حکمان نظام   به پهلوانی را عرض از شک شدند رزمها

جا است دارای بالای والای ترا   جز از اطلس است باد از خیاط قضا
فی مسلمانم نه زمین نیز سبب جزا   حشر من جز با خدا با دیگری نبود روا
بهر حق ماندم چو کفر و دین خریدارم نبود   کس نه خاوند کش یکی شد چو کالا نبود
از مسلمانی و طاعت میکنم زنهار نی   تا نکرد دارد جو دم تنگ جنت شما
آتش دوزخ شود هر کس من بر چه الف   شد گنه هم رستگاری بخشی از خدا
پیش آنکه گرم من در پوزه دوزخ زمال   نیز دمن گرمی چه باشد دوزخ افسرده را
هر زمان پیرکی ز موبد کیست چون وجرا
کشت بال چرا دار استر از چون و چرا
منطق آمد عاصم ذهن از خطا   شد خطا موجود دیان جز خدا
نه قسم آمد فلک مهر را نیز ای   کلیات خمس این شد موجد را

از طور تجلی جز خبر هر موسی را   خورشید فروغی جز شعله آتش

کار تو رسالت بهمه ستی موی | از پای تعلق بگسل بسته مرس را
جانا ابیه کشش چو اسی تو دلبند | وزد آمد به درا کن این قیل کس را

نوی بر سید اسم ذات ما | دادمش طرح که اسم ماو لا
نور چشم ماست حق کی دیده ایم | ماسوای او یکی در ماسوا
بار اسم کان اگر نیستیم " | های ما آمد مشابه لیس را
ما خبر داریم غیر از یاد دوست | مبتدا و منتهای مو بدا

دامن بشر بن طلب شد چو از دستش رها | چابک زان شد کو بکس دامان ...
لیلای جهید از جست جو بیگانه بود | پای تا دامان صحرا گرد مجنون ...
زیر کی اندوه رای و عاقل ایذا بود | ابلهی دنیا فزای ابدا جنت ...
ابلهی دارد ... آسمان ... | بو علی از دانش خود میکرزد ...
گر بود کو ساز معبودی ... | بیچاره کو سپندان ... الله ...
پای فرعون است بر تخت ... | باید ... شبانی میکند موسای ...
بسکه کوه آرام صحرا ... | گو ... حنظل دادمت ...
گر ... کار ... سودای ... | جز بدر رفتن نمی باشد ...

وار چه دل

خوش ... شیخ شهر ...
شهر ... کرد ... شیخ ...
خوانیدم اول ابد را رسم دیانتش را | اندر امانت حق دست خیانتش را
زاهد خود اسپیر باشد در مرتع طبیعت | ما بار کس ... یعنی امانتش را
لای از این هویدا از ... | ما ... ندر کمانتش را
این ... سنگ ... خصم ... | از قلب ... حمایتش را

خرسندی ... اکسیر و کیمیا | جز حرص ... ذکر سیم سیما
از سنت رسول ... | افطار از سوال ... خدا
نسل ... نماز ... | با حرص ... خاک کربلا
در طاعت حضور ... | شد جانی ز آدم ... الله دعا
آدم ... خدای بدان ... | آدم ... آدم خدا ...
از سجده ... آدمی ... | بال ... خدای آدم ... خدا
وقت نماز ... آدمیت ... | در ... قت ... حباد ...
زاهد بجود آدم کامل ... " | ابلیس خلق ... زاهد ...
زاهد قرآن ز دستم ... | زاهد ز حق ... ز دستم ...

همام بزد است علی شهر کس نکرد | هم ذات نیز هست بر [illegible]
[illegible] خدیو [illegible] | رضوان روضه ارم [illegible]
بر فرق همتش کله از ترک [illegible] | در دست کلیم کرده [illegible]
گوئیم لا اخلاقت [illegible] | از ما سوا [illegible] در لا
اکسیر [illegible] قلب را بلی | زردی چهره سالک [illegible] زردی
از [illegible] فرزد مرا پاره روز کار | از ابجدی [illegible]

بی عارنی فقیه نه ادراک می کند
معنی رمز آدم و الف ظاهر بود ا

جام [illegible] شراب و ساقی و شاهد مرا | جبه و دستار و ریش و شانه زاهد مرا
خنده و عیش و نشاط [illegible] | گریه و [illegible] هستی [illegible]
نیستی و مستی درستی ز خود ما را [illegible] | هر شعار [illegible] هستی [illegible]

[illegible] سال کشیدم [illegible] | [illegible] دیدیم ره ندامت را
[illegible] | چو بر بیابی رسیدم [illegible] سلامت را
بلاست [illegible] کنون [illegible] | [illegible]
ز دست [illegible] | که [illegible] غرامت را

[illegible]

در [illegible] | ممتنع بود ز فضل [illegible] این [illegible]
جاه [illegible] بالای [illegible] | هست [illegible] آسمان [illegible]
بوجود [illegible] لطف [illegible] | [illegible] خواستند دایم [illegible]
از بیانم میکند [illegible] | کلک [illegible]
عالمیان [illegible] لطف و عطا | داد و بیاد آخرت [illegible]
[illegible] | فتوائی شیخ و ملا را

از مذهب جان [illegible] | جنت طلب گیتی [illegible]
راحت [illegible] | [illegible]
[illegible] | مطلوب [illegible]

ماه جنگ [illegible] | غزوه خندق [illegible]
ای کلیم الله [illegible] | سرمه از خاک [illegible]
دست [illegible] | لیک [illegible]
الکی [illegible] کلیم الله [illegible] | [illegible]

باده خونبار دست ساده در جو بدا | در فضای دشت کین نور بکور آمد ترا
از من قسر تر بودی همگی بهید آنحرد | از پستی فطرت نکر یکتای بی همتا ترا

شهنشهین جنت امامت را خلق مصطفی | گوهر پاک تو رشید در شهر نور ضیا
مطلب مقصود همه جو بدر ارواحی از کرم | یا امام ثامن ضامن حتی جو بی جفا
از شهد شناسائی ده زنده ذاتی ترا | تلخی است بسی در پی چون زرح ... ترا

برزمین با خرس کر احرز خوردی مرا | دُب اکبر ساختی بر آسمان بر هجر مرا
چون حمل بر خوار دی از خوشه کشت فلک | گرنه جوزای قلم از تیر بر خوردی مرا
از حکیم الملک نامه در عنایت هم نشد | زین شیخ علی کی توانم چاره دردی مرا

شیشه گردون گشته جام آفتاب | کاسه تا جمیرای شراب
باده نالست در تا یید دوست | عذب عارف را و زاهد را عذاب
خفته خاک است بیدار در کون | شهرستان است دایم اندراب
خفته عمل گرفتار در خواب

مصر یونان رفت در خاک ای فنا | شهرستان است دایم اندراب

زهی می دانی بچارم چرخ چون شد آفتاب | خور ز رشک عارضت چارم آسمان
عکس روی یوسف ماه رسوی می فتاد | چون منجم دید آمد گفت در دلو آفتاب
زرد شد خورشید از رخسار روی مه رخ دوست | نور باد از نیست عرق است از خوی ...
میکند ساقی حرامها از قوت ذاتی حلال | خند عکس روی ماه آسائی می سرخ شراب
می کنی بادام چشم خویش از گریه شور | میدهی از نرگس شهلا بوی خوش گلاب
آتش رخسار خوی آلوده ای آبرو | تا بکی از نرگس مستانه بستانی گلاب
گوش کس نشنیده آتش میکند گای عرق | چشم کس نادیده شبنم را بروی آفتاب

یقین
دو فرزند شاه جهان از شکیب | گرفته از ملک هستی نصیب
مهین بود دارا بگردون نشست | کهین بدزمین یافت اورنگ زیب

از من اصلا کس ندیده مردم آزاری چرا | چشم را آزرده می سازم به بیدار از رقیب

چشم سیاه یار ز رخسار شد سپید | کاهو سیاه می شود از تاب آفتاب

عجب همت نباشد گر عطای تا رتش … ز آسمان بر جها ساز روش نگا

چشم تو زد غفلت پرده دارد ز ترکیب … با آن رطوبت او شادم شب

یکقطره تری تیره کند آئینه را … یک پرده هزار دیده بسر دیگر پ

ردارد کامیاب بنا ارزی دل کب … زندگی خضر آب مرگ فرو

نیست چشم ظاهری را قوت دیدگان … پرده‌های چشم باشد در خوابی کتاب

بطلب از دست ساقی جام می … این حساب آخر کجا گردد یکرو ز حساب

چار عنصر پایه بخشش نزد مو بد راست … شاه داور رهور یاور ماه دیهیم فتاب

همت عالیست دشمن کام بودن پیش … صیقل آئینه اسکندر دار طلب

صبر را انبار سازد بهر می جود از طلب … یاوری از کس ندیدی باس یار طلب

گر بجهر کامرانی رفت خواهی هویدا

زاد راه از کیمیا همراهی از بخت غالب

میکنی با دام چشم خویشتن از گریه شور … میدهی از نرگس شهلا بوی خوش

در حرارت از عرق دادی کلاف … شیر مادر را ز عکس لعل لب

پس گفته است آتش میکند کار عرق … چشم نرگس دیده است نم زابروی آفتاب

صبحدم از آب تیغش نیل مشتری در آب … شامگاه از آتش تیزش دل خشک

شد سنوی تیغ چون گیر دبدست … مغولی خوان چون زر بلغاری

شاه … در انگشتری تاج در چیز او … آفتاب آسمان در آسمان آفتاب

خسرو خورشید خاور را بندش مهر … انکه ذات او ست ختم هستی

نار گوهر خلیل و آب را موسی عصا … باد جمشید حاکم کرد خود

مریم عذرا … گردن رشته روح الله … خوشه را آدم ز رحمت

شیر گردون را تهمتن بره را سام … نور را فرخ فریدون دلو را یوسف خطاب

پشداد داد آزاد زردهشت زند صحف … در خلیل نار کاشن بر مسیح

آدم حوا عنا کر شیث نر گردون صحف … موسی افلاک طور دعوی گردون

حیدر دلدل ز رایش دا احمد کردون براق … مسطر خطا زمان دخا سلام

چار یار خضری را احمد امیان سخن … مر تراج بهشت کون را جنت

کعبه التی وحی قبله ارض فلک … نوح طوفان عناصر جودی

کعبه شه کام گردنش لیلت القدر … سوره والشمس نور ز زیر تو

خنجر انوار ایزد مظهر نور آ … پرتو شمشیر افلاک

حزق زچون اتیاحش … قوس را بهرام چرخ آتش

کسری الانصاف … شب … مخلبش

روز سازد شام سوزد هور مهر اسفندار | شارق و شمس و دگاد یوچ پیشاد آفتاب
در دعای شاه داد و هور یار آید بکار | موبدا از بهر این شد نظم الفاظ و کتاب

از علاف آسمانی چون کشش تیغ آفتاب

سروران راو زبر دارد سر سر بجواب

دوری از زنخستان کس و دو زیکی [illegible] | صحبت نیکان ثواب و دو زبدان بس عذاب
آب زمزم کر خورد زاهد اردرون میکده | زاهدان او را همی دانند جز جست شراب
در بود و کعبه چو دمی پرست آید برقص | حاجیان زاهل طواف دو جدا گیرند حساب
در جهان کس کامران اهلات دانیال | اینکه شد خضر نبی از آب حیوان کامیاب

زاختصار اقتصار دید کتاب | کثرت کثر تش بود اطناب
خواست تاش چو موبد هیدای | کرد انی شمامه نیت جواب

دلستان جهان و معلم خلق است | خلیفه نبی خلق شاکر درست
آنکه شرایع بهیان ناموس ست | دلی طفل ابجد سبق موبد است

ده عقل مدام هوشیار ده | سرچشمه خیر بر کار و بار علویه
[illegible] بیش بها سنگین | مینای شکسته ذوالفقار عکسیه

موبد ما انکه زاول خیره آزاد باشت

تا که ترک مذهب و ملت بکرد اهلاست

در حقیقت هم بهر نفس عزیز از گورست | عاقبت این گور در گورست بینا کور نیست
عارفان دیدند موسی لن ترانی میشنید | انجا زبر حقیقه می بینی فراز طور نیست
از درک کردن ترا تر دیگر شد ذات دو | قاب قوسین از چه می بینی مسافر [illegible]

راست میکویم حسینی تم ز اهل حجاز

از عوام نعم ام جز نعم منظور نیست

خاطر بهشت این حسنیجانی سزا | شد بود آباد جاودان حیات
موبد دانش بزده خان کستاک | ما شنید از ذات روحانی [illegible]

یافت عقل اولین از نور حق

زنده گشت از نور تاریخ وفات

نه اکهی که طعام و شراب بنده رجعت | حرج بات تو بکویم کرد و فرجا جنت [illegible]
بهر بنکیست که اهلاکی نمی بوشد | کر سنگیست کرتا حالی [illegible]

رحمت که از خدا و خلق آگاه است　　دانای اسرار و ضمیر شاه است
نفس کلی است یا که اوس البشری　　روح فلکی بگو که روح القدس است

قرآن که کلام ایزد دادار حق و صواب است　　آن معجزه برگزیده پیغمبر ماست
مقصود و غرض هر چه خدا راست درو　　گفتار خداشناس و دیباچه عرفانست

چون کشور خوبی همه راز محجوب است　　هر راه بسوی خانه مطلوب است
پوشیده هیچ کیش که ره بنود　　از هر ره و هر سو که روی راهی است

ساق کافور است و کاکل مشک عنبر است　　نی میان و سرو قد انگشت او نی انگشت
ناخن او فندق و بادام چشم و لب پسته　　ترک چشم و تیغ تیز ابرو کشش کمان است
لاله عم است تا پا شصت خم دارد دل گره　　خط بنفشه زلف سنبل چشم زیبا جوهر است
راست تا پا شصت خم دارد دل گره　　رم آسا عالمی در بند ایجاد و گر است
تا نگارد وصف او موبد سیاهی بخت بس
خامه انگشت و کاغذ سینه که مطلوب است
آزاده کسی که بی ریاد کشیده است　　دار رسته زدین عمر دل فرزند است

خواهش نکست خواه بد خواهی نیک　　زنجیر جو آزر بن قید است همچو

انگه از مهر محمد بالش آبادیست　　ظاهر است این با خرد جز کو به یاد و داد نیست
رستگاری تابع شرع و دین اثنا عشری است　　بنده که ز خواجه عامی میشود آزاد نیست
کر ملکو را بعیاسی را گمارد عادلیست　　کار و کردار ز دما جز راه داد نیست
بر تو تازی گنج ایرانی و زر و انجام کار　　پور تو لی می برد کر پور فرخ زاد نیست
بر زمین باشد قضایای زمینی از علم　　از مدار این دور رد تا خفت بغداد نیست
زاهدا گفت رهو بدالفهد کو مفهم　　رسته از تعظیم این ظاهر پرستان ارشاد نیست

رستگار آنکه در دین و مذهب او ارشاد نیست　　انگه او در بند آزاد نیست هم آزاد نیست
چند در پیکو جهانی مذهب و ملت رهم　　شاه راه کشور تحقیق جز الهی همت
هر که او جز دوست میجوید رخنت را　　جز طلبکاران جای و پایت آزاد نیست
پیش دانا کثرت موجود خیال وحدت　　خیره اهل هستی بشمار در اعداد نیست
گردش افلاک بس باشد نشان عشق یار　　آفت عشق را بر تیشه فرهاد نیست
جز جود کو هم عرفان درین غالی　　آدمی را بهره غیر از خورد و مرد و داد نیست
چند گوئی چار میم کرده انداز چار چیز　　گر سخن از داد گوئی چار چیز از بنیاد نیست

بندگی خواری کمال بندگی آزادگیست | بنده گوئی بند خود در قید و بند افتادگیست
از عطای زر نگردد کس بجود ناکریم | هر که بگذشت از خودی نزدیک موبد رادیست

شحنه را فیض خاص بخشش عام هست | خط بخط نعمت ملت از خط جام هست
هشت جنت را وجود باده کیفیت فزود | دور نه گردون بدور جام یکگام هست
تا کمال جام باید استعمال کرد مدام | ده خرد مدهوش زین آغاز و انجام هست
یازده عقل از وجود ساقی باشد پدید | تا بجرم جام ده گردون در ایام هست
بلبل جنتی [illegible] نماید شراب | دور از عقل جدل جوستی [illegible] هست
سرو بالا یاسمن بر ارغوان [illegible] | موی سنبل [illegible] چشم تو بادام هست
نشاء اولی [illegible] | نشاء [illegible] تا عارف جام هست
گر بدگوئی [illegible] یک جام شراب | در پذیر د باده ده تا پخته [illegible] خام
دختر زر داد دین [illegible] | دور دور [illegible]
از حدیث حادث هر نوجوان [illegible] | باده در [illegible] موبد شیخ الاسلام هست
میرود حکم [illegible] | مهر باد [illegible] ایضاً
تا گلستان چشم [illegible] | چون چشم تو نرگس از بوستان شکفت

مسیح گو طبیب [illegible] زرد است | به بیجت [illegible]
ریائی گسیخته اسلام بگسست | بر رسم برهمن زنار بربست
ز رساوی پی پرهیز فرمود | دلی [illegible] ذکر دوست کرده است
زردی التفات محض فرمود | بس از آگاهی هر شرط دربست
نشان زردی اینجا [illegible] | [illegible] زن گوینده [illegible]
طلاکن خلط دل بر جام [illegible] | صراحی در کف سیمین بدن جست
کی گوینده موبد را [illegible] خواند
[illegible] قید دار است
بسکه در [illegible] | بسته آن زلف [illegible]
[illegible] | روزی مردم ز جد و جهد [illegible]
مردمی بود [illegible] | [illegible]
تاج شاهی [illegible] | کی پذیرد موبد ما این همه [illegible]

قلب تو بر قلب زری مایل است | زردی رویت ز طمع حاصل است
سرخی دنیا ز [illegible] زچیست | خون دل بر زر [illegible] است

فاسق این جهان شرده ملکوت گرد اخلاق نیک عادت و خوت
زان ریاضت کش تکبر شد مل که همه در پژوهش مینوست

بخط جام من از شیخ ... است که جام شهد خون شهید انگور است
مدار سور لب خلق با لب جام است لبی که بی لب جام است زهر ناسور است
نسوخت دست شهنشاه اتفعی ارو یعنی که آن می کافر بند جام دگر است
فسرده فارسی آتش شراب سرخ بود که خون فسردن آن در کتاب مقدر است
بخط جام من از شیخ جام مستور است ولی مرا خط بغداد جام منظور است
بیان بخوان خط بغداد اهل الامر که کوفه خالی و بغداد شهر معمور است
بهشت بزم تو باشد چو باده پیمای علال باده بجنت شراب مخمور
بهشتیان ز می ناب دست پس برنو بشرب باد بهشتی ز دو دست ماکور است
بقول جو آتش پرست مهر فروز
شراب و ساغر شیراز مهر باهور است

بگو تا بنگر در پیش ز ذات خورشید موی را فروغ دادی ایمن ضیای انور سینا را
ز مید است پنهان کو هر خورشید یکتائی چه پیدا است پنهانی این پنهان پیدا را
نخواهد دید حق را بسر بنور دانش ظاهر شبیه ارجسته همچو انند باطن آشکارا را

بنور معرفت بنگر بچشم دیده در ما ندر ز جنبش شیشه بشر آید فروغ دیده اعمی را
موذن در سوال از شیخ بنگر کرم حاجات است جواب بلهان با خدا خموشی حق تعالی را
چو کار مردی بودی بچشم اخر کردن سوار خر بنگر دی عنبر زیبک وحشی را
فروغ کیش پود ریم آمد غنت ز رحمید
تا روی لعل تو مایان ایراق اسس مسیحا را

خیش گردون د جام ماهور است اختر آتش حباب و می نور است
مشهد باده را طراف کنید باده خون شهید انگور است
خیل شیدای روی ساقی جم جام هور رش بقول جمهور است
باده جام دست ساقی ما جام خون است عود رش انگور است
ناتوان بیخودی اسیر بحق سنگ را ره کلیم ما طور است
مرا با یوسف مصری چه کار است بد بیضا ز بیضای نگار است
ز خون باده چون شد جام مشهد بیا بنگر که حنا سبزه دار است
سواد غنا هند و هندوستان را سرافرازی جهان اندر کنار است
ز کم و کیف او چندی نگوئیم تعالی شانه تاری ز تار است
بشهر جام کیخسرو بیامد ز مرد شاه نیک قند بار است
ز وصف کابلستان عاجزم من که مهراب بجز با آن همه ارزنده هراتست

بجا گوئیم حرام است باده را

صدای رود در رود نلبیاست | خط لب سبزه آن جویبار است
زرد کشش آب در رود آبه جوید | بر خوبی رود دمارد دابه وار است
بخوبی بین که چون کشتاب [illegible] | بدست شاخ دست ابنوی بار است
معالی دستگاهش چرخ پیوست | که بالا دست این گلشن خمار است
همین برهان مرا شیر دی دل داد | کانار الله بر بانه انار است
نسوزد دانه اخگر وخش دست | برآیم آتش زرد شت نار است
ز دست جام زاهد گشت عاجز | دراز نار از خطا هفت نار است
چرا خونریز دار حبشی سراحی | مگر در سینه تن اعتبار است

تا بدان خاره چشم من از دل در کس آ[illegible] | انگه داه آب دهوای کشور چم همت

فلاطون گر نه در خم باده بوده است | چرا این حکم از کیفیم بخود است
مرا با کلیات جنس کار است | کاو در اینجا ساقی مستوره است
نخواهد رفت بیرون جز پیاده | که بر بالای کوه اکنون فرود است
جوانی کر باکود رز بود ندر | چو پیران گشت ایشان دلجم بوده است
تهی خم گشت جام مال شد پر | سر جام است انگه جو به کاسه دوده است

بپند برلب گفتار دو دشمن است | گر چه گویا چون زبان بر کام ماست
نخوبان آگاه ازین معنی نیند | شرح جانی زیست شرح جام ماست

ویدی تو داست جبین ابرو | اکنون نظر است به بخیبی است

کمان فدرگشته در شاخ کمانم استخوان شد | بر تو استادی جو بد که مردم ابرو خم شد

آن دهان تنگ از تنگ شکر شیرین تر است | حسن دلبر که ز عشق عاشقان دیرین است

حجت قاطع بچشم خلق ابروی شماست | استخوان از موی کم می برند با موی شماست

تار کنار رفت رخ مراکب [illegible] است | یار غنیه [illegible] فرح کین همستار یار است
[illegible] جوروی ادیر دلبر و ناری | [illegible] چو زلف او تیره و تار تار است
مار سیاه را دو دوست دشمن جان آدم است | بر لب جانفزای دو دست [illegible] که مار است
شام نشان مو تیره [illegible] روی | زلف تو با هزار جان چیست [illegible]

عین سوال گشته‌ایم بلکه لب سوال ماست　　لب سوال بسته‌ایم اینکه نگاه فال ماست

بر همت نفس و خشم نارت　　بود مرده شهوت انگارت
گلستان گشتن آتش به چمنی　　اگر بر اعتدال افتد گذارت

ز جام گستی اگر مست عارف　　ز جام آب تا فوز زمین رفت

ز بس مردم دیده را خاک سیاست　　بجای کیمیا سترم مردم کیاست

همه تیغ رومیت زنگی شده　　میان ترکش ز آب آبی بده
ز خون شهیدان بشهد گرای　　خراسان ثانی ز تربت نمای
بقو بنالش که زد سپید رنگ　　همه دشت گردید میدان سنگ
پدر مرده و نابده زنده رود　　ز خشم کیانان روان زنده رود
از نیروکش شهد جان رفتنی　　ز تاک کاکش روان خفتنی
پیاده برافراز پاسوار　　همه اژدها دار در مار مار

انکه او در حضرت پرخان کوشیده است　　چون شکر با خسرو شیرین سخن [illegible]
گفت جانان را چو دیدی مو بدا از هر تن پیچش
از گرو پوشانم که از هر تن قبا پوشیده است
در قوس او جوب دیده ام میر است　　هستی هم [illegible] تیر است
در هر سر نفسی عیان بیان کردن　　سبحان الله من [illegible] نکیر است

از راه رود گنگ یکشتی خشته شو　　گر سنگلاخ کعبه و دیر ت ره [illegible]
بحریم گر بقصد کسبک چگونه زری　　الفضل که دیر و کعبه بر اهست حجاب [illegible]

دیوانه ار شرمنده شد از زشتی فعال　　شرمندگی فعل جنون [illegible]

دو جهان حکمت بسی کردیده بیکاری خفت　　در جهان چار عنصر بیهوده بیکاری [illegible]
از ازل تا مرد و دوش گردون [illegible]　　تا ابد تا دور صنعت [illegible]
عشق با فرعون دعوی آب [illegible]　　جز نگار از خلیل الله گلزار [illegible]
گرچه برخورد دار [illegible]　　عشق چون منصور [illegible]

یا خدا ذات جهان ضیا جهان دان   وا نما از خوشه آمد خوشه تر از دانه است
هست استاد و سر چهره در سر ایشان   خانه به جگیهات جنگ مذهب و ملت است
ما درین کویم مو بلا از ازل پنهان   حال ایشان نکسی داند که او صاحب است

ضحاک ماردار شود عمر سال دراز   کن کوشش عجیب تا زی دولت جمهوریات

نه در گیسو من هر مو منالست   تراغی غرت لوت و الالست
ز طوف کعبه دریک دم چه سودت   ز من کفاش ترا در تن منالست
کجات از کفود کفران نجات است   ز غرت خوبت عشرت و الالست

بنام خدائی که آرام از وست   رمان سپکران راروان راه از وست
بهر روز نی تماست جان را درد   ز صد ماد ولکمس رسان کام از وست
سراسر حواس تو ده سیر ره   ز خود در سنه لیک بدام از دست
کسی کو ز شهر تمنا گذشت
مراد او دان کرده زبام از وست

ز شنواد

گرگشت نامی از نامه ... ست   مینا سپهر دالا حور سید باد حیات
... ... هستی نذیر عالم   زیران ورد دباد ... ...
تا نام کام باشد با نام کام باشی   عالم فسرد ز خانان الی شهر ...

از علو همت موبد حفیظ قیصر حیات   همم از جبس ... اطلس حیر حیدبا الا ...

این جهان گرشادی آباد است ... ...   عاقبت شادیست میمون ار اگر آزادی ...

دنیا مار است صحبت مار زهر است   دندانش اگر نکنده این بار بد است
یعنی ز طمع دور شود حیز و باش   کی تاج و کلاه تخت هشیار بد است

گفت آنکه ز قطب اولیا آگاه است   منظور آن قطب در انش گاه است
عالم الوجود قطب قایم باشد   دین است که قطب شاه عبد الله است

گفت آنکه صفت شناس عارف ذات است   خبر از تو ترا نشر موجود ذات است
از هستی تو عدم نزد آید نشر   ذات تو شیک خیر کس خیر است

بشکسته‌ایم توبه ز سرزنش کمین — در ما شکستگان نبود توبه هم درست

در شهر دینی به بیوری جلوه کرات — با هر عاشق زبان ناز تو حجت است
معشوق توئی و اهل دین عاشق تو — گوئی که جدل چرا است رسم آن باب است

ورشد شهر و زمان حضرت ملا... — مسلک فقر و فنا منتقل از شهر اراست
هیچکس نیست که گویا بانا لحق نبود — شهر کشمیر ز شهرش شد فیض الله است

در کوهسار زرد بجز آب ... — ای کوه کوه بوم تو از تو خراب است
زان کشته جلادی بازار ... — بر سفره معاویه شامی کباب است

سید رحمی است نه کرد خود بد نیست — از روح خوشتر در جهان بد نیست
گوئی دارم یکی بجلی سید — عرق یکی بکو که عرق بد نیست

به عین بخت بکابل ز جنت ... است — ز موج آب سنده کار نامه تا نیست
کنون هزاره دافغان ... — هزاره بلبل ما عندلیب افغانیست

هزاره...

بچهار روز نه کوکب گستر دام منست — چهار سوی عناصر زره گشتام منست
ترا که شهوت ختم است قاید کردار — نه آگهی و کهین جسید پا بدام منست
حرام باده ناب و حلال سر کرده — حلال شیخ تنک حوزه حرام منست
شناگهی که خرم حبیت چرخ را ... — بسر طالب ... لا کمال جام منست
زر ... شادی من ... — مراد خلق وجود کرم مقام منست
بجای ذکر الهی بزم ... — ز روی کین دو ولاد درگشته نام منست
بعلم و فضل هنر پیش بودن اعلا — طریق کین کشی از خصم التزام منست
قیامتی که بود جنگ در زد است فقیر — بوقت خلع ز کور جسد قیام منست
همیشه دلبر و شیشه و صورت ... — رفیق روح به پرده دراز خیام منست
بهشت جیست جز ادراک مطلب ... — مراد وقت معنی که در کلام منست

در کردی و شی فرقی جز این ظاهر نشد — سنگ شه را بر سر و در ریش ... است

این کعبه و بتخانه دو جلوه یک ذات است — این جا حجر الاسود آنجا ...
... — ... خرابات است

در هندوستان ... اکبر ... زوم | در کعبه شاه خانی در بتکده ما است
این کعبه و شی ... حقیقت بین | هم در کنشت ... جسم پیکر است

... با ... قوی ...
خود چو نه و خود پان است ...

شاه از ... حکومت بودن آگاهی | انجهان ... ذات ... بود ...
از قول ... شخص تو جان ... | تو غافل ...
دیوانه ... | شرمندگی فعل جنون ...

حاک ... | ازو تاق ... خسرو ...
کوش ز سای ... کوس کاوی ... | ... داد کسری ...
نازش ... در جام ... | نازش احمد ... عهد کسری ...
چین ... خاقان ... | در ... بهزاد ... نقش ...
رو ... | ساحلی ... کشتی ...
دهر ... کشتی ... راه جو | ساحلی ... کشتی ...
بهلوی دانی کمال ... | حرف ... تیغ ...

[illegible]

مردی

...

ردی ... پولاد ... | مردانگی ...
باز آن ... نقش ... خود | ...

چو خدا ... کامل است | ظاهر ...
حق ... باطل بود | انحصار ذات ...
کفت ... | کفر ...

کوید شهنشاه زمان جام ... | ...
از تابش ... خلق ... امان | چون سایه خود ...

در کاشکم روز ... | آهوی ...
نقش ما ... چوب ... | عمر ما ...
ذات ... | همچو شمع ...
شعله ... | شمع من ...
این ... | آب ...
عمر ... خضر ... صحرا رود | ...

زان بدنیا دل نمی بندم که در مزرع کهی   تا بدنیا آمدم دیدم بسی دنیا گذشت
پنجه پیران نکهت بیگانگی می خانند   خالی خالی بپا پایه را آکنده آن گذشت
سنگ خارا سخت پهلوی طلسم ... نا   خواب مخمل تاب دنیا نرمی می لمی اند
بسکه تنها نازد تنها بارد تنها فرزلم   جلوه تنهائیم از خلوت عشاق گذشت
دست ما دامن صحرا است ... بود   پایه‌ام از تیغ کوه آسمان فرسا گذشت

دنیا که خیل او همه با گوش ... حق فی است   بسلسلش تمام در نقط فکر قالبی است
عالم یکی دو هم بود پیش ما است پاس   موجود خارجی تو معدوم رافضی است

ذات ایزد زان نهان شد بسکه ...   بوم را تا ریک روز و بهار ظاهر است
کفر کرپوشیدن حقست نزد یک فقیه   ذات خود پوشیده ایزد اسم دانش کافر است
عبد الصمد بدانش ملک سپهر فضل است ابد   برد علیم است در روز خورشید ده کواه
ایرانیان ز دانش بیرنگ شرف پذیرانند   گیلانیان شرف شاه را فیس به نگاه

دوری از درهای مردم کشته در باران منت   خانه و مان رانده ام ... خانه از باران منت
کشتی خبر نعمت عشاق نمی آید بچشم   خلوت تسبیح من تنها به کسبان منت

پرده‌ای چشم خود را پرده داری داده‌ام   دور باش از ... پیشواران منت
پاسبانی میکند روز و شبم در دشت غم   جیاس پیشانی ز دنیا جیاس ... منت
مرکز سامان است همت گذشت ما ...   همت خالی ز فطرت میر سامان منت
در تن تر ساقوای نفس عقل پر من   خوک شهوت را همت ... منت
ابر دی عمر آدم را ... اهرمن   با ملک در جبهه سای نفس شیطان منت
از دوان ... الفل اشکم ... روی ار   گوهر باکش ز آب اشک ... منت
تا زحرص و خواهش دنیا گذشتم هویدا   هر بخیل حاتم داو کشای ... منت

تیر بهرای ... بگذر در داندگان   زیر مژگان تو جون از شیشه ... است

دام من زلف او است کام امنیت   دام قبا که دام امنیت
شمشیر ... دو شش شهیر است   باده روز رخت جام امنیت

حاکم ار عادل و گر ظالم بود سودش رسیده است   در حیات عادل و در مرگ ظالم سود ما است
شام غزل ظالم از صبح جلوس میزاد   زیر دستان را فضیا بخشا ...
دار دنیای ترا عادل عمارت میکند   آخرت معمور از ظالم ستم پرور است

زود شاد از غذا ب دو جام بکیات | می چشم است پان دیده مرغ بنل خلافت
واخان ذات تریاکست کو کنار اوبیان | گفت باین دخت بنگم است کین ارده سر
بکوشم قفل مینای حمیرائی حدیث آمد | خطا یا قوت سی بنده موج باده است
بروز رزم در ایران قزلباشی است دستی را | بتوران در است خون سر اهو مان سگ است
غبار خاک آدم راهوا چنانی آرد | مکو از آتش زردشت می چون کام است

لب سبزان هندی راز می اب بهشت موبد
سیه چشمان کابل را مل کاز نکس سرخ است

انعام طلب باقی بنجانه شده است | یا مسجد کسار بوم ویرلم نه شده است
بی یاد خدا بهر معیشت دل خلق | هو بدهسه مسجد تلنکانه شده است

از کینه یزید پر ندامت خام است | حق حسین نیست دل زشت یا لات
در شام از یزید نماند است اخوان | کور یزید رو نعش ندید است مرد است

منجنیق آسمان بی سنگ بی خبر است | تا رک دار النشان یا فر اسکندر است

آتشی آخوب میغیر مود با باد هوا | شد سکندر ز خاک جم کیا تش خاکستر است
ز چه تو اهش شام ز مستدرو بتان طلب | از مطول اطول و ز مختصر بس خبر است
راز دان حق تو اهرکشت این راز فقیر | فخر رازی دیگر دم فقر رازی دیگر است
خواستن شد گدیه تر و شاه اقلیم غنا | کاسه دست گدائی شاه را تاج سر است
مخلم بر پهلوی نادان درون پند حکیم | ماده فاسد کند در دار چه سود ش بر است
در گدائی دشتی فرقی جز این ظاهر نشد | سنگ شه را بر سر و در ویش را زیر است
طبل رحلت روز و شب در بنگاه دو نیست | کر نای کوچ هر کس نشود بیناکر است
امر بلا داری بجا دولت بلای مبتلا | دور باش چوبداران دعنظاد دوراز خبر است
پیشکان را زود بکشا راه کوبان خبر | یعنی این دولت دار شد در جلای کر است
چار بالش چار بال آمد پیر دار اغنیا | تا ندانی بی سبب بالش پر از بال و پر است
لشکر از است باقی بر میر دولیک | غیر از این معنی نیاید هر که میر لشکر است
پشته هر جا کربالی پشت کور حسرت | هر کجا بینی نشینی اوج قصر قیصر است
جلوه معنی بیار دستی صورت بجست | پیش هر اختر شماری مشکل است اختر است
تخته از حیبر غفلت نیار شد کند | حیدر آباد ار کنون بر تختهای حیدر است
از جهانگیر سپ شبها پاسبان نفس سلیم | خیر شاه نادر افغان بند اکبر است
در ره دیده دار است شب و نیس خار اجابکم | درد و خواب است انکه او را روز محمل بستر است

تخت سلیمان تاج زرین را که شد دانهٔ گل | ساق این درخت است یا دست بکف راست [illegible]
پیش نور چشم یکتای است از دست دوری | جگر اینجا بت شکنی شد بت شکن خود [illegible]
هر که او بت میپرستد شیشه بر بت میزند | پس چه فرق از دین ابراهیم و کیش آزر است

چه بانی چون هما بر استخوان هر کس است | کاسهٔ سر پر ز خون مردمی ما را بس است
آتش خود سوز باشد قبله زردشتیان | پیکان در شعله آوازهای قفس است
کی توان بی لا الهٰ کرد این ره کرد طی | زانکه نوک نگاه کام روح چرخ [illegible] است
پیغمبر محمد آگاه است | عبدالله قطبشاه شاهنشاه است
شاهی و نبوت از خداوند مدام | از عبدالله این عبدالله است

با وجود شعر [illegible] چون عشق آیات | همچو اسم اعظم [illegible] اسم اصلاحیات

از رقص بهار سر جهان تمام زنست | پوشیده فلک [illegible] غم سپید است
کرسی ز غمش سیاه پوشم چه عجب | چون مهر رود جامه سیه عالم راست

خورشید که بر بام فلک [illegible] است | چه بلای [illegible] کش مهمان [illegible] است

شد حامله تر خشک از در کاذر | پیداست که مهر بر این نمایان است

هر کریمی را به بخشش مدعائی هست | جود بنود نزد دانشمند هر جا مدعاست
بیغرض خواهد کسی بودن زادر کرم | مظهر بخشایش ایزد حکیم الملک ماست

ای داور جهان بیقات [illegible] | مدهوش ان راسوی خرابات [illegible]
پیشکش چه [illegible] قابل ارسال [illegible] | از لطف و کرم سوی [illegible] است

افتد از هر که [illegible] | [illegible] است
بسکه خلوت [illegible] خلوت راست | [illegible] خلوت [illegible]
از درد دندان [illegible] | داغ مهر [illegible]
چشم [illegible] روشنی | میل چوب [illegible]
باده [illegible] عجب بنود زرز | قیس مجنون [illegible] است

کردم [illegible] دوم ایدون [illegible] کردم | [illegible] خواری [illegible]
تا شب [illegible] مجنون [illegible] بود | [illegible] مجنونیم

ارزز بکند موبد دیده بر باب اندر — بهر دم ماهی الف دام دنو دشت است

کلک تو عصای موسوی تجلیات الف — دست تو تسبیح صفر خواه انجیل است

در دور عرب نبی خط اعجم — مهد زبی خلیل اسمعیل است

با ترتیبش سپهر معلی بجا درست — عصر جبار خادم باب مجادرست

جسم رسول و جان نبی راست خم اینجا — این مشهد حسین حسن خلق قادرست

چتر فرخ و پاین اگر ناظر راه ملت است — تخت و کلاه خسروی تخته کلاه [illegible]

از خشت امیر و دزیران اوروزگار — بر نیلیت البرات براتی بروز [illegible]

هر ناخن است دسته بندی کوه در دست — طوفان نوح نشیند این بحر دیده است

بمشهد گر کنی موبد اقامت — ببینی معجز و قدری کرامت

علی موسی رضا شاه خراسان — مزاج هشتم نوح ۱۶ امامت

زنش مار پاش الکار است — غزنی کور فیستی یار و عار است

بپوش یاد اش یزدانی که پایی — طراز منبر کبری سوار است

در دو ضو جنگ شیوه وسنی — موبدا جنگ آب دهقان است

موبد که حفش ره دلی همسره است — گمراه کسی که گفت او گمراه است

پیوسته محمدی بود از مهدی — هر کس که نز جان است رو و [illegible]

طلب کی طالبان گدایی نیست — ترک از مردمان جدایی نیست

خود شناسی خدا شناسی شد — خودنمایی خدانمایی نیست

احمد [illegible] وشیخ بخدی [illegible] — بایزید مرده عارف در حیاتش [illegible]

وضع دنیا [illegible] — موعش ملای روم و کافر او موبد است

عرفان خدای تا اید توفیقیت — قابل شده ام بکفر خود تحقیق است

منکر نشوم [illegible] — شاهد گشتند موبد از [illegible] است

خویش دشمن [illegible] — [illegible] بیگانه [illegible]

بخیر

ستانیس ازلت امی جوی در دیر مسیح — گر شراب کهنه باشد تازه آئین مسیح
حاجت او را باپدر نبود کر چون روح القدس — پور سلطان یکتر شد یار تزئین مسیح
مادرش کر مریست آنکه خیزد از زنی — گر نباشد دختر زرهم غریب دین مسیح
دستگیر میای جام باده روشن نگر — فرش گردون کشته خورشید بالین مسیح
کی نگون آورد غم بر صف نظربازان — جام می کردید جون قندیل ابیض مسیح
نیست چون روح القدس خمخانه وحدت — خطا الخیل است خطا جام بر دین مسیح
خز بیران چه امید است روح الله — بود چو گلگون جام باده در دین مسیح

دلطیفه همه باشد دعای تاج امیر — دلی مدام بود در رح د من دعای قدح

اتحاد چو در ذات خداوند نشاید — پس غیر خداوند بهستی بکر آید

گویند نماید خداوند مگارخ — من بنده آنم که مرا بنده نماید

انا کبر شیخی که بر معروف مقامند — در خانقه و مسجد و هنگامه امامند

جوبای خدا را الجدا که برسانند — نی مهدی ایام کرد دجال انامند

چون دست مرجرا غدران شد — هم آسپ بی پا بد "

خدات خداوند بدار ین نشاید — انگوست خداوند از دو بندگی آید
بی بند یقین جو بود دست خداوند — در بند یقین چو فتد بنده نماید

فروغ ذات تو ارواح آدم داد لاد — ابوالنفوس تویی آدم است ابوالاجساد
ندیده روی جلال تو دیده او هم — بجز جود نوال تو هستی اعداد
مه از غنا نپذیرد ز مهر تو ذکر — اگر ز رای منیر تو جوید استمداد
بی ز ماه کند کسب نور مهر سپهر — اگر ز مهر تو رایت بلب رسد امداد
هزار بار شنیدند کاشغان قبور — ز بیم تیغ تو افغان ز دو خمه الحاد
ز کرد تیغ کم کمند تو آسمان جو جرد — هلال پی تو فعل و ستاره از او تاد
دوام کام تو بادا سپهر نگارد — ز تیر خامه زکیوان مداد حاضر باد

هر شمع مهر و ماه است کز پرتو فروغش — روشن تر است از روز شبهای [illegible] تهجد

آن روضه جهت جنت طاوس نجات — ریخته از گستاخش دربان و مار مشهود
آن نور جهت را که اندر جهت پیوند — موبد ز شش جهت دید از بد دار مشهد
کرده دل نیز اندر باکی بدار موبد — جاوید زند که اندر سالش هزار شهد
صد بار پیش گفتم عشاق پیر مولا — لیک دام هند از زد صوت هزار بهد
از بسکه همیشه سوزد در مطبخ کرمش — افلاک دود و کوکب باشد شرار مشهد
بود ستاره اهل ابر آسمان هشتم — بر قرد درد محکنده قندیل کار مشهد
چون مروان دو نیش انگشت خشم نبی — کو تیغ کوفت در ردای ذوالفقار

کسی کو عارف دادار باشد — مرا دارا باد و پس سپکار باشد
دوئی را چون کنیم اقرار موبد — یکی گفتن ز ما بسیار باشد

زان دیدها که دیده وران عین دیده اند — گل دیده ام که سست ز بوی رشمیده اند
آن بلبلان که نغمه ایشان اناالحق است — زان گل که هر که گلشن حسلم رچیده اند
فرعونیان ز کفر رسانی رسن ابکم — ما رو خیال صوت اطاعت شنیده اند
تا رسن کسی نماند و غاند ز فرقش — یا خوار رسیده اند و یا در رسیده اند
سی کگ خواب دیده و عام تمام کرد — بی بهره من ز گفتن و قوم آرمیده اند

مو بزبان راز مکن زانکه ابلهان — از گفته‌های خود همه در لب گزیده اند
[illegible] بسته حرف خود [illegible] — انا که گه پی زند بزندان نه بزندان اند
از آسمان و شاه خرسند بر اسیر — از آنکه برنداشته اندیش کی افکنند
مر [illegible] گر از همه خویش اند دیار دوست — از جاه و منصب است که با خویش خفته اند
از [illegible] تم گسسته اند [illegible] — گر چشم خود بملک غزاری چه رازند

خان فریدون فر جمشید جاه — کو در افلاک معالی کشود
دید از حضرت شاه جهان — ایلخان سلطان اسکندر نمود
داد کشش از این فر نوریر خطاب — پایه جاهش چو فضیلت فزود
لیکن از این تنگ سرای مجاز — میل بعجز ای حقیقت نمود
گشته ز بر خاکش عناصر رها — آمده در عالم علوی فرود
جست چو تاریخ طبیعت خرد — زنده جاوید شده خان سرود
باد شفیع گفت موبدا — فاضل دارین سعید وجود
احمد محمود رسول خدا
خواسته از داور رحمان وجود
شه نیا دنی باشد از [illegible] — تا ز دنیا بگذری [illegible] کردنیا بگذرد

گوید

اگر نیاز بر برو باشی مرید | دانای خود است برو دانا باش مرید
کز من شده ام مرید عارف داند | حق را صفتی است از صفتهاش مرید

هر سو که دویدم همگی سوی تو بود | هر روی که دید چشم من روی تو بود
هر خانه که جستیم بدان خانه توئی | هر راه که رفتیم ره کوی تو بود

آنکس که ز اصل کار آگاه بود | نزدیکتر ز خویش کسی دی نبود
جز ذات هیچ چیز موجود نیافت | هرچند که شهر بود و موبد بود

آنانکه بدست خویش بخشند زهند | گر از پی شان دهند میدان بجهند
در مرد گرسنه سیر هرگز نشود | در پیچ جوشان بمرد در دیش و هند

درویش پرست بی نیازی نیست | ز در زرف عرش در عرش باز نیست

از سواد اعظم هندوستان دریا بود | سعد اکبر تا به زیران شیر اعظم بود

بهر دل کسی این رمز عقل حل نبود | که باده رود هستی و خمار ذات بود

دل از تن رفته و من لب فرو بندم | باوج چرخ [illegible]
بخط کز خط [illegible] | کتاب حسن [illegible]

پهلوانان صف عشق که جانباز زنند | هر یکی چو هر شمشیر دو ابرو دارند
دو زبان دارد دو بره هر دو دل خلق ازوست | ذوالفقار که ابروی بتان می خوانند
کرده آتش ز بخت شیر دو ابرو دست خروج | دعوت سیفی ابروست که رستاخیزند

رویش ز ری کرده زرد یشتش ندید | در چاه زلف آنجا دل ارسیتاخ کنند
اسفندیار بخت امروز آنکسی است | کز خوان چرخ یک قرص خوارند
از فیض قطاشاه و که اصناف باطنند | بر هر که بنگری تو چنین است دیاید
چنگست تافت همه تار ز کرد | آواز زیر و بم از شکم میتوان شنید
تا از رجهان جهان زود بگیرند | بالای تیر پیر و جوان چون کمان خمید
هرچند آفرینش هر چیز از ایزد است | اما سخن ازی دکن هو بدا آفرید

چنی فن آن نباش دیرینه است کرده ساق — از کیان تخت [illegible]
اشرفی از شرفی داری دلی خواهی بود — خسروی سازد شاهی زا همامان بخرد
تن دخش آب اکنون نخستین بار [illegible] — آبروی مال جویان [illegible]
اگر آن بود کز کشمیر تا کابل کشید — خاک خورد [illegible]

موبدا در حال دل درمانده ام یاری بجو
با همه جمعیتی زلف پریشان میبرد

گر انجم پیش القصیر مرنه ایوان کند — روی الخورشید سازد خال [illegible]
سعد نحس آسمان از مهر کی آید پدید — اطلس چرخ برین را بهر [illegible]
ز ابرو آن لب هر درس اشارت شد — بهر اشارت [illegible] زلف [illegible] کند
از دهان تنگ دل [illegible] — از ذقن سیب [illegible] آرد نار [illegible] کند
چشم خوبان عالم [illegible] خم دارد کند — از دو زلف خویش [illegible] میدان کند
کوه [illegible] — زاهدی [illegible] کار [illegible] آسان کند

موبدا چو یاد [illegible]
ز انکه روشن کار ابر تیره [illegible] کند

از خط فرزند یاقوت لب [illegible] — خط بدر چشم خرد [illegible] شد

۲۰۱

روز و شب موبد برابر پیش [illegible] شد — [illegible] یار [illegible] — شنا بکرد
دوست مایل بر کیست [illegible] شام [illegible] — [illegible] آغاز [illegible] مدام — [illegible]

پیش مهر و مهر زروی دوست نتواند گرفت
آسمان را در تواضع پشت موبد کوژ شد

الحق صد سر فراز که سپهبا خیزد — چو بالا یافت زین بالا سر از روبها خیزد
[illegible] در بیت کلکش سینه عاشق — عجب گر آه آتشبار زمیان سرو بر خیزد
[illegible] — چنین سروی زآب جوی بار چشم ما خیزد
چو بالای تو بود [illegible] — ازین بالا دو بالا موج دریای بلا خیزد
[illegible] — که از هر جلوه زلف تو خورشید [illegible] خیزد
اشارات دو ابروی تو [illegible] — ز جنبت حالت [illegible] خیزد
عجب نبود [illegible] — ز چین زلف تو هر دم کاروان [illegible] خیزد
[illegible] شور خوبی بود دار السلام [illegible] — [illegible] عاشقان [illegible] خیزد
خلافت یافت چون عباسیان [illegible] — ز داغ [illegible] خیزد
ز کردن [illegible] در [illegible] هستی — اگر [illegible] بشنید و لیکن [illegible] خیزد
[illegible] از فریاد [illegible] هر دم — تعجب میکند زاهد [illegible] خیزد
[illegible] — عجب گر [illegible] خیزد

خواهد گشت همچون هیچون تا چند گوئی — خود چو ... بسی مرد کز آن چون دگر خیزد

آنانکه بحقیقت اسرار رسیده اند — در باطن از آن پرده بظاهر نرسیده اند
انکار مکن کان زکرامات شغل ما — گوش ایچ نشنیده بدین دیده ندیده اند
استاد کرده ام من و شاگرد دیگران — یارب ازین دو خلق کدامی گزیده ام
چون آفریده کار شناس آفریده نیست — کی آفریده کار شناس آفریده است
موبد فناست منزل آرام و عارفان — ایضاً در شاهراه عشق ز هستی بریده اند
بود رشا جهان بر در قیصر خسروان
علم دان بهادر گنج باد آور درماند
چو جان در پیکر مردم نهادند — عبث کی بندم پیش گشادند
کلاب روح انسانی گرفتند — بمینای سپهرش جای دادند

خلیل هرکس بهر قدم میبرد — بدست تیشه چو او ضرب بر صنم میزد
نداشت قدرت آزر بهت تراشیدن — بدین سبب ... تیشه از رم میزد
سر هیمن نه به بت زد که کار دیگر بند — کی بجلو ... کاه برغم میزد
بغیر دولت نجوم است بیگری مند — بدین نگاشته دولت ... قلم میزد

دهان نارده هیچ سخن بطراز آید — بگو که دولت ... حرفی عدم میزد

برای انگار ... زاهد دعا را — هوا گیر است دایم ... خاک ...

آزادگان ز قید بدن گشته مطلقند — از خویش و ... گر باد دست ملحقند
توش کر حرف راز تو ... شنیده خواه — هر ذره در ... نظرش در انا الحق اند
بیمار جاهلی که جهانش وقوف نیست — ترسنده زین مرض حکمای موفق اند
عیسی علاج ... ابرص ... — عاجز شد از علاج کردهی که احمق اند
کیفیت از کلام تو موبد گرفته اند
آنانکه مست باده ناب مرد قسند
زدوی کشیخ زن پرور بگو بر ... دارد — که در بیت الله دل ... دارد
زکو شراران خواهی دهان دلبر ما شو — از آب خضر ... تو در چاه ذقن دارد
نماید از میان خلق زلف سر روش — پا مهر سلیمان ... اهرمن دارد
دو گیتی شد پدید از یک سخن موبد سخن بشنو
خداوند سخن را بس بود کو یک سخن دارد
فسر تیر تو از خورشید المناب ... — مشعلت بر تو فروزد ... مهتاب

آسمان ندا

تا رچندروی آسایش بکتی د تخت ... بود فی خواب باد

جبل النور عالم آرا شد ... یار شی قاف ... یار اشد
انچه از طور کشف شد به کلیم ... زین ترائی بحر سدار شد
از وجود حکیم موسی شان ... در دکن طور اسکار ما را بلد
فلک اطلس ار چه عرش آمد ... جبل النور چرخ خار اشد
مو بدار فیض آن سکندر حال ... صاحب تاج و تخت دارا شد

دانی مکر این زمانه ضبطی دارد ... یا خود احدی بید دست ربطی دارد
چون بار نگاه تحقیقت بینی ... هر کس به دماغ خویش خبطی دارد

زان کعبه آگاهان ببین هر کو کو ... ازان آبی که در زمزم ...
یکانه سان راهی بگو بشین ... نشان راه بارش ...

ازان یک دانه گندم که آدم خورد ... شد آن یک دانه چندین ...

افلکی از

اعلی از عکس شعله بار ... نماند ... آشکارا شد بلاش افسوس دارائی نماند
کو اثر بهرام را از زون و جم را جام ... وس کسری گذشت و داد پروائی نماند
خود ... حکمت اسکندری اسکندری ... تار یار اسفندرا اسپندیاری نماند
... از مکر فرست و بو لعب در مکر است ... تیره شد خورشید کردون جمشیدی نماند
کوس کاوی گذشت و طالس ... دست بهمن را برد دستور کرائی نماند
محمد فیضی دبیت المقدس از زر و بی ... طاق دیس خسروی و طاق کسرائی نماند
تحقیق شاه اختر شد مجید د مخرف
از زری آسمان را شعر شعرائی نماند

با خامهای مژگان از خط اسک ابرد ... بر سرنوشت شرحی مو به موز سرنوشتی
هندوستان را گر بی دوزخ ... جز آتش نباشد در دیکشی بهشتی

رامس بدان که بیفتد در کرجنگ ... اگر چه بکشی بیتاب باد کرد

زنیکه دل بلا منصور چون جانب شود ایدل ... نخواهد رست زاهد کو گرفتار دو دار آمد
زمرگان برچکان کشور ... ... زلف بتان مار دار آمد
ز دست دوست ... قانون عشق آمد ... ز رنگ بر قامت خشکیده مجهور تار آمد
مجهور

زشهر دلبران اصفهانم چشم بد دور — کوارا تا بگویم حرف ایمان کوارا بد
برای مزد ماه و انکس شد حرف سنگدانی — تو دارایی دگر روزی ندارد دل ما بیا
میان روز چون پیدا زمین و دیدگان — به شهر نیم روز دلبری ساقی سوار آمد
برای تن چه جای زاری نیست — نام آخر نام قبرستان از نیغی جدا آمد
یکبار آمدن در بی در حشر هم یاری — زد بنیاد زعشق پشت زاهد را

جهانی در پی بوس و کنار دلبر گیتی
نصیب از مرگ این دلبر مرا بوسه کنار آمد

جای بکمو بدانشد خم فکند از زبانی — بتکده کافری مسجد اسلام شد

آذر اگر نظر بکیش آذر باشد — با دین براهیم بکمدر باشد
بت ساخت پدر کعبه بنا کرد پسر — کار پدر از پسر نکوتر باشد

نجات دل ز چاه آن ذقن چون گره او — هزار حیف چه بلبل زره شنید و فتاد

شمع را از هوا کشش پروانه گر پروانه بود — پرده فانوس پنداری حصار شمع شد

علم کلام یعنی وصف کلام خوب است — اثبات جوهر فرد جز آن دهن نباشد

روزی که کندار ما یک سو افتاد — هر چین ختن تو چه هر سو افتاد
شکست دل نی شد ز خونابه تهی — چون شیشه دل ز طاق ابرو افتاد

دوگیتی شد پدید از یک سخن چو بکن بشنو — خداوند سخن را بس و دیگر یک سخن دارد
خلقی لب آبرو ی تو تسنیم شدند — جمعی برضای دوست تسلیم شدند
در بابل ذات ما رسید کل ما — نمرود قوای تن براهیم شدند

چنان با طره در دست بپوستم که چنگم آوده آهنگ — جو خواهد روی خود بیند مان جا جگری کرد

ترک باد چنی زمان شد — اخذ آن خورش بگو چیست انزد
مای ما در شما در پیدا شد — ترک کردن از شما باشد

تخم حکمت خلا سی شد — سیرم از هو گزو جدائی شد
من خانی واکسیر جگر کنم — من مس چون مس جدائی شد

گفته آنهائی که زنبدار آزاد آمدند / دین روان ... باز بیداد آمدند
آدم و حوا شنیدی آدمی ادی چوی / کادم و حوا برا ... آمدند

زناب دوش مدتی بر کشور / زباد امروز ارد باد ... شمار

چون نگاه از گوشه چشم او بدلی ... / زیر لب خندان شد و زمود دیوان ...

تا لب دلدار رنگین کشد زبان مو بدلم / مهر گفتارش دمادم جانسپاری میکند

آنانکه خلیل دیده و همسر بدند / از یک نمرود بابلی رنج بدند
... ذات یار صلح کل ما / نمرود قوای تن بر ابراهیم ... شدند

بهشت باده میخواهد ... / ... که در دنیا با آتش ... میگیرد
آنانکه درین شهر ... / گر شیشه به بندی سوی ... درنگند
در آنکه ... انقلاب حکمت ... / ... افلاک ... نخند

مدان قبول طلب طبع ... کند / ولی درین بخی عقل کل زیاد کند
کریم بسکه زسایل خوشنت از ره وجود / عجب مدان که بخواهش حسن ... اند

... از گدائی که بشاهی رسد / از عطای آنکه در دم میسر آجوی شود

گر بپای خلیل آتش آرا گردد / زان با موسی خود ید بیضا گردد
آن سنگ که شد مقام ابراهیمی / در دور دکردار مسیحا گردد

قدر سنگی که جسم ... واضع ... شود / تکده از سنگ سکی مجد مومنان شود

بیدار تر حسن ز مهر م میکند / بی من بخواب بخت من اهلا نزود

گفته که مانند تو مشهود نشد / مانی تو یا کسی که مفقود نشد
گویند که مانند تو کس این غلط است
انکس که نماند تو موجود نشد

مولوی معنوی ملا محمد درود / انکه از دور ریش شاید چنیم دریا دراز

دل از تن رفته و من لب فسرده بدلم — باوج چرخ نشدن تا بین در دروازه
کمان بروی از خط آمده حسن اندید قدرت — کتاب حسن چون مر لبو دانند تیر زده

از گیان ما نکیام آن جو سر گرد و جهان شد — تا لب خشک ساده از شمشیر او پر آب شد
ابروی او را چو دیدم گفت دستور خرد — طاق کسری مومنان را موبد اعراب شد
آفتاب چرخ عرفانی چو شد دائی نماند — نو خور گفت است کس به چشم چرباء نماند
مسند فقر ترا آسیب دست از فلک — کوه خارائی کند شاه جو دارائی نماند

چون ز کوی سوی کوی بی بلند نوان گشت — چون توان زین بوم تا بام سپهر آباد شد

عجوز کان غنین امهات اعجمی زنند — کرباجرک آبای علوی انباز زنند
بنای عجب که از دیان بلند کنند — بناخی فکنند از بسر دا آغاز زنند
بجز خم کردن رشته اندر وزیرا — تمام کار سپهر رد زه پرداز زنند
بسوزن مژه از جیب زان تو بکنین — سپهر اطلس بهرام از الفس سازند
کمانچه گر بدو پیشه جرم سند سحر — پیر آه از دو صد تشک اندازند

بغیرهمت زال به اعجمی موبد
نبای دختر او شیر دان کی آواز زند

فلا ۱۰

خاک آن کز خاک شود هم چو موبد — بر آب روان گرد فنای ننشند

بی هنری مضطرب باشد — دوری از بی ادب باشد
پند در خشم پیش را موبد — همه آتش غضب باشد

هر کرا او امر در چشم موفق ادا نکرد — بهر فر را دیده تحقیق نور نکرد
دانش ظاهر بخواهد منش باطل کرد — چشم بینا دیده بی نور اینا نکرد
ره بر دیا کاه جنت کعبه چو سر ذل — دانشگاه قرب حق الی کس تر و رایا نکرد
گرچه پیدا کرد ایزد بنده را اول لطف — عاقبت جز بنده ایزد را کسی پیدا نکرد
خاک پیچو خرد بیهوده دادن نادان بود — تیغ اسکندر ازم با کسی دارا نکرد

انچه با اسلام کیشان دختر از امیکند
موبد ابا ارشیخ صنعان دختر ترسا نکرد

تا زکر دو راه جان بسوی عنصری تا او — ساز راه با برگشتش گرد باید تا رسید
ناتوانی به که ذمت جور را بند د بضعف — بس توانا تن که جور کش بسته تا آواز
ناله گر آید غیر چم زد ردیا ولی — ره گام آن زمین ره که آن کسی پیدا
راه ران خست دشهرت سود خواب — ساز کار خشم و شهوت بر دل در ش از جهان

تندرست سلطان غراتست ایکه هر کس خود کس ‏‏ کشت از جور غنا بر در کهش آیه نابید
هیچکس زین سلسله کرد درج سوال ‏‏ برتر و بالا ندیدار برتر و بالا رسید
باج خواهد خسرو ملک غنا از زیر دست ‏‏ از زبر دستان بشاه فقر باج اما رسید
تنگی ملک غنا بنگر که اقلیم نوا ‏‏ کافی دوایم نباشد گر تقسیم بهار رسید
بعد دگر اغنیا آید بدار الملک فقر ‏‏ جای دارد کس نترسد از کجا آیا رسید
حاصل ملک غنا بنود پسندی غنیا ‏‏ هر کرا کنجا پشش آن نجا نیست او اینجا رسید
نیست نابت دین و دنیا از همچون ملک ‏‏ رفت تا موسی زر دنیا باشش دوان یکی رسید
هیچکس نادانی از خود در جهان موبد ‏‏ گرچه در حکمت بفضل بو علی سینا رسید
از خود خرابی بیگمان آبادی مردان بود ‏‏ بعد از خرابی بتکده مسجد مسلمان را بود

به بد نشود نگر بمسجد موبد ‏‏ مسجد کردند چون خرابش کردند

کریم بهره دنیا و دین نبرد دلیل ‏‏ بخیل هست بغیر در سپر راه ذلیل
مرا تجربه معلوم گشت ای موبد ‏‏ بخیل بود کریم و کریم بود بخیل

[illegible] ‏‏ چو خواهد روی خود بیند نمایان حجره هست

یوسف او تا چند روزی جاه شد ‏‏ زین عزیزی حاصلش روزی دو مقرر جاه شد
برخم [illegible] راه حق راهست ‏‏ کی تواند آسمان بار همردان پیره شد
بینش راهی منزل آسمانی عقبی کاست ‏‏ اختلاف کیش ما را رهبر و همراه شد
دهر بالا باده غرد هوا کاه جمعست ‏‏ مدفن قارون و موسی مرد این آگاه شد
هست از اقلیم روز گستان دو شهر و ماه شد ‏‏ مرغ روحی کز درون بیضه کرد در پرید
بنگر رهی فلک بار است جا بجا نرا ‏‏ آسمان پیدا کرشش چو بستر باز گاه شد
طور بیجا گشت از موسی بنیروی عصا ‏‏ بام تا رحج عیسی از صلیب آه شد
خرد بیلاک لقا کردیدم از نا امید دوست
حاصلم این پایه ای موبد ز کیوان شاه شد
جنگ فرعونی و موسائی جز این علت نیست ‏‏ آنچه موسی در همه جا دید او در خویش دید
گفته غرد از هوا خویشان مبالا باد هند ‏‏ من جو قارون بی زر و مجوس حکمت زیر
نان و آدرنغره کرد دوش و جنتانی و جنت ‏‏ مطبخ شاه جهان از بهر ما معمور باد

شاه زمان که کار جهان استوار کرد ‏‏ شمقار روح نسر سپهرش شکار کرد
روی زمین سپرد با اولاد نامدار ‏‏ گردون برای بودن خویشتن اختیار کرد

آن شاه زمان که عالمی قایل شد ظل الله است و سوی حق مایل شد
جایز نبود زوال در ذات آنکه
از جهت که ظل ایزدی زایل شد
راحت کونین جویان نزد مردم عاقلند ترک دارین است لذت لیک ایشان غافلند
ترک دنیا کرده را چون با کسی نبود نزاع نزد او مردم همه نوشیروان عادلند
اسعت طلوع را کو پند معنی زاید است آن سوز مالی که ایشان در کریزار بادلند
کس اقلیم چو در حضر بس بردن نیست اهل حق باشند کفر است آنکه گویی باطلند
ایضا
واقف نشدم ز سر انسانی خود در مزروان و روح حیوانی خود
بعد از تعب دلیل و برهان طلب دانا نشدم مگر بنادانی خود
راهبر و بسیار کس بود دست و خواهد بود ایضا راه همت را کسی مانند حاتم طی نکرد
اگر رستم و سام رزم از ما بند بمیدان سپه مظفر در آیند
ز فیروزی هر سر ایشان چو برسی کواکب مظفر مظفر سر آیند
خسروان زمانه تبران جنگ و کامی کنند بیکی بود تبه کردند از این خامی کنند

چون کمان ماه نشان پیر آهکش [illegible] آسمان نخچیر را کور بهرامی کنند
سرخ گردانند چشم از گریه صبح صادقان رود نیل آسمان را ازرق شامی کنند
در زمان سکر و مستی در زمان جدول مر فلاطون عجمی را جبر عطر جامی کنند
در دبستان جمال و مکتب اوج جلال ماه را سازند شهری سال را عامی کنند
تو مباد در وقت فیاضی رسازد و نوبت روح را بخشند عقل و جسم را نامی کنند

وقت عناز مرتبه حرد می بود دریاب وقت را که مبادا قضا شود

علاجش دار چینی غیبت درمیان دارد برای کوفت منصور دارد دار دیگر شد

با شانه تو ریش منیت چو ند اگر اگر بر دست آن ز بر کند
این شانه آبنوسی شیخ کالای بد است و ریش خاوند

هر که را فیروزی و اقبال دنیا دار شد اولش دنیا است اما آخر او دار شد
بیش دنیا دار پس میرود و بنا برست پس داری در پس دار دنی
خود سرا نا چند راس اسب گردان کنند پاکی نخجان و مال نبود مکو پندار شد
پای او ز ریش آورند اند اگر او سر دار شد

خانه‌ای را که همه خانه‌ نمو بجهانیم — تا کسی پنجان و ... دل نو پیدا شد

شیرینی و چاشنی لبها — حلوای در بهشت ... شد

بد بود با آنکه نیست از دو الدین اد انراد — هر که از نه شوهر دو زجا زان در دو زاد
میر گردد آن است دیکم غفر و منی مجمل — پس حوالید ند ملا امیرزائی میرزاد
نیست جز بی‌کار و سکام در جنس خرد — جاه رستم فال دستان مگر نه شغاد
سبعه چامی زد خواندیم را افلاطون خم — جز شب مهتاب زین مکتب ... زاد
کشته خویشان از هوا غرد و بالا ... — رخ تار و ان بی زرم مجبوس خاک زیر باد
ممسک از زر دان ز حفظ زر بود موبد جوک
جاس از کسری پنجر ار دار زر روانی حباد
گوید که به دل بود و عقل نشنود — گویم خطا بسی است که در کفن میرود
هر دل که نرم نیست سزد ... — خود خار ... حیم بگو سنگ ...

... رسته ردان وتن نماند — بلبل رود و چمن نماند
میران ... دهر میرند — یعنی که سدان بدان ...

...چگونه دست یا بد — باید که تراکفن نماند
... کند اگر نجد از تو — کر مرد بگور کفن نماند
... نرت جانسپاری — مرد از تنت زعن نماند
... در کد شت است — اندوه زراه هرزن نماند
بارسی ماکه بهوان پرستیم — غنچه نه دو بر یاسمن نماند
از آتش ریش کل شسته تا چند — هر گه آید ت و دفن نماند
بی شبهه بهشت خلوت آمد — آنجای که مرد و زن نماند
دنیای دکن چولی شبات است — موبد لختر احسن نماند

- زاهد بکند سنه ارتق خفکذاری کی کند — یوم پنهانی وطن مهر انگاری کی کند
بوالهوس از دور پسند سر و بالا ... — بالب بان خورد او جانسپاری کی کند
در تنور حیرت خیز از نال کرم مهر نیست — در خور من عشوه را قرص نهانی کی کند
بهر جودت تار کی احتراز بدن — حضرت سلطان روح من سواری کی کند
تن به پستی و سلوک عشق در بازی خطاست — کار میر سر بداری باجیاری کی کند
سالها ماند بر تنم خاکستر کلخن فنات — عود و صندل ما من جو نگار ...
هفت من ار پارسائی غیبت السنبی برود — جسم من در زنقت ... ریاری کی

کشته‌ام موبد کناری از آن خونها   فکر چولی دگر ساری این کناری کند

می کند این سپهر پیشه گزند   زیر بند امیر بالا بند
راهبر برهمن نهاده به بند   نار و زنار و سبحه پوشش هند
رسن و چوب بجز دنار است   بهر تادیب شیخ دانشمند
اهل حق را زاهد ناحق مکر موبد بوید   تی ز ناحق به بود پوشیده چون ماه [illegible]
از شهیدان پایه عشاق بس بالا برست   کشته حق عاشقست کشته ناحق شهید

والای اسکندری دار ابر د   خارائی سنگین دلان خارائی [illegible]
صندل غمی مانند بتان [illegible]   خاک ره دشت محن گردون [illegible]
در شهر اگر کشتی تلف مرکز عمامه کف   بی دعوت مجنون ما صحرا [illegible]
در دشت امین نور حق [illegible]   در مصر ز خون است [illegible]
صحرا نشین کشمیر زمین [illegible]   باشد که از شهر خدا [illegible]

شکوه چون کوه اما [illegible] ستاند   آونگ زیب از ما سحر امی ستاند
[illegible]

ما را نیز دست با هم تو در دشیم   ما را جز خدا کس از مانی ستاند
آسوده تو موبد اگر دار هستی   تحت عنصر [illegible] ستاند
زالای وس و دنیا الا کشی ندارم   الای ترک این اهلای ستاند

انده من شادی دستور تو ماتم می شود   غم تو در شادی دار بنده غم کی شود
هر نفس از عمر جزی کم کند دوران   از نو نشادی کم شود از بنده غم کی برود

اسلام از وجود تو شاه زیاده شد   کشمیر از قدم تو دار العباده شد
از بهر سروری متی و جاه به آتش   تا حکم حق پرده تو بر مسند باده شد
بی تاب و توش تا کی ز هیبت خدا چنانکه
بی یاری عصا نتواند ستاده شد

باده نوشی چگونه بگذارد   عارف از ناکس [illegible] بیزارد
بی زبانی چو شیشه‌ای باید   تا که راز ترا نگه دارد

چون مراد رحمت ذاتی طلبکاری برد   هر که را دیدم بچشم حاتم طائی بود
[illegible]

عادت عادل نماند ... بنگ   قوت شد از خوش شنیدی قوت ...
مهره خاکست گر بجبه کاه عازن   درجدل ایم تیم ... زبود
میر عبدالقادر گیلانی ثانی کرچرخ   در رکوع ادست ... بود
از دو زرگ هر دو گیتی بر رش ... کلاه   قطره هنتش ... بگرد
جزو جزو ... کل نقول معرفت
درد لبستان لعی حلا موبد سرد .
اعدا همه پرداخته معدوم کند   بر های هرازمن چو معه نوم کنند
توفیق طواف کعبه کی تجشند ش   از آنکه ز لطف کرم محروم کنند

امروز کرد و ج راستی کس نکشود   ... گوئی ننمود
صادقی از خصم ندم موبد   درباره من بدی کر کفت او حق بود

عالم اشکار ... ختنه دشمن موبد   هر چیز کر ساخت کفت آن ... بود
گر تخم بم زبان بد ... ره کشود   از زشتی من ... بود

عالم شده ... دشمن موبد   هر جو کر ساخت کفت آن کمتر بود

۱۰۲

... سرد کهن ان مو ای   حنیف کانور آق کشرری شد

بی تاب ... تابنده نشد   از پرتو او نقیب این بنده نشد
بیدار نشد ز خواب بخت موبد   این مرده بلب عیسوی زنده نشد

تا جان چرخ افتابم داد   ساغر ز جام افتابم داد
نیکنام زمانه خانه انام   موبد موبدان خطابم داد

چون پوز رین ... فلک رام تو باد   ... سپهر ... دام تو ...
از اطلس چرخ دور درزشکاف   اماده عشان ابرش کام ...
شاه کردون زر تا جش کاسه ...   چوب تخت خسروانی بای ...
جامه دیبا ز بند ... بخت ... است   همچو کرم پیله ... باد ...
مینو رشک قصر جاه خویش دان دارد   خاک ... از دارا کو ...
زود خواهد یافت از تابوت میدانم   میر از چشم ز ... بالی ... میکند
موبد بالا ... الای دنیا ی جاست
هر کرا کردون ... از در بستی نفکند

بالش فغفور و بیا کنند خاقان بزند   بهر پرواز همای جاه شان بال و پرند
مسند شاهی نشاید تکیه گاه خسروی   زانکه شاهی بال آرایند و صبحی می پرند
قیصر رومی و دارا شاه ورای ملک شد   بهر اموال رعیت جمله شاه بر سرند
این کریمان چون خسیسان اندر روز عطا   در بدر و پیشان صادق را که با خود برند
از لیمان کس نخی تربت نزد حکیم   زانکه گرد آورده را یکجا بدشمن بسپرند
آنچه از مظلوم ظالم برد بسیار در حشر   شاه کار این شد که بار از جبار جبر آورند

بهر قطع بیخ رد غم ز کراه اند
از نفس سوهان زبان و تخلبند عزعز

کردش شبیه یحی تیغ پیکیزه هلال تو هلال   کفمش نار ریاست با بردی سفید

آنکس که کرد یاد یزید از رحم   از بس که کردن سر از عشق و رسالت
در شام از یزید تف مدا ستخوان دلی   کور ریدی سینه سدرش لیک حال طه

میزند با نها زخم کار در دشت بدیدیم   افتاب حسن با من جهسا بازی میکند
و زبان و تیغ ابرو مردمان زخم زا   مردمان دیدند دلبر بهر بازی میکنند

بشر از هستم یار و رفیق و آشنا نبود   خدا را همیکس الا من مرا کس جز خدا نبود
زبی یزدی از ماکس نشد زندگی پخ   زبی یاری ز بعد مرگ در غم کس نبود
ز غم چو دلی یاری بس این بود کار آخر   بر شمس چشمگاه و دوست را ماتم ابجد
ز غم نیچی ما هستی آزاد آزاد م   چو من خود نیستم آزار من مو به مو بود

چو ما شد سدهٔ علیای دهل دم مسکن
رهی دیگر نمی پوییم چو یم از رهسنا بنود

هر شخص خدا را از خود حمید اند   زاین درعرض وجود خود میخواند
نور شید نمود ذات عالم تابست   کاذر یکمان کرحا مشری خنکا اند
بد پوشیده این جسم از داد   شود ظاهر مرگ شخص اضداد
نهان ما در بدن با همراه جان جان جانان   نهان شد کز زن آتش عیان زاد

دانا رضوان رضا قبض ما من شد   نادان اهل دشت طمع چو مکن شد
از ناوک کی ره هر چند او   از جوشش آز تمردی اجوا شن شد

دل مرده و فسرده باز زند کی گراید   یکشب حکیم ملک ار اهر دست دوگنی
هند شام را یکدم از د حباب بخشد   او را هیچ گیتی کفانی همیشه رسید

باموی جسیما به کرکسپهرش | لی شهد دل اشک از هر دو بر آید
اوکامجش کیتی همکامیاب هستی | کام مرا بدین چشم خواب این نماید
ان ای حکیم گیتی خوردم فریب جابیت | دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا لطف نست واجب یا خشم تست لازم | یا تن رسد بجانان یا جان ز تن بر آید

بجز همراهی سید مظفر هر که میجوید | سوی خسرو کسی باشد که بی احمد خدا جوید
سلیمان است شاهنشاه و سید آصف دوران | ازین دیو خیانت پیشه بر خود از آن جوید
طریق اتحاد دستور شاه باشد از جوید | گر از باران جهان تو گرد هر خطا شوید
پدیدار است و پنهان نیست هر دو الحمد لله | بقول حافظ شیراز از خویش میگوید
خدارا ای شه خوبان که درویش سر کویت
ره دیگر نمیداند در دیگر نمی جوید

جز صدق براه دوست راهی ندهند | از دوشتر از آنچه یار دادت ندهند
یاد آده کم بسا چون نور بر یند | گر این زیادی که زیادت ندهند

دو راز سعی اگر کام میسر می شد | الجبران همه دور سکندر می شد

عادل ... | ... تا بر مه | عاقل آن باشد که او راقم ... ساری بر
جهانشاهی که نقش دنیا را چه پیش فنا نیست | است ای موبد که سید جنی ان ... بر

عبد الصمد | ... یک سپر فضل است | بر دو عالم غب در روز خورشید دگر انداز
ابرانیان ز درانش یکسر شرف سر برند
کیلانیان شرف شاه زان فیض دگاه اند

آنانکه با شکوه کیانیر صف زنند | در عزم و حشم بنده سید مظفر ند
نواب حسن خان که افراد لشکرش | از بیم سام کشته د خود زال از زر بند
شمشیر او که نایب شمشیر مرتضی است | چون تیغ آفتاب درخشنده گر ند
حال چار کار عرض بر دوش خویش | بهر براق او زکه کهکشان پر بند
آنانکه با رشته او کشتی کنند | از ذو الفقار خامه او فرق بر برند
مرو بتان عصار خطا استوار است | در خیل لشکرش همه بر ره راست رهبر ند
از بندگی او همه عبد النبی شوند | آزادگان که بنده دادار اکبر ند
دشمن فنا سرشت از انرو که بنده اش | هر یک سهیل طالع والماس گوهر ند
زان لشکر دهر نیاید مثل او | میر ند در مصاف اگر میر لشکر ند
در راه بخت خصم نتازد که لشکرش | هر یک هزبر شرزه دو فرزند حیدر ند

عادل ارباب

با آل فاطمه نکنند آن چه چنگیک   کربیل مینوند همه خاک بر سر ند
مو به بزم و رزم محبان در کهش   فیروز زهر دو کون چو آل مظفر ند

خواهی که ترا نیک بدانند همه   [illegible] راستی مکر

من علی گویم از دین بگیر زو راه کو گیر   از جوانمردی برانم نامراد مود پر
از میان کفر و دین نیکی کین [illegible]   رگ با مومن گذارد باده از [illegible]
چون پادشاه [illegible] لب [illegible] جواب   [illegible] شد از شیخوان [illegible]
در جل [illegible] شاه [illegible]   آهوی [illegible] شد کند [illegible] پای میر
مسند شاه از [illegible]   [illegible] بود یا [illegible] فقر
هو نیا در داد [illegible] ملک [illegible]   ذات او دامور [illegible]
شد چو [illegible] شاه داد [illegible]   [illegible] از قلم دست دیر

نازکم کو [illegible] بود باکی بسیار یار   کوشش کن [illegible] راه ناله بلبل [illegible]
[illegible] مسلمان [illegible] کرامت   کردم [illegible] رشته زلف [illegible] زنار
او [illegible] بلبل [illegible]   [illegible] بر گل گلشن زنار

[illegible] دست [illegible] دیدم [illegible]   زد بپای [illegible] صدق [illegible] بار
کرده اقرار [illegible] موید [illegible]   خلق [illegible] رهبر [illegible] کار

چیست چیست که ترا ماری نماید روزگار   از خط سبز رخ گلنار دریای بهار
خنده [illegible] لب [illegible]   دست بوسی از [illegible] سرو بالا [illegible]

در این زمانه که دانا بود [illegible] مقطر   شد [illegible] فرهنگ و مردمی ابتر
چگونه مردم دانا به آب و جاه رسند   که از برای بزرگی [illegible] خود

دیده ام [illegible] را تا پای [illegible]   بر [illegible] اسکم [illegible]

آن [illegible] که دو دستدار [illegible] دار   کشت [illegible] عیسی چلیپا بود [illegible]

بهر [illegible] روان [illegible] روح [illegible]   [illegible] جانست [illegible] چون [illegible]
شهریاری عالم آرای [illegible]   عالمی چون [illegible]
[illegible]   [illegible]

از این گلشن گلی خورشید انور | ز حوض او حبابی چرخ اخضر
درین ثابت بنا کاخ دل افروز | شهنشاه فیروز و مظفر

نیست بکارش نصب برکشد ابرا عنار | پنجهزاری ندلت پنجهزاری کوار
موبد و چمچی بس سابقش کرده | هفتهزاری نسبت رادم خواسوار

تیره مژگان او را کسی معیارم پر | بالب پان خورده با کار بری میکند

ای دارا ارباب معانی تاج ور | این بیان بشنید بدیع اندر هنر
حق نصیحت و جزاد موجود نیست | عالمش موبد گناست. مختصر

منطقی چرخ جهان و کبهوار | بر بیان بسته است ادیم من از دکار
شهر کیمیا عشق برای منعم | من بدولت کرده دام وام دیده

بجز زنار را پیدم دو تار | ز دشمنی هرگز نبینی زین دو تار

آز ۱۹۵۱/

از برای این دو زنار گشت است | شد زبان کافر و مومن گبار
آسمان باز مد شیخ و برهمن | در قضای کفر و ایمان زین دو تار
طلب بر مند شیخ و برهمن | بزم عارف ازین ساز دو تار

دست ده باشد فلاخن هست کرد از گل | بجز زنار شهر دین ازین بخشد نار
تار را اگر با رحیا از حکیم از سیما | لیکن چون این سر دوم اگر کس
جام با برتاری دوزخی بهی میتابد | زیر دست تاک موبد کی خواهد

نیست دا برد کرده بس دخوکر دیگر کار | بی سخاوت از سخی عشق کس نکرد تاهدار
تاج بخشی بی حیثیت است از درگشتی | دست یار افسای کرد نیز در شهار

گر خبر بود عذاب هیچ مخواه | انتظار بان دون مکن روزه مخور

تا دو گلگشت کنار جو بیار شد پر | باده در سینه بار و بهار شد پر
شاه داد و بهار روز نو دراب | ساقی مطلعت آمد جام از شد پر
ابرده دیلفام و بهر صحرا وه روی | مرغزار نغمه گوی دم عذار شد پر

خال کشمیری تن دمارت زلف سهو خمان — از تن درلف بتان شد تن المار زنده پور
کنگ دارسنگ رد چون خویش آنگه زر — چو شد از سپر حسینه خوار ایشار زنده پور
دشمنان از آتش اشکار و باد من خاکیار — دوستان را به زلالی کسب یار زنده پور
چرخ اطلس از بیم چرخست ای ایمان کما — چرخ خار است کو نا ملائم زنده پور
چرخ اطلس گشته خار از چرخ در بیم کما — شد محمد در امکان از کوسار زنده پور
کشتی بوان راجد الامش رو چون — رستم پرپان اسفندیار شد زنده پور
بخت پرد بری اگر یاد رشود مو بدگر — باده بنم بارگاه شهریار زنده پور

اگر کس ببرد منت میر بکش — افطار بسان کس بکس ر روزه بخور

بتاج شاه داد تابش بهور — درین نور زوار شد نور علی انور
بود جمشید خم جام خور سید — بجنم عارفان باده جمهور

زهی کتوال حسب عدل و تدبیر — مس قلب جهان را عدلش اکسیر
شعار او همه زهد است و تقوی — حدیث او همه فقر است و تفسیر
برتیغ عدل از عالم برانداخت — نشان جور و ظلم و کشید و تدبیر

شفیق اعتدال امر و رسید است — زنایه خدیو عدل و سیر
زعدل او گشت بر فضای بطش — چرا از فسر اطاد در تفریط تا بر
نیابد مهر چرخ بکام تابش — نیارد ابر چشم در وقت تقطیر
اندود در بزم عشرت یار دیتهو — وزدود در انجو اگر گشت
بعدل کبریایی دین احمد — مطابق کرده از تا بید تقدیر
بود در بحر عدل و داد کسری — بدانش سپهر توحید تقریر
مسلمانی دهم نوشیروانی — بارش کو دهری زد یاب تطهیر
بعهد او نه سکندر منصور — جم خنجر کشید نهار تصویر
سلیمان داردار تهذیب اخلاق — همه دیو قوی را کرد تسخیر
بجود آدم روح حید کرد — ازد ابلیس و دهانی به تشویر
سادت را سعادت از وجودش — حکومت حکمت از وی شد توفیر
عدالت ار خیر بعت بافت زینت — ریاست از سیاست دید تنویر
دعای موبدست و مدعا این — پس از تمهید و از تهلیل و تکبیر
دوام دولتش از دست قدرت — بکلک سرحق آمد به تحریر

اندوان کیسه تداخر حسنک حم بارگیر — انتهی دیگر راهبر سیده غزالیکر

کشتی تن را بهر اصل از چار موج غم رست | باز نه گرداب بحر اخضر چرخ کبیر
زفرف رفتن بگردون غیر جسم عود بست | برتر باشد خواهد برد بسمالی سریر
پاس تن را چوب بست از کوده ... | تا کما از خاکستر گلخن بود ممکن عبیر
نادک آهی که جوشن کاف چرخ بشکست | کی بدر کرد در اسیش ...

زنده جاوید باشد خسرو اد زنگ فقیر

زامتلای زابتلای از چون میران حیر

بخشش عامت در هنگام افلاک غنی | باده بی اسکار نبود در سفال جام زر

چون جسمانی بتاند در طالع خس فقیر | کاشش میرالجن بکم میکرد این چرخ اسیر

شاهی از سر بفقرای مرد زیر | در شاهی و فقرت این ... نظیر
چتر تاج از شاه رفت شاهی برود | چون خسر قسر نماند با فقیر است فقیر

ای حکیم الملک هستی ای مسیح روزگار | ای خلیل کعبه دل ای کلیم کردگار
هور یاب دریا دل ثانی بعقل | ای فلاطون حقیقت ای بیدار هوشیار
ای نظام دین و دولت نوح ... | آدم حوای معنی ... عرش اعتبار

در احبس ... طیس سقراطیس تو | قلیوس تو امیس در دفش ...
یلدم از ... درشانی سیر ... مسیح | یکنفس نفس ... تو صور ...
خسته در ماند بشر مرده ... دوام | از بو اسیر ... دمامیل و بهار
... اقبال ... | کرچه چون ... زخم ... گوار
فارسی آتش عزیزی کرمی تن بدفرد | کشته دندان ... های ...
دیده ام چون پیوفا ... زال آغاز | کشته ام از ... های تو ...
احتساج از کشور احکام ... دل | میتوان از ... چوگی کرد چون ...
قانع بر لقمه دختر ... زر دهر | هر چه ... است از کفاف ...
پنجوی ... باشد زر ... | بهر روز ... آمد ... دار
ای تو امندان ... قبله عهد فقیر | بهر سود اندوزی کشتی ...
تا حبا از البعد ... نقش ... | از بخیلی در ... ساخت ...
انیس همدمی بکردن بند ... | در ... بقصد پاس ...
ای نظام ملک و دین بهر کفاف ... | میتوانی یک ... افی کرف ...
آسمان و ستاره خوان ... | تو ... از ... دو دستان ...
قطب گردون غوث ... شاه عبدالله | گردش افلاک ... اور ...
حافظ او مصطفی ... | بخت پا در ... خادم ...

خان دوران داشت ابر کف بر دهی — زد دو دیش مرده آسا مر توغانی دم اقتدار
انکه او شاه جهان و پادشاه هنر بود — چون ببهدد قول شاه شیر زنده یی ستوار
زمره شده ندان الخنین در سپه پیدا امد — دشمن خود دید پور حوش شنی را زار
غیر خیانتخرکه دار قدر ایاب بلند — نظام من اختر نظام دشمن بکوی تمام
در فرحت شرمن جهارت باد جان تمام — در حمایت نام من هم پنج سخن یار
نوبت الرحب رفت و دولت سابت — حکمت بر راست جابا آن اسما ارا انکار
نظم و نثر من همه جا من منادی میکند — کرچه من لب بسته ام از خود ستایی زنهار
همه فن با و کمال و دولت و حرمت خوار — بر نم سالیسته بکیده زشاهی نامدار
حاصل این ده و ده صد هونی ماه تیم — بیمحبت با زهد و شخص ساهون دو هوبیضه بانبار
باد و لی چون پادشاه و باغی چون نیکیم — همچنین ازین یاری هم خواهد کرد بخت کامکار
کوس بردار ستم تا حکیم آر دهر — از شفا علی این علیل و ز عطای تاجدار
ابلق ایام باد ازین دلبر از پادشاه — تا بود خورشید تابان نیک کرد دم کوار

ساقی کاوت رخ کان خار — نی کمر سر و قد بنجه چنار
غنچه لب کشود و با من گفت — هست از فیض یزد داد ار
تیغ بهر شیار خان نصرت مند — ابروی حیش فتح در پیکار

روز بیران زنار کوش شن او — جشن او رنک ریب شاه کنار
شست خم حلقه کمند بیشش — ملک را کشیان اسد اسب و جهار
دو دست از قرار از دو قرشش — دشمن از شمشیر افتاد و کریده فرار
برکرشش عیب جاهش را — میکند سار بان مهر مهار
خان جم جاه مهر سپهر — سام سیماد کشش و زدار ه دوار
بندکان خدای را یار او دست — مرد را خود خدای بر حق یار
این دعا بدعا سے خلق امد — ختم کن حوبدا بدین گفتار

افسرده ام از سردی هنگام جرا حکر — انشکده کس دیده در ایام جرا حکر
از کریه طوفان منش بحر او ش — شد دیده من شور چو بادام جرا حکر
هر چند ز غوری است شد کر سکم — رنگینی از و باده کشیده ام جرا حکر
از عهد بعیدم خود اندوه اندوه — کردیده کنون ماتم ما تام جرا حکر
فرزند من او بود کنون بی پسرم من
فهیده مرا تم فام حسنا اخکر

هر کسی از پای زن دارد بدوش خود دو مار — شهوت ابلیس و مردم خر از دختی دار
نخر دو مار اکرد انجزر زنکیسر حشیار — او زراه حیرکی شد نام ما نو زداد

درنجی شد دوباره موبد مشهور   رایین ز دلین ردم [illegible] پور
کاری که بدر کند در فرزند ولد   از آن باره گرفت والد این زر پور

نبات هندناری خیز باشد   بود کیلان اگر خاک بدل اخیز
بغل زین برستم ستاز و ستار   انگار اکشور زمین نه براز
بنده اکنون بدانکه خواهد رفت   مصطفی رانزد بنده نوار

هر چه حسن جوید ز دل بردلبری است   برز حسن پنجه برگ حیدری است
کعبه دنیا بجو سیلاب چون کینه گر   یاد دارم ابتدای تو گرچه است
زو بپای دودست بال و مطلبی اصلاح تو   عاشقان را مالو جم چاکری حضرت است
دولت آباد کهن را شد نظام الملک عهد   خاصه ام را از سیاهی عنبری است
راه بردم تا بجلوه گاه شهر و وصل یار   چون زموبد راه [illegible] ری
تجردی بایدت کردن بهنگام زوال   از روان کاوه بشنو زوری است
از قضاهای این نگون کاس   دربدر تر ز دولتم زانی اس

دار [illegible] تو آذر راد باش   از شهداد و رکند رعین داد باش
از ساده راه سرخ بمبدای میری   پیسکو چرا بیت کو چرا طالع دشاد باش
رمز رنت گفتگوی فرقان سکهد   موبد ز خود نکفت برین شاد باش

بر هر کس دید میکوید سروش   آذر برزین بود این سرخ پوش
رای او را خواننده آذر مهر مهر   مرلش را گفته آذر گوش گوش
آذر زردشت یا نوز ا که   هر چه میگوئی ز من بشنو بپوش

تعظیم خلایق کن و خلق ارا باش   بس محترم مثال نخ دیبا باش
خواهی که [illegible] تو بر جای بهوش   قدر دگری شناس و اوج افزا باش

آن یار که بی نام نشان بود نشانش   بسیار نشان داشت بساند است کنش
جوینده او بر دجهان بود دلیکن   دیدیم عیان در کمر برد جوانش
آوازه او بود سر آوازه شنیده   از نغمه و از خنده و در سوز دهانش
کفته بگو بیت [illegible] را در ا   دیدیم که هستیش همین بود نهانش
سر پرده حباب پست که افلاک تو خوان   زان مجرد وجودی که عدم گشت گرانش

دار [illegible]

مراد دل یوسف مصری است بن مانده چاه کنعانش — خرد یعقوب جان ما حواس حجره احزانش
بقطر چشم سیل از دیده را چون موی جان ترا — غضب فرعون عون اوست شهوت ذات هامانش
دل آمد تخت ملک جسم را بشناس ای عاقل — روان جمشید و هوش آصف قوای جسم دیوانش
مجرد گوهری داری میندازش در آز و آرا — ملک در ملک جسم است خود حیوان مکن دانش
تنومند ار شود تن ناتوان گردد روان [illegible] — زیان جان بود سود حواس تیره طورانش
روان سوی وطن بوت قوت جبل [illegible] — ره انجام و باید بود اول پس پایانش
جوانیشان راست میراند مواج شور [illegible] — وزان سلم نشین [illegible] باشد حجم [illegible]
نکو گو هر کسی کز مال دایم بود او را — کلو لی سان و جز خیم از اسکندر [illegible]
بود قلب حزین شاد در فراز [illegible] — که چون خندان شود مجلس چو دریا [illegible]
کباب از غصه دل بر خوان دگر [illegible] — ز آهنگ شور چشم خویش باده [illegible]
روان از تشنگی خشکیده تن بر کنار آمد — بود در نوحه گر چون نوح در آب چشم طوفانش
روان سوی تماشا ز آسمان اگر برد خورشید — خرد استاد و جان شاگرد و عقل پیر دبستانش
بشاگردی پذیرفت [illegible] — گر گرد از هستی موهوم [illegible] دانش
جهان خوانی کتاب متن [illegible] — گر از دنیا و دنیائی در دیا [illegible]
نصر الدین محمد الدین بود [illegible] تعلیق — چو خوانی بهر خود حرز [illegible]

کلام عارف حروف [illegible] افق گیتی — کتاب شرح تجرید است و تفرید است عنوانش
بجوی از [illegible] جرخ روئینش کاو [illegible] — بود و نان تا نریزی آبرو از بهر دونانش
ز تیر پور زال چرخ روئین تن نماند — که ما صد داستان خواندیم از دستان و دستانش
بجوی هفت کعبه جنت هشت ایوان — چو دیدی هفت طور دل [illegible] ایوانش
قوی لشکر غضب [illegible] کام شیرویه — بدان پیران [illegible] عقل [illegible]
مکن [illegible] غرور [illegible] حواس ار راست [illegible] — که آخر شد پشیمان گر چه نادان [illegible]
[illegible] را خم گر آگاهی — کرامت از شکر [illegible] افزون [illegible]
هراس [illegible] از زالی کورا — همان قدر آه [illegible] اشک [illegible]
برو [illegible] فقر از جاه — که در افغان [illegible] افغان [illegible]
تو باز [illegible] مردان [illegible] — برهنه خفته [illegible] خفتانش
ز آب تیغ رستم جان [illegible] سود ابر — سیاوش رستگار آمد چه باک از نار سوزانش
[illegible] نشین پایه [illegible] — که [illegible] فقر و عرش [illegible]
زد بهم ملک کجکول خود [illegible] — که کجکول از گدا بر خورد افسر سلطانش
ز روی [illegible] ابرو عارف [illegible] — اگر فغفوری [illegible] خاقانش
بجانان جان [illegible] — که کرمان شاه را آخر [illegible]
ختای دلبر [illegible] خطا باشد — که آخر [illegible]

ز صورت رو بمعنی نه که چون نای تهی | کنون بر خاتمی بست اوی خامه جوانش
چه سودی دل که غم آمد از زیان بایده ترکانش | ز افزونی منوعه بر کس از روز قتالش
امیر المومنین فاروق تیغ اوراق نزقا | بدان آتش کرد تعفید مصحف سوختش
خبر داری که چه خیبر کیمر کوید مه کر اکنتیم | رو ندا انجام فرزندان از تیغ تیز آتش
بگفت از سعد بغداد و دو تن از بهر دل | تو بغداد زده دو تن دیدی فتاده از سیداش
منوشاد از بری گنج مداین را که برکوفه | تبر سل ز پور تولی خان و وزیر لنج بلااش
مکافات حق این آمد که تخت ای نا حق این | چه خواهد کرد در روز باز جو داد ار کمانش
چه سود از کنج بی اندازه مرتضی تا زیرا | چو مار آتش در رم کیر زده ده دستش از بوس سلطانش
بدان مانند ستم بر زبر دستان بهر زجوی | که بام قصر انداخت داند از بندیش انتش
تو بر خود آنچه نپسندی بغیر خویش مپسندش | زرنج از رنج میکرد و بسی رنجی مر جانش
زمین را نیست پر بهای ز خون ظالم کنونو | بشد سلطان حسین اکنون از آن سر جایش
بخیز دار بنا که ز جنگ انگیز خونریزی | نریزد هیچ جز خم آتی به تیمار تو خاکش
نه زالیادی لسان زد کیوه بوش که باخرم | نگاه دکاده را از کین کس بخاک نقش نوش
که آذر بود توران شه و بی از رزم ایرا | برفت افراسیاب آنی نه نیزه کس حماش
بچندین کوس کردن کاس که کاه تخم | کنون زان طوس طالی تخت مانده در بنانش
بدون فرا فریدون تبه بود کرا ایرام | فریدون رفت چون فرزدی میکند سرانش

بمیدان ... احسن عیان ناید | مرا و کون بازی کشد چو تافت جای کاش
چو قوت کشت ساقط بود حسرت آلوات | بود در خانه و خان کرچه فر هما فر او ایش
کسی کز شهر حسی شب برون آمد بشهر نور | چه سود دارد از آب ایماه و درد رحم کل اش
دو قوت دو زمنت کردات عیدای حکمت | چه شهوت میمون زن کرد دیار حرم سالش
بهمی نفس از انبت زدو بر کر طمع داری | ثواب عید ابراهیم دو مرد ز عید قربانش
سری بپیدین بپای آمد دنیا بد دو لب بدین | تو آز آغاز دنیا بین که بدی ابتدا سالش
به نیر دو منند دنیا دار بد جهان چون آخر | بزرد فرس در پیداری فریدون کرد هم آنش
برای ار بحان عالمی جهان نمود اول | در آخر جوی مار اساس جهان کرد نهانش
اطاعت به که چون نهر الب خرد و حرکت سالاد | طغا نفس ابلیس نخواهد گشت از بنیاد طغیانش
نگرد در بچه جان کز آز نبود در جهان انداز | بنان بدبنم بر بهر مار چون کنند زند و ندانش
مپرس آزاده شهوت که از آبا بدل طاعت | بجوید ز امهات آخر بجز و خر زر اینانش
زردی هر کسی خوی بد و نیکوی ای عارف | بجشم دیده در بیداست کردار نه پنهانش
نه بس مومن نامردم که جز خشم انگند دوام | دهش هر بر مسلمانی ولی دل مسلمانش
جو دمنیت اینکه بر دنو مسلمان خوش اختر | درون تو چون شود ایمن که بو بی نیت ایمانش
چرا تلبیس بر ابلیس فاسق چون کوره | دجود خویش را دیدهست تو نابود دستانش
چه سود از طاعت ظاهر نهان نفس چون آتش | مقلد را نباشد بهره آخر ز ایمانش

بلو

وضو و غسل را زاهد نمی‌فهمد اگر گوید | شد آنکه از خودی شستن تن در پی او آتش
تن از آب این ظاهر رود اثر احرام و ضو باید | وضوی تن چو می‌سازی بشو جان را چو گل
برای قرب حق زاهد چرا ره کعبه می‌پوید | سوی حق چون کسی پاید ببابی و تو بود ز انس
دبستان است مرتنها بخوان علم الیقین | کز تا عین الیقین سازد زا بود حرم رحمانش
به پیداری نظر کن زروح خود پیکر عشق | روان باشد روان در خواب تن این بار
درین مکتب تعلم از موبد ربعد هستی بگیر | بر دنبال مراد را چو عقل از سر چرخ گردانش
ندیم خرد هستی کند فرزانگی جان را | ز فرزندان خود خواهد ز همه سیم دستور خرد
ز خرد و هم چیست عقل اولین باشد | بدستورش گیتی ساخت دستور هرساش
ز بر نسبت بالا شاه کس بود چو حق معنی | بنوطلم است دستوری بدستوری اخوانش
ز دیدار همین دلدار بر تر لذتی باید | کمار تفسیر رخ تو اند بردن دادن سخن آن
زدیگر سو فراز این لذت ز خنده دیگر | بجنم معنوی از زردی تن در بکان بحاکم
همکس بود ادراک آن لذت در این نعمت | ز قیل و قال دانا را مگر بر راه وحدت ش
فراز معرفت بنود فری آهنگ آن زر کن | کهربا شناسائی و ذات عارفان ل
خصال نیک بخت جنت مگر بیدم بود | کز خلق خوب میرسد لباس حرز علمش
زباغ و نهر و کاخ و جسم و لباس آخر میگوید | صفات جنت اعلی بود اخلاق نیکش
بهار گلشن را زاست از تابید بجانی | روانی را کز خلق خود گلستان شد

سود علم الیقین عین الیقین در پیدار شو | اگر سازی یا جنت بشنو خند و خوبا
بهنگام بجز عالم افلاک بیابی | گر آیی لامکان فرسوی هر شخص برگ
تو اند جان بخشم خویش دیدن دو بارها | فروغ و اجنبی بهر هوش کرد امکانها
جو بند جنت خرم جمال ذات یزدانی | در اندم از خود و امکان کنند هوش خرم
عنبر آنچه بود کردون بر از مار در نحی | بهان کرد و همه چون آن علم خورشید
بجنت هستی مطلق جز ظل امکانی | که او را جز آب آسان پند علی چو حاش
مقام خواب این کیهی است ما کس انجام خود | در رو جهانا نجو ابد که در کو جنبد بارانش
ز پیداری رسیداری بیداری که عذار | جهاندار است و بر دارند دار ایان دورا
نرسد زنده دل اهلا ز مرگ عنصری بگیر | که منم را قبا چون پاره بشر مینی ز آسمانش
که خوش جامه بپوشند ترا چون جسم عنصر | شانی جسم در بابی رها زین بند زندانش
ز راتن زاهد کی ز ندان سود آگاه | ز لذتی گونا گون در رخسار رنگ جانش
برای جامه فرسوده بکو هست کس باشد | بر بجوری خدا از قوم و حوس و خانه دام
بیبی زنده در گور و یک آگاه در زندان | جوز نهار است جان دیدن و دیگر بدن
روان خرم بهوت گشت غالب که خرم | دو مانند بنده خشم و کام در رسد
روانی کو به بند باد عنصر فرو مانند | چو طفلی مرده زحمدان بود با دیده
کسیدن مست بکو در جهان است زدن | برای تخم و در عنصر بد چار ارکانش

دگر گردد روان محکوم آنالاجرم   شود محروم جنت کام زیر بار عصیانش
چو ایشان راست بر رانند معراج سوی سدره   وزان سلم نشیبان پایه باشد چرخ کیوانش
چو خود را یافت کس از ارکان پیما [illegible]   کرانسان است لایق پس فکر خواهش [illegible]
ندای کاعبادالله زند کی چون [illegible]   روان خرم است و ظلمت جسم و جان [illegible]
طبیعت مینمایی عنصر را روح است [illegible]   گر از خوی میسر باشد رنج خواهد رفت [illegible]
طبیعت اسب و روح تو سوار تو سوار او   گر بدی هست از تو کس که هوش آید [illegible]
سوار روح سوی عنصری کشور روان آمد   بکام خویش کی تازد کس حکمت [illegible]
بدالنفس کز حزن عینیت روح آدمی آخر   چو بی تن گشت بر در ماندن [illegible]
بجز علم و عمل عقل نخستین کو بود داند   چو پند از عقب بشمارد اد اهلا [illegible]
روان چون رستی از تن [illegible]   بجز علم و عمل نگذارد از در بند در [illegible]
به اسب کاهن پیدا نه [illegible]   جسان بیهوده خواهد شد [illegible]
مزاج عنصری اند مست منزل [illegible]   گر از هفت اختران و ز نه چرخ [illegible]
میان عنصرستان رنج غمگین فرو ماند   بپوشد خوی بد لابد لباس [illegible]
ز حیات عقار بس [illegible]   حجابی رنج سازد ز جوش و سوز [illegible]
جو دور از قرب جانا ماند و اندوه [illegible]   بنار حسرت و اندوه سوزد جاودان [illegible]
روان را کشتی دیگر نسوزد دل سازد   تنور سینه حسرت بنار [illegible] بر باشش

زهای تو بت [illegible] خود ای دان   فرو خسی جان آن [illegible]
دلی ارواح را افلاک گشت و عالم علوی   بردن آید بازار کان [illegible]
روان کز جنت سود شاد بر گردید تا خار   بجای خویش [illegible] بکام [illegible]
اگر ماند جنت سود آمد [illegible]   بشد بیگانه [illegible] آشنا باشش
بدنیا عیب بینی را [illegible] کردن نمی شاید   کزین پس آشکارا [illegible]
خرد داری که تا [illegible] باپرورش   که [illegible] پیدا و پنهانش
و کرامرد [illegible] عیب جان [illegible]   چو فردا بابی از بهر [illegible]
چو آمد [illegible] معاف [illegible] اکنون   مسازار [illegible]
[illegible] آسایش [illegible]   کرد دام [illegible]
[illegible] سلامت [illegible]   برادر خود [illegible] آذر [illegible] غم [illegible]
[illegible] رود [illegible]   غمت خورد [illegible] در خوردی [illegible]
بیاد [illegible] بادام [illegible]   برای [illegible] باشش
و ای دل [illegible] بوستان [illegible]   [illegible] خرد باید [illegible]
سخن را اهل [illegible] کلام [illegible]   [illegible] جز [illegible] رسول آمد [illegible]
بلبل حرف [illegible] داستان [illegible]   [illegible] باز بان [illegible]
[illegible] سیاهی [illegible]   بدان ماند [illegible] باشش

[illegible]

روان را قوت علم چو خود حسب با ووش — چو جان در رنج در ماند چو سود ارد رو دوا

نه مرد است انکه بهر پور زن تخت ... — نه را دست انکه بهر مرگ خود با ...

به پیداری تو ابی کز خار تخت بر دز ابد — برو در خواب یکتایی که در ریابی ز دو ...

ز عشق یار اغ کی ابنا زکر دو جو خود ظلم — چو ذرح بیش و کم چو بندارت همین ...

مرا بایار خود کار است بی ما بحث اعلی — بز دو هر زاهد آنکه از در اغی در ...

تو بخود چند ابو بند و خود داری ... — بجنت گر رحمت اسانند بجنت ... ناش

تو اب بخش و کم باد از نصیب ... — نخند مرغ رحمت بال ... شاهین ...

بلبل بیکار اندر زری گر ... خواندم ... — کر خدا ... ز احمد بیان جمله رضاش

فروغ شمع خورشید است نور ذری ... — ز نخی ... خفاش است نابینا ...

نه دو علم الیقین عین الیقین ... — کر ... موحد راز ... است ... کاش

زهی جاهی که کرد آمد ز جهد ... — نبار دگر کنون سنجد ... ناش

چه دور است اینکه اکنون ... نمی آید — بغیر از ذات پاک ... ناش

تر اید کفر و دین اکنون که کفر و دین ... — بجز گیسوی عنبر سر و رخسار در ... ناش

نکو ... نیت نیکو چون ... — سواد زلف او کفر است دین روی ...

محال از ... علاج ... عیسی ... داش — یکی طالب ... باشد از هر راه ... ناش

غلام کرده است ... — نیم کلک است و جای او نیم ... ناش

موالی جمعیت این کثرت نبود ... وحدت — جهان خواهیست می بیند ... بیداران ...

برو بشناس خود را تا خدای خویش بشناسی — بقول حیدر صفدر دلایل ... خواش

امیر المؤمنین حیدر امام معرفت کشور — که صف جبل الله ... از ... باش

زبان شرح حیدر را ... — زبان ظاهر و باطن دم ... باش

حقیقت را نشاید مشتری بودن ... — چو خور بر خور ... ایوان ... باش

بخندیدم

بخندیدم بر ریش زاهد و شنید گر ... باش — فراوان گر به کردم بر ریشش و ... باش

مسلمان ... جستم ندیدم گرد ... — بجستم کافری آنهم نبود ... باش

سکندر زنگ را بگرفت ... — با آهی زنگ ... دمادم ... باش

بیمار نفس است طبیب علاج باش — دریای ذوق سایل ... باش

محتاج کا مجوی برو در غنی بزی — ... حاجت تو ... باش

ریح بوم ماز ... حق ... شعاع — ... باشد کی ... طلوع

ذات او بی بهره می باید ... — کور را الوان و کر را الحان ... اطلاع

داده هر چار بانوی عناصر را طلاق — کرده ام این سر سر فرزند پدر را عاق
بسکه آبروی مردم ریخت بر روی زمین — چیست جز قار دره بیماری زمین
نیست جز علم و عمل معراج نفس کاملان — جبرئیل است عقل و جان محمد من برما
صبر می باید ز خاک آموزی و صلح از فلک — کو بنیم کردم است و ماهی در شیر عاق

انتخاب شیخ ابوالفضل که زینت آسمانی — مانند چون ندارد از پای تا بتارک
دست عرب چه بوی ناموس اکبر گرفت — در هند کعبه باشد چون خانه مبارک

چین زلف کابلی چون دختر از دل برده است — شهر ستان کل بغرق ماه در میان کلک

داغها دارد ز دستم این پری خیزه رنگ — خانه ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

داغها دارد ز دست ناخلف فرزند ننگ — زانکه باشد والد علوی سپهر خون رنگ

روح ملاح است و حبل و نفوس عارفان — تن سفینه عالم عنصر بود دریای فرنگ
موبد آتا پا شد این باد مراد دم وزان — می توان رفتن ازین کشتی به ساحل بی درنگ

بادو آن [illegible] هست خیر صحرای گلنگ — کوه او در آسمان بر هم بالای سنگ
ماه نیارد از آسیب و الا قلعه اش — ناقصان گویند دیده است از کلفی رنگ
از [illegible] ریلش نار چیلی چرخ دیر — جاز تاری طره اش با طایران کلنگ
آینه آینه سالش سال و ماه روز و شب — سیرمان و خیرمان و نیلم و فیروزه رنگ
کونله و نارنگی و نارنج و کرنای و ترنج — لیمو و موز و انناس است و جامن در درنگ
چنبه و چنبیلی و بیل مار و سنگار ها — مالتی و کیتکی و تی و یار جا که هر رنگ
لاله گوش شکوهی دارد دو زیر ... — سنگ چینی لعل [illegible]
برگ طوبی بان کریمان است مار سنگار — لالرد ر و صفش زبان ...
جم ز روزی دادن مخلوق ایزد شجل — دایما بس جلوه بر اشلوک کهری
قطره از آب او قنطار مس سازد طلا — جند اکسیر تازی مرحبا بندی کلنگ
هشت گنج خسروی بیند پر پرش خ لزی — هر که او ده روز رشد لشکر مرد کلنگ
از گرفتن چون هم نو بودی این در بال — بردی از خاکستر ش ز امینه خورشید
از ملیحان شور به حسیم در شیرین لبان — وسعت آباد جهان از تنگ شکر ...
که رفته ابرویان و از ابروی خوبان — جان کسیر باران که بگذشت از کیان
صاف چون آیینه جسم دیا کچین ... — از بحر د مرد ماهش در خندد پر ماه رنگ
گوهر آرزانست جوهر خیزد و مروارید باش — آب جو اکسیر ردم از صفا باغش درنگ

کوه از قفای نقش بنایی لوح چین | آب چون آیینه زدم از صفا بی‌عکس و زنگ
راست میگویم نخواهد رفتن از باغ دلم | میل سروستان بالا پور خوبان کلنگ
چرخ اطلس هم ستاره‌ش بگردد دار [illegible] | در چراده همچون اوج سپهر [illegible] رنگ
یاد حیال خرم زاد کابلی عارف [illegible] | بست یکباکل بفرق [illegible] ماه رویان [illegible]
چون زلف کابلی [illegible] | نهر یکباکل بفرق ماه رویان کلنگ
کنج بلی از دو بناشد [illegible] بامار کل | مار [illegible] رباید زهره از شیر پلنگ
[illegible] بلا بلا بود دی جگر | بچه بچه گوشه اکنون زد سپید [illegible] جنگ
[illegible] سر دار اطلی کردون [illegible] | کاب رود شد پور است آب تیغ تیز رنگ
مهر داب [illegible] از تن الیاس جان | قطره زو تهمتن را سازد خدنگ
نادادنا [illegible] گذارد آب او تیغ در د | پانس [illegible] ساید [illegible] خاره [illegible] سنگ
گشتی دیوان راجا دان [illegible] | نار خم و باد هر کب [illegible] تیغ و خاک [illegible] هنگ
لشکرش [illegible] چون [illegible] | خوک [illegible] حس موی [illegible] تیر [illegible] خدنگ
سیاهکان چون دیو مردم کوه [illegible] | گشت بر قوی قزح کوی [illegible] سپهر [illegible] رنگ
چون سکر [illegible] بار [illegible] از بالای کوه | از در چرخ است کوی [illegible] ایوان [illegible]
اینچنان [illegible] سر قیاح [illegible] | طبل [illegible] هست [illegible] داده [illegible]
دل [illegible] دار [illegible] | مومن [illegible] از [illegible] کلنگ

ذاتی [illegible]

ذال

ذاتی است که بنده آنکش جان و جمل | از کثرت نیست وحدت و الجلیل
در وحدت حق جمال کثرت نبود | یعنی که دو در زمانه نبندد احول

کریم بهره دنیا و دین نمود دلیل | بخیل هست بغیر دو سیر در راه ذلیل
بانجز بر معلوم گشت ای موبد | بخیل بود کریم کریم بود بخیل

اصل واحد بر صرفیت خدای متعال | فرع او جمله اسماء و حروف افعال

موبد اخواندن حرفت ترسد زنانگی | اختلاف کتب اربعه از یک اعلال

قفس شکاف هیکل کل | طایر باد از آنکه منزل
بودن بار در قفس عجبست | نیست پرواز باد زو مشکل

شد است کشور زمند و چاه کابل | سری نکرده شد موبد راست یکباکل
به پیش [illegible] از آهنگ [illegible] | هزار بار ده [illegible] بندکی بلبل

زیار چابکت و نگاره روا از بار / کیز بنده هجر آتش چنین دستش
ترا بر پنجه پنجا همه کس می بندد / بشت خم کمند همتش زایل

ناز مان از هم جا شد تزد دانا محال / چرخ را آرام از تشدید یزدان لایزال
باوجود دانی حیثش زرد ماند زدور / گر بکام من دمی باید رود در ماه و سال

مرده دل را بعلم زنده کنم / اگر آزرا رشیخ و زنده کنم
با خدا بنده آشنا سازم / همگی را خدای بنده کنم

دست بر سینه بحشم بی تو نقد نیم / بود بر سینه مرا داغ غمت داغیم
از لعینی بمی تاب نشستم مو به / ساغر حکمت ز فراق زخم پوشیدم

یکسر و من وکان سر رسیدم / بقول اهر یکی محنت کشیدم
همه در تیه دنیا در رسم ورند / نبود از اد کی من آفریدم
ندارم یار و همتا شاد لوس / جهان دیدم چو خود یکس ندیدم
نحن غالی الطبایع بست مو به / زمن گفتم ناقل می شنیدم

درلطا......

ایضا

درجان و تش آشنا می دانستم / خود دوست بنود جان و تن دانستم
گفتم منم این من که منم میگویم / بالله تو گفتی من و من دانستم

دیدی مارا بچشم نی ما بینیم / ایم کر خود بچشم کس می نامیم
چون روح مجرد تن جامه مات / زینت کر پوشیده عناصر مانیم

گو دلی زیان وجود دکر بود / دارد ز تنگ کشتی تا جسر بسنگ چنم
از بوالهوس بجوی وفا زانکه کس ندیدست / تیری ز چار پایه بیام پلنگ چنم

تا اشارات ازدو ابروی بتان آموختم / حکمت العین و شفا از چشم لب اندوختم
گوشه گیر بها ای عنقا بود بس خزلوما / سوختت تا پروانه از عشق بدل افروختم
چون شب قدر و برات از زلف یار [illegible] / تا چراغ از آذر و عش باد ایم افروختم
مو بدا با سوزن مژگان و زتار نگاه / از جهان برید بر چشم بتان دوختم

تا ندارد هجتی با غیر مصدر امداد / تا نگوید از حق بکس شود الکن کلیم

نزد تورانیان ز ایرانم | نزد ایرانیان سنه زیت نم
سنیان شیوه ام گمان دارند | شیعیان محض نام پلمانم
در تعجب ز نسبتی چو میگویند | کافران ملحد بیا خوانم
محلدام ز خویش نشمارند | مثل نصرانی و یهودانم
من ازین جمله گریش سپردم | عارف مطلق خدادانم
مرد منزل شناس ره نرود | کامیاب از دهال جانانم
اعرف عارفان ذات حقم | موبد موبدان یزدانم

درد بکشان محبت استاد کشورم | از خط انگشت بر رخسار پیدا خوم
خسرو پرده معنی گشت چیز زود روان | شاهد علم و عمل شیرین و شکر درم
باربدا صوات لطف تار رگ قانون من | رود رشت شد بر و کلکون اسب مازن درم
بدح احمد کعبه دل بو جهل طبع عزی | از سخن بی شبهه و شک ذو الفقار حیدرم
شهر ستی بخت کی اهود دولت سو سلم | جسم جمشید و نفس منشار رکتی بوام
کعب بکشام رگ جان ترا قصاد دو | دین دو قن کوی ددوال ابن مرکانکم

یاد ابا می کر بدحسرا چو محمودم غزنم | زلف لیلی از شب تار تجر حاصلم

بند بندم مسکند چون یار عقل ابا جم بود | مسکند سیکا کل خوبان سیکا کلم
تیره چشم گرد از افسون خود دیو سفید | رستم کاوس جو یارب کرا فراز علم

غمزه خان از رستم سپاه جو تیغ | پیژن هومان فکن ابهاک گیر کستهم
جسم از شمشیر او پولاد شد اندر نبرد | تیغ او خسار ستم سندش کوه پیکر نیم
براد ابهرام چوبین کوه کمرین | تیر اس پولاد دوند و پیش تر بگزدیم
از نشان آن فریدون وش بمد از افعی | یافت چون ضحاک دو خش از اژدها پیکرم
کر ببر سازد زر کردن بهر سر چتر ابا پاک | میکند بهرام تیغ او عطارد را قلم
باز او سیمرغ کیمر د بار ریش ضحاک خالی | با خسرو او دم مکر و کرکس شمشیر دم
ز جوانمردیش دایم از آتش تیر خدنگ | دیده صد تدبیر تر آن از کمان پیچ خم
اسپ از احباب سرکش و زاب تیغ او گرم | بار او عند یار روز او بخت زدام
چرم پشت گر سارش سبزه در روی کبر | جانن زلف شاهد همت رخس مشک تر علم
کنج از هون ساخت خالی سام بزم در رزم | چون عمد کعبه را از لوث اجسام صنم
زر در وا ز همت او دل زر چون اخی | پشت در چشم بخل اش خصم چون کژدم
شیر مرد آسمان دستار خوان ار رزم | داده گنج گاو افغان را رهائی بهر خم
کاسه او کاسه رود و خوان خالی هفت خوان | آتش زر دست از می کرده اندر چلیم

از عطای او نشان از حاجت ... | چون بهمدار ... نوبت کسری جام
باو زداو لادلوی سو ... موبدا | خم از سر ... چون کور زرم

این چه انگشت ... بلوی | موبد از انگشت ... اسلام
تا ز دل بیگانه صوری سخن رانی شدیم | آشنای بحر شوره راز وحدانی شدیم
گفت افتادم در چاه زنخدان کلی | گفت سر امامت دانی شدیم
در سواد زلف جمعیت سکن ساکن دست | لاجرم مجموعه تشویش پریشانی شدیم
کر سلیمانست نقش خاتم انگشت جم | ما ز دست ... زنار سلیمانی شدیم
اشک کوهر ... | بسکه ... اشک از دیده ... شدیم
هر زمان ان ماه ... | بسکه خاک از گریه گل کردیم گیلانی شدیم
موبد الله ... | ما ذکر ... او فضل ...

بران ره ند فقیهان واقف اسلام | کرداده است بجنت خدا نوید مدام
فلدات بهشت ... | مدام نیست حرام و حلال گشته مدام
بخط جام ... | بجنتی است حلال و بدوزخی است حرام
هزار حراجی ... گفت | ز ... بگفتم ... جام

اکر ...

اگرچه ... عراق | دلی ... مقام
جز انکه ... مدام در مجلس | بمیر باده ... نام
میان ... جبرئیل کی گنجد | کرامی ... نامه ...
جنسی است ز ... تنبور | ... حسینی زاده است باده ... الهام
نیاز منیست که اکنون سخن ... آمد | مرا سخن ز زبان حقیقت چون ...
سخن ... | برادر ... جبرئیل ... نام
سخن ... | بدین حدیث ... کلام

شادی ... | جو پای ... در بخور ماتم
مهر ... خاک که ... | اول ... اسلم
جا ... جهل | ... آگاه عالم
دین مسیح ... آیین عیسوی | ...
بس جام ... | ...

این بدیهی است ... | خط لعل ...
... | رگ جام ...

درمیان

درمیان حبیب دس حاجت | بدکنون رو بردی با یارم

ایضا

درکسوت بو البشر ایجادم گشتم | انگشتری وجود حالم گشتم
زین پیش مرا اگر چه آدم خوانند | کردند غلط کنون من آدم گشتم

ره دو راست دیر و کعبه منزل | دو منزل را یکی کردیم و رفتیم

آشفته و آزرده و درمانده و رندم | آتشکده دل دیده بود دجله سندم
فرسوده ز افلاس چنانم که تو گویی | شهزاده ابراهیم و خانزاده سندم

قربان ابروان سیاهت دو چراغ چشم | شد روغن کمان تو نور چراغ چشم

از غنچه دهن لب جانانه شنیدیم | در چشم نرگس سوی خمخانه دویدیم
مژگان تو مست تو خونخوار جفا جو | با مردم هشیار در این خانه نوبدیم

موبد شنیده ام چه فرمود حکیم | هر چند بد است تا نزدیک کریم

نا روی لئیم را نباید دیدن | نیکست بخیل وار کرداری سیم

در کشتی شریعت و استه ناخدائیم | در خلوت حقیقت بی کیسه پادشاهیم
زاهد ز ما خدا خوان عارف ز ما چه دانی | از آشنای پوشیم این ما خدائیم

با هر کس خم مقام را فهمیدیم | هم مشهد شیخ و جام را فهمیدیم
حق کرد حرام باده میکده در جنت | بیت الله الحرام را فهمیدیم

گرچه از کابل بسی دوریم لیک از برچگال | درمیان هند سیر آب ملالیم

آن روز که بودی به نور یک جم | ناحق کردی شدی لشتری غم
آهو بکمر گشت و شد نکس طره تو | دین پس چه شوی که زنگ کوبی این غم

جز حق که بود طبیب راز دردم | جز دوست که پس دارد دم دردم
دانی که حکیم است عبث بی مکند | پیدا کردم لیکن پیدا کردم

از چار عنصر آمدن ایزدی کتابم   در ز روح آسمانی شد بو الفرح خطابم
گردم از هوا کر خرم با آب جوهر   هم بو لهب ز آتش از خاک بوترابم
در چار باغ عنصر هر چند شد شکفته   در غنچه فلک را از بید روان کلابم
زد حساب خواهد زاهد بخلق گوید   از پاس دم بهر دم باهر نفس حسابم
همت رسا و نارس بخت تبه جویم   اوج عقاب گردد از بال پشه بابم
سیراب تشنه‌ای چون جام شوربه لنگر   بر تشنه جیعه سید نوعان نما سرابم
جو بای باغ جنت بی ابر بو لهب لالای   با باد آتشین دم در خاک اندرایم
مو بد جز این نخواهد کز فیض جوش هست   آباد کن بخویشم در خویش کن خرابم

بهر جنگ عالم باشد قلو در دو کوه نام   دیده عمی نگر زاین قلعه داری انام

من سالک ره ستاره کهسارم   آزرده بشهر چرخ چپ زاین بادم
از بس کرد ند گریم مردم شهر   از کرم او شهر و شهر بالا تب دارم

بهر مهی که خوری باده هست شهر حرام   مباش کرسنه سال قحط ماه صیام

کمان زرکش آن ابروی شبفام   بود چاچی غلام شیک نی نام
بچشم او بیش بادام نرگس   گنبزان نرگس اکم و نام بادام
بسی راه است از بهرام تا تیر   مژه از چشم او بین تیر بهرام

شاها زمی الست مستم   بادا منت آشناست دستم
آندم که کسی نبود بودم   ایندم که کسی نماند هستم

کمان سال تو زچرخ خسرا   ز زور شش چله شد تا ره کردم
مران پیکان آه از اشک آبی   به تیر بخ پر چشم سپر دم
ز خاکی جسم کردم خاک زیری   هدف از نفس شوم خویش بردم
بدست هفته و رخت بساعت   کشیده است این کمان بازوی گردم
کند نفس شوم جبل جوکش   جو مو بد گشته فیروز بزدم

چون نهال پای در گل بسته‌ام — صورت ابرم و در بند نه در بالا ام
هر دو چشمم را ز گل بو میکشم — چتر آبی جوی از دریای حیات آبیام
زاهد و سامان خدیوان [illegible] — خود نمیبینم به یکدم [illegible]
و شمی [illegible] بالقصد دستی — آخرت را با جنسم [illegible]

کی ز نیل به خلیج آسمان خواهد گذشت — ناخدای کشتی فرعونیان موسی کلیم

فکر ساقی [illegible] در جان [illegible] — بابل [illegible] خواهش را چو موبد [illegible]
بنده در [illegible] — خانزاده [illegible]

بپای راه عشقیم در دو ره گشت [illegible] — در منزل کعبه [illegible] بدبریم

چاره [illegible] میکردم [illegible] — گر سر تاجی زباری [illegible]
بند بر بازو و گردن داشتم دایم اگر — باره [illegible] طلای [illegible]

زنیو گشته موبان قد و بالای چو نیم — زنار زلف تا پا نار بالای تو چو نیم
کلاه همت از ترک دو عالم [illegible] — چراغ سوده پای [illegible]
بجا لالای [illegible] و اطلس [illegible] — ز گردون اطلس و ز طور [illegible]
صفای آیینه هر گز [illegible] مردم [illegible] — چو جنگ [illegible] چشم دیده ز [illegible]
سلیمان هوا را گر [illegible] — که ز شهوت [illegible] حاکم [illegible]
به پنجه راس اسپان [illegible] — که صد ز نجیر پیل [illegible]
به پیری [illegible] ز کشتی [illegible] — فراغت [illegible] جوان [illegible]
بشهر خوبرویان ره سپار عشق [illegible] — دهن با [illegible]

زنه گری سپهری [illegible] آزادیم — شتابخانه هستی [illegible] داریم
زر [illegible] بکرم [illegible] — رها کرفته ز نه جا [illegible] ازادیم
علو همت ما [illegible] — درین [illegible] رفعت [illegible]

به پردیس عنصری جهانیم — افتاده بدوست [illegible]
هر بود غریب ممکنات اند — این راه غریب زاد کانیم

شد ... [illegible] کلام ‌ ‌ ‌ رفیق باده مینا کار جام
گرا شعر من ... [illegible] ‌ ‌ ‌ بود هر ... [illegible] الطرام

در بستان سالم تا چلد ... [illegible] ‌ ‌ ‌ بنجامه پنجه بارست در دست ... [illegible]
کاوس روز خواهند ... [illegible] ‌ ‌ ‌ باریش زال ... [illegible]
از باده چشم گیرم ازمی ... [illegible] ‌ ‌ ‌ بهرام گور گوید این بدکه می پرستم
نور روز نوجوانی ... [illegible] ‌ ‌ ‌ شبهای تیره در ... [illegible]

نماید قشقه آن ابر دچار ام ‌ ‌ ‌ هلالش بر رخ خورشید نام

انجمن ... [illegible] امید دیم ‌ ‌ ‌ سزد ... [illegible] فطرت ... [illegible]
موبد ... [illegible] ‌ ‌ ‌ هست ... [illegible]

پیوسته طریق فسق عصیان پویم ‌ ‌ ‌ کافر نفس و بدعمل و بدگویم

این جمله گناه ممکنات است حقیر ‌ ‌ ‌ در خورد خطای خود خطا میجویم

از بالش تب مباد ... [illegible] ‌ ‌ ‌ از لوح وجود حرف و شادی و الم
... [illegible] ‌ ‌ ‌ الماس ... [illegible] قلم

چندان ... [illegible] ‌ ‌ ‌ مطلب ... [illegible]
... [illegible] ‌ ‌ ‌ آنمایه ... [illegible]
... [illegible] ‌ ‌ ‌ ... [illegible]

هر لاکه علی ... [illegible] ‌ ‌ ‌ گوینده خدای این جهان ... [illegible]
ترا در جهان ما خدا دیده ایم ‌ ‌ ‌ هنوز ... [illegible] دیده ایم

[illegible]

توی یا علی نام تش خدا   ترا از خدا کی جدا دیده‌ایم
بچندین مردر انشاید موبد   هنوز اند کست اسپی

هرگاه علی را نشناسند انام   گویند خدای این جهان تمام
بچندین مردانشاید موبد   با انکه چو دانند بر اشتر نشناسند انام

توئی یا علی نام تش خدا   ترا از خدا کی جدا دیده‌ایم
ترا در جهان ما خدا دیده‌ایم   هنوز اند کست انچه ما دیده‌ایم

از خدمت شاهان دو جهان جز گزیده‌ایم   بر نعمت افلاس بسی شکر گذاریم
خرسند بدینیم که از عشرت دولت   از پاس ادب پاس غضب یا کنداریم

ذره قیسی انجم از در تو منعم بود   کوزه آبی که ما را ز دبد یار نخیم

دوده ساسان آذر را بدانش محترم   موبد انزا افسرود ستور از اردوم
با وجود دانش جاماسب پیر مرد کهن   از رحیمی مکرمم هم از عطای کهترم

شد در سیادت تو همه را الحیات نص   شاه بست موی تو بر روی انخین
انکار چون کنند که معجز نموده   کردی درست بهر سیادت خط انچنین

خرم سرای جاوید باشند وزیر خانرا   گویند کلید رای شاه جهان احسان
روزی که ترک شتن کرد هر تن کرد و دیگر   بر چار سوی عنصر چون چشم اسمان
خورشید رو خراشید از ناخن مرنج   پوشید چرخ نیلی در اتق سیاه سان
بی افتاب آذر در سیاه انکوست   باهور کشت لاهور تا رفت رو بجهان
جان یار که بردن رو ذرین عنبری بر آرم   بموت سرای کردن مکرمه بهر جولان
دیدیم بچشم باطل خاطر گهر خان   اجسام در نور دید با اهل کشور خزان
شبا نور حق کی شد نور روان دانش   از بسکه تیره عیب دید انبیا جای ارکان

تاریخ فوت او جست موبد عقل اول | کفا گر کشش عیش رست جنت ز ربانی
یارب چنان سعیدی از فاضلان عالی | سازی شفیع موبد ور جبرائی عصیانی

سنگ شد خط کلکم ز دهن کلک بنان | از آن گران شده ترخ سنگینی بهان

ترا نغمست رود رباب بیژن | منیژه کهوت د جاه تو شد رستن
غضب افراسیاب و عقل پیران | بود حلم و عمل رخش و تهمتن

بر گرایب اعطای روشناس جو گهر | ابروی نوح باشد چشم دریا جوی من
سیل اشک از خانه چشمم چو آید بیرون | آسمانها گشته هر یک حباب از کوی من
بالش جهانی خطاه و ور چشم [illegible] عجب | روی خود را پسند از آینه رو سوی من
بس که بر زانو نهادم سر [illegible] | نیست کم زاینه آتش آینه زانوی من
سالکان در پس دست همت [illegible] | از بهرم صورت جان شد در زمین [illegible] من
مشتری گر خوبی [illegible] | آفتاب حسنی ای هلال ابروی من

از ذقن سیب ز لبان نار در بست | میدهد بادام باران بر کس جای من
آتش گشته پر آتش عدم زمرّ ریحان | میرود چون موج آب رخان بهار
سرو بالا لاله رودی یاسمن بر دلبرا | داده خلوت داده موبد دین [illegible]

موبدا را خواهی رزم خان رستم زال زمان | یا بکابل یا نشاپور و ملتان سیستان
زابروی خود بگردانی هزاران آسیا | گر توانی بر کنی از غمزه بی نان رستن
بانو میگویم تنی ناید رسیر موفت | لنگری کش رکابی وار برخوان [illegible]
مرگ ارزان بهتر که بگیرد [illegible] | نان انسان بشنس در لب جوان

سار و برگ مجلس رنگین خوبان | بره بردار دو صحن سمل جوانان
زر درار هجر جس [illegible] کلکون | برخه کلگونه محبوبان دوستان
این حور رنگی است خالی [illegible] | خیر بامان است حرف خیرمان [illegible]
[illegible] | [illegible]
حرف رنگین [illegible] | چشم دیدار [illegible]
[illegible] | دوستان [illegible]

حرف زکمر کرلب آب بمسیح پا نولی　　لال شد اختر مرا مو ببو صف بیان ماذ

از رخ نارنج بون خوش در کسب دفن　　بر دو تختا لو بره یکبار ای نرین دهن
بادبان بسته و عناب لب بادام حبیم　　پای سید آزاده رای سازد اسپر و حمن
از تنم خون مو بدرخت حرام برد　　با وجود الکمر از لب اندیش لوی لیمن

ای نام تو سر دفتر اطفال دبستان　　یاد تو بالغ خردان شمع شبستان
بی نام تو گشته زبان کام عجم را　　هر چند بلند شد کلام عربستان
با یاد تو دل در بدن عارف و سالک　　شاهنشه آرام سپر بر طربستان
هر راه که رفتم بسر کوی تو پیوست　　مطلوب وجود بود یسی طلبستان
دریا شده دریافت که دریا سخن است　　موبحی ادیب تو و گیتی دلبستان

جراحت زانده سماس تیغ زرین زین　　زنجیر روی دل آهن بیتی روان غمگین
زمشعوان سپهری رسید لشکر دم　　نوبر جام ندارم بادر زر و سیمین
به اسپ چون مره حوس کوار آتش　　شنا خوکت حوکبران اکر خوی سهدین
حدیث راستی قد و نازکی بکر　　بحنا سرد توکشتیم و خامه مو یقین

زلف برات از رخ بای ال ابای من
نال زن یک سیلی جانی از دو چشم خنجر را
رود بار از کریمی شعر رود ابنا
خون در شمع بکین همچون خیابان من
بید دل آلو رصد خورشید دارد دم
بخت بیکر چو چرخ کز ظلم رواست
چشم دارد بچشم را شکوفه
شکوفه جعفر او خوان خون بلبم عمر
تیره بختی بین که او شمع جان خشم کنند
چرخ نیکو سوخت اما جان خراب
گر بر سر او سپهر خشتر و یاد دارد خطر
از کمان چرخ سهم تیر آهم در گذشت
چون بنالم زیر ظلم چرخ خشک غلط چو دم
نوحه نوحم چشم تا شد تو هم جان داده ام
گرچه در لاهور خون آلوده شد
قدر می گردون نماند و زنده روا

موی کر بهر مو شام از جسم ماهای من
مو بر در موی شمامای جلوه آوای من
چشمه سو سو سوار چشم طوفان زای من
رخش از دولت چشم خون بود مانای من
تیره روزی ساغر چشمه تمنای من
مبتلا گر خورم سنگین هوای من
روح یاد انم از فزون میکند سودای من
در سواد جسم بیگر سود هند سودای من
شمع دارد از چند دام تو حسرت آبای من
گشت گنجینه سوخته گنج دل کنجای من
از کمان قد و تیر آه و بلا بای من
سهم در دل تیر از شبنم تهای من
با زبان لال را خون دل بابای من
ای خنجر دل از تو چشم طوفان زای من
دیگ فلک ما نه از اندراکه اراکبای من
فرش خار شک خار اطلس خارای من

[illegible] دو [illegible] / و [illegible]
تخت دارد [illegible] / [illegible]
بو قسم [illegible] چون [illegible] / [illegible]
با [illegible] خاقانی [illegible] / از فلک [illegible] آتش [illegible] می
گنج دارم کرده زیر خاک غم گردون نهان / بسکه دارد گنج در آتش درون [illegible] می
[illegible] نشئه غم چون [illegible] / صاف [illegible] بر دل انهای می
صد [illegible] / کشتی شادی [illegible] شکست [illegible] می
بسکه [illegible] / گرمی رفتار [illegible] شعله پیدای می
خانه چشم [illegible] / جان و انسان [illegible] می
تا [illegible] / [illegible] همچون [illegible] می
جامه [illegible] سوزن خار آسا [illegible] / شعله خار [illegible] می
کو [illegible] / [illegible] می
مدعای [illegible] / قدسیان [illegible]
گر [illegible] / [illegible] نرگس [illegible] می
آبرو [illegible] / از [illegible] عصیان [illegible] می
نقلهای خسرو شیرین [illegible] / ز [illegible] سیمای می
نقره اسود [illegible] / [illegible] می

[illegible] / [illegible]
خوابگاه [illegible] چشم [illegible] بود / خانه [illegible] اکنون [illegible] می
بس [illegible] کرد [illegible] / [illegible] کس [illegible] پرواز [illegible] می
ساقی [illegible] چشم [illegible] / [illegible] نامه [illegible] می
بسکه [illegible] / چون [illegible] نامه [illegible] می
[illegible] / ناله گر [illegible] می
باز [illegible] / گرد [illegible] زمین [illegible] می
جام [illegible] / توام [illegible] می
بر [illegible] کند چرخ [illegible] / راند در [illegible] سوی [illegible] جهان [illegible] می
خامه [illegible] / صد [illegible] می
با [illegible] خون [illegible] / چشم چون بادام [illegible] می
[illegible] / [illegible] می
[illegible] کردم [illegible] / [illegible] نهانی می
[illegible] / [illegible] می
[illegible] / [illegible] می
آتش [illegible] / [illegible] کرده [illegible] می
[illegible] / [illegible] می

روح اگر بسیار دیدم در جسم بسته‌ام — زین بجست صحن شادابی چی
باز در روز شادی جای علم از دو بهر تو — عمرها در علم رفته بسته خوبی جانانی می
بحر فرزانه تقریب بجان عنصر در نهایت — در سر فرزند در دو جو هر کو هر تا در تر
بود با دو دانا تن چین عدم در شعلهٔ — یافت دانش نیستی آتش ز آب بدلها ترمی
بیت معمور بیت المقدس شد شوخ نو تماشا — روح دم روح الله باکش برابری
ای خود پا ره بسیار عدس حباب نیست — هشت جنت را دکان خوش خوش عطار می
ربع من از دن دو موی محل خشم در بحر — پای هر کو ساله‌ای کیسه دو ده بیغاری
روزه انبرده در قران خاک اجابت — کرم خو پنهانی دایم موسم گرمای می
جبر در خود کلیات عقل شکر ز خانه — ده خود درشت جنت گوهر خراجی می
پای هر دو شخص موسی بجز عیان شد خاک — دستوری مسیحا روح روح افزای می
گر ز مژگان خورد سوزن خشم — گل بخشم بهار دنیا کو بین گل بخار می
نافه آهوی آن چشم کبریا آهو بود — مشک بطی آهوی ما بوشادم کویا می
عدلان زر در داک گشته جوهر علم جوهر — کرده پنهان تخت دایم دانش
گر بقدر آتش دانیم دود او هم چو — از فر آتش جوهر شاید گوهر دنیای می
در سواد دانش از منخر فرو کنیم — تیره بختم هند شاه در رای ارای
بسکه در توحید شیخ گشتم تنها — خیر دار شعر نیست نمود کرد نشاط خوی

۸۴

از بودی از رسم دم موهوم بودن — میوان کوتش گرمی که سیم همای
عالم الغیب عشق انتم او را انکار — اول زخم بود دانش کشش فرمای می
ای ملائک هر هم هر چند عنصر کردم — ما ملا آتشان حکم گشت و تقاضای می
آسمان باشد آیا کعبه را کرم — کی توان گوشت سپهر ستان بود بای
معنی شهر مجاز از فتاب ضخیم تیس — نشست زی خاک او را کریه زیبای می
آزو شیر از نره کرده در نور سبحان — یکی از جنت آید شاه را از دو می
ما که جسم طرح لوح و سنن نقش کلبت — عقل کل باشد ادیب جت املای می
جسم کشور نقش داد از قوت جان گیر — عقل بس باشد از بر دو ایا دا الای می
آتش در دین خرد و عشق نقش جان — نادان شعله شکل از دیده دو گر
کو هر هم بر جهان پرده ساخت و شعلی — دیده شد چهار کی هر هو له دو فشای می
در شش عظیم خانه ام بر هیچ که فرزند گرد — نقش کل یا جانست عقل الهی پا بای می
هستی یکی نیز دو جهی است خود راز — عکس یا فرد داور ده دستهای می
الله خود نور است ختم جو بالله — علی و علوی بر سر سعدی ای دیار
باده بنیاد عقل و خود جام است میخانه فلک — هشت جنت است هر نگه است ای شهریار
تنها جای مکم کیست داد که در جام فلک — در سواد علم لعید باد بخسرای می

هفت اعضا هست همچون هشت بهشت ... از سلامت روح وس [illegible]
شاه بیت این قصیده را که غم ... زانکه بیت المقدس است ... هایی
نقل تو نقل از اقبال مثل عاقل ... نه بختلی فقره و کشف ... هایی
در کجا تیجاد خانه ... نه غلط ... یکی هر ... هایی
نکاه ... بنیان که سرد ... کشتی ... از حالی ... هایی
بوده ام ... گ ابر آبی از نوح ... هایی
از چشم ار کرده ... دستی ... رستمی کان ارم ... هایی
بهر عنبر ... درد ایم بهود ... رضها از ... جام ... هایی
غیرت ابروی ... خود ... سالها ... شمع از ... هایی
آفتاب ... چشم ماه کنش ... چرخ کرده ... هایی
گر سخن را ... کوی ... در شای ... هایی
نفس ... گشت ... مخله هایی
... از حکم کوه ... هایی
نظم ... نثار ابو الفضل ... هایی
دانش و فضل ... آیا ... هایی
نجم ... بحران ... هایی
... [illegible]

٥٥

گر ... درست مظهرم ... جو ... هایی
چار عنصر ... ز درس ... نه فلک ... یکتایی
... تو در بالا ... بالایی
باد ... کشیده ... بارش ... هایی
... زانکه ... کعبه مولای دل ... هایی
در سلوک ... حق ... یک تو ... هایی
... ... ها
... ... هست ... مولایی ها
آفتاب ... معرفت ... بس بود ... هایی
... نظام ... هایی
دیده ... گشت ... مولایی
... چو سکندر ... هایی
... سر قدم ... هایی

... [illegible]

... کوی ... هایی

... ... [illegible]
... [illegible]

به جودی برد با ... از خاک | الشی ... بود ... بود ...
خصم تو ... رود ... کنون ... | جنت ... جهان ... بودی

گفت ... داده است ... | هوشمند ... است ...
داد از دست ... مدرسه | ... ناصح عاقل ...
یکو ... خواهد ... | در ... کند ... بر ...

بو ... شد ... آن | ... ز ... روی ...
... در ... | بین ... جام ... کردن
گذشتم از خود ... | ... خواهم ... جان ... کردن

کس ... داده ... | ... جامه کرده ...
افلاطون ... | ... مانند ... نخست ...
هر چند ... | ... دایم ... زندان ...
از ... | هر چند که ... اشتیاق
... | ... گفت ... رگی

بر ... چشم ... | هم ... جهان ... ابر ...
از درون ... جهان ... | ... بر ... سوز ...

از ده جام گردان ... | چون ... بنشستی

... شود ... | نامه ... زاهد ...

... خاک ... زادن | دوستان ... را که ...
... | ... کشتم ناتوان
... | ... باد ...
... | هر نفس ... شاد ...

... جهان | در ایام ... جهان ...
... خانه ... ترا | ... خوان ...

... | ...

جلیلان رسم [illegible]   چشم [illegible] شوکت [illegible]
باد دارا [illegible] کو [illegible]   فکر [illegible] از نوش [illegible]
آه اهل [illegible] شمشیر [illegible]   قوت [illegible] ز نوش [illegible]

شاد [illegible] یار [illegible] جان [illegible]   جوانی ایمان [illegible]
جهان [illegible] ستم [illegible]   جو خواهد روی خود [illegible]
[illegible]   اگر در [illegible]
خود [illegible]   همساز [illegible]
جو از خود [illegible]   [illegible] قول [illegible]

خورشید ذات [illegible]   موسی [illegible]
کنند [illegible] موسی [illegible]   روا ز [illegible]
بیهوش [illegible]   با هوش [illegible]
یکو [illegible]   کو در [illegible]

[illegible]   [illegible]

بالای [illegible] سرو چون نشسته   نشسته بالای سرو [illegible]

[illegible] تو میزان فلک [illegible]   بحرمت نظام شاه [illegible]
[illegible]   [illegible] نوشیروان شاه [illegible]

بپیغمبر و شاه [illegible] برهان .   [illegible] عرفان
بپیغمبر حق محمد عبد الله   عبد الله محمد [illegible]

در سخن کس [illegible]   [illegible]
[illegible]   هست [illegible]
[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]

. جامی عبد [illegible] امام سخن   [illegible] سخن
[illegible] باقی   [illegible] سخن
[illegible]   [illegible] سخن
ذات پاک [illegible]   [illegible] سخن

روح او کالبد عمر زر بود ‌ ‌ ما ... جام سخن
گرچه باقیست ... آتش ‌ ‌ در ... باد و ... سخن
این گره و خبیث ... نهاد ‌ ‌ ... از من ... سخن

سخنیدها بهر چون داد دین ‌ ‌ چه با کار موج بحر از ... [illegible]

از کشتی ... نعتها ... کن ‌ ‌ بنیاد خدای ای خدا جو ... کس

ای نام تو سر دفتر طفلان دبستان ‌ ‌ یاد تو ... خودان ... شبستان
بی نام تو ناگشته زبان کام عجم را ‌ ‌ هر چند ... کلام عرب ...
بی یاد تو دل ... سالک ... ‌ ‌ ... آرام ... سر ... بستان
هر راه که رفتم ... کوی تو ... ‌ ‌ مطلوب وجودی ... [illegible]
دریافته دریافت ... ‌ ‌ موجود ادب تو ... دبستان

کرده ... سپاه ... ‌ ‌ ... جان افزای ... کو

... ‌ ‌ ... الحق ...

ای که ... ز درج ... سمن ‌ ‌ حال ... تاج ... [illegible]
گفته با خسرو ... جهان ... ‌ ‌ شاه ... خراج ... بنده ... خراج

تو ... ذکر ... تو ‌ ‌ شبخون شده ... دل ... تو
با یاد ... گشته از کینه چه سود ‌ ‌ میدان ... شکر ... تو

... ‌ ‌ ... تو
... کوکب ... ‌ ‌ خورشید چرخ گنبد قندیل ...

جمعی ز پروانگان گفتند ... ‌ ‌ رو برای ... خانه
زین سخن پروانه ... ‌ ‌ گفت ... روشن شمع ...
... پروانه خندید ... ‌ ‌ ... پروانه ... فسانه

... شاه از جان ...

غضب شیر دیو جسم آمد ... جسم ... | ... پادشاه ...
تا ... ز ... دهانم
بیکس ... بیم ... خوشت ... | بسان کوه ... روان ... انم

ای بنیاد ... سال ... | از انتظار خانه ... دلشاد ...
چیست درگاه تو ... بهر تو | از کواکب راه ... ابان یافته
غیر ... حضرت ... اند خود | ... موسی ... یافته
... جنت ... دوستدار | دشمنت ... یافته
چون مصوری ... گفتار ... | کهکشان را ... یافته
از وجود ... بود ... | ... را ... یافته
از فروغ ایوان تو سالک ... | ... یمن ... یافته
بخش ... سیاره ... | بسیان ... کیوان یافته

تاریخ بنای ... حضرت سلطان ... از ... یافته

خلق فریدون ... جمشید جاه | کو در ... مسند ... شود
ایا حضرت شاه جهان | ... سکندر ... شود
ذات ... فیروزی ... | پایه ... فضیلت ... بود
لیکن ازین ... مجاز | ... حقیقت ... بود

جنت ... طبیعت ... | ... جاوید ... جان ...
پادشاه ... کشت ... | فاضل ... سعید وجود
احمد محمود رسول خدا | ... داد جهان وجود

تابسته زندان طبیعت | ... ازل ...
یعنی چه بود ... | ... از ... خواه

شود ... آشیانه | روان ... چون ... روانه
... از ... بریز | میان ... بودن روانه
... باشد | ... دانه دانه
... بسی | چو دارم چشم ... دانه دانه
... روز | نبات ... شاهیانه

... کشت ... آزاد | از ... خاطر شده ...
... آورد | این ... سال ... بود
... کنون | ... عام ... شده

صحرای وسعت جهان زاده ... همسر گشتم این راه مرا پایان دگر ده
نان غفلت گفته ... این باده درخانه دل آشنای آن ... جلاده

از آه بیدلان هر آنکه دردمندان این چهره را به ... سکندر آینه
بگرفت ... زنگ ... آینه خواهد گرفت زنگ ... هر آینه

بود اگاه حیوان از چراگاه همچو سلطان چراگاه
این حیوان ... انسان نمایان شد از چون دوچراگستی چراگاه
جهانجوئی که ... تاج او دستگاه با ... نزاشتر ...
قدم گاهی که در ... دل ... بچول ... ماهست پاگاه

برسید ... جهانبان حکمت پناه برسرش از ... شاهان کلاه
... که در اقلیم ... جون ... بهیم ... خداه
از ... خویش ... علم ... گشته ... خلق ... پادشاه
میر ... کی ... علم ... شاه
... حکمت ... جهان ... دستگاه

مادحان را چون شد ... زبان ده نجهار ... را چو او مسلمان را پادشاه

معنی مفرد ذات اله اسم و فعل و حرف نحوی را گواه
مقصد از گفتار ذکر ذات اوست مجرد ... موبد دستگاه

مو به سوی حکمت از ... خود را بکمالات علم ساخته
موجود جز از خدای کرد ... هر چیز ... هست ... ساخته

خواجه عبدالقادر کمالی عرفان پناه خامه او سالکان ... را میل راه
روز نو روز ... صبح عید ... سیاه
جامه کعبه ... شاه راه شرع ... دستگاه

کشته ... پیمان ... چون ... مربط برکرده
از ... شد ... شاه سریر ملک ... چون آینه ... برکرده
کشور ... هر شد ملک ... برکرده

بهر بردار تاج دولت شاه · بر سر استوار دارد شاه
از سر او که کشد بر دو زر · فلا داین بود زیر کلاه
بیش بزور بر سر برد · بال در زیر شود بگسیر و راه
پای تخت بار نثار ست · کاه و بیگاه مسیره دناگاه
تاج مهر ست سایبانه چرخ · نور خورشید ماه بانه ماه
بارگاه است بهشت زد پال · بار جویان ستم کش درگاه
سیکشا مربد همتا دست · خصم بحل نشسته ست سیاه
جود دان بنده زبان دان نیست · گوش کس این حدیث از افواه
تار زنار سبحه را بگسست · متصل المتین موجود آه
کیسه جو سیه مطلع صبح دیجوری ماه · دست او مهر درفشان مهر رخشان چرخ ماه
خاتم جمشید در دست دیو کی بشد روا · سکه باز امد بدست جم زتا ئید الله

نغمت دارشی دهکر بشر اوخته · سوز و دی زنه تاب اورده دماغ اوخته
خویش را بانوز زر خود میدانی جوشی · نیست مر پرویز را زین گونه گنج سوخته

گوید گدای بینشان عریت · از کیک دو حسین بگوتاه سه به

شاهی د بست یاد ماضر قد بد د · اینست سخن صحیح از آگاه
در جهان مالک سریر و کلاه · است بسیاره مردمند آگاه
ز محمد کام دل دینی موید · غیر الله شاه عبد الله
هست سلطان دهر ظل الله · همه دانند مردم آگاه
دارم امید تا بهم باشند · ذات الله عبد و عبد الله

مع کس سلام بر بر ... شاه · مر به بعد در گ ... زه کلاه آگاه
مرده در خلق قحط ... · دوران این بود در سالی ... آگاه
بهر برده آنشد ... · جدال تقویم ... آن میل راه
نیک در ... · میرد ... از گذارد در راه
مود ... · ز ... الا کناه

نیکبخت شو ... باده را · میده ... گاه خورده گیاه
مادر ... · یک جز ... سیر بند

[illegible]

پسند باب کیست از شهان کناه — مرد می زند به خدای عالم خواه
نقیبه شهر مرا خواند بو بدار رسا — مرا شفیع سزد ذات پاک روح الله

ای مرد شغال دا آیین روباه — کردی جهرا جم ازوهن غیر کشاه
جاه تو محمد فانی وازمی بانی — حامی تو عبد الله دازمی الله در

ای مهر خدا ادری ودای ظل آله — عالم همه عبد تو و تو عبد الله
این منتخب نامه شاهان قدیم — شد ختم بنام حضرت شاهنشاه

بتقدیر تایید لطف الله — جهان راست سید محمد شاه
معدیش هرگز نگردد بدهر — ز محمود دین محمد پناه

بذات خودش نبی ز حشران خلای — نشکنی زسرا زه ربود نظری
مدام شاد نشینی بو مرد بدار بکنی — بلند صلح کل و رد جهد زفاک زری

وده ده بر غم خویش یاری نکنی — تا شور زمیر تو ده باری نکنی

بر قول تو خلق خواه از کار کنند — زنهار بکار خویش کاری نکنی

نور بخشی عارضا نزا بر سپهر داوری — مهر برسش الدین محمد آفتاب خاوری
آن براهیم جهان کز آذری حق آگهی — کعبه قلب مرد ان از جان آذری
بر تسبیح او حبل المتین موقت — روح از موسای عهد داور ختم عنصری
آن سلیمان طبیب جمشید نظرت شد ازل — دیو خشم شهوتش شد تا ابد در چاکری
بر سرش از نرگ دارای کلاه بهمنی — در برش از نور دل آیینه اسکندری
بیکمان از عدلش هر تخلص هر کیت — هیچ جهم خضری دجیا عنصر عنصری
آن محمد حتی کز دولت تایید داد — خامه مو بد بعد حشن ذو الفقار حیدری

دست به جیبی ابروانش قوس — زین بحرت منجمست بیسی
مشتری بار است خانه خانه قوس — قوس در مشتری نزدیده کسی

بکمان شد نشست ای مو بد لیکن — بخشم دشمنان تیر خدنگی

بید دستان زرکری دفع شرارت الکند — جراکش نباشد ره وی کیا بنشیند

باخامه‌های مژگان از خط نازک ... — بر سر نوشت سرخی موج به سر نوشتی

نه چشمت آنکه خان ترک زین بیداری — نه مژگان دشنه خون ریز توبین بیداری
بچنگ خسرو خوبان جهان چرخ بیاید — که از هر غمزه آتش صد تیز توبین بیداری
چو آه عاشقان از جوشش گیسوان ... — خدنگ تیر از بهرام چوبین ... بیداری
ز ... نمای او گشته ... جهره ... — که او روئین و ما با جسم سیمین بیداری
چو بر بندید ... جامه ... — ظهور از رخشنده برزین ... بیداری
تمامی گوهر جان داده و دردی ... — بی بند سبک ... خوابش ... بیداری
چو در دست ... قصه ... — تمامی رفتن از نقل شیرین ... بیداری
برای ... انجام جشن سال ... — فغان کین ابلق ایام ... بیداری
کفی تن ... جرخ ماه ... — نه بو هر اختر ... بیداری
به خط و خال ... قرآن اسلام — بگاه خشم ... آهن ... بیداری

گر نفس ... راز بر گیتی را — از شعله چو زود ... دیه ...
... زبان به — گرزان فرو ما به ... گیتی

بی چشم تو ای ... چشم ... — زمانه ... گشته ام موی
... دیده ام ... جهان ... — رود ... چشم ... چو روی ... بیگی
چه گویم ... سیمین ... — ... روی چو خورشید فلک ...
... سوختم ... از ... — ... چه میگوی ... ام روی

ره بوی که ... خود چرا شافتی — جون ... انگار را بافتی

... آبرویم گشته بحاب — روایت ... در یای ... دی

از ... چشم ... خار ... دوستی — گر غبار دل ... دیوار ... دوستی
... کردن ... روزی ... — بر ... شیشه ... دوستی
... شهر ... — رفت ... در ... دوستی
... سوسن ... میان ... — لاله ... صحرا ... دوستی
... جادو ... — گفته ام ... دوستی

جز تو از شهزادگان ... — خاک ... فرمان ...

زان بزرگان کو حکمت شناس سلاطین بود   کر بالی کنترها در شناسای مهی
دل پر ز قناعت وردی آزادگی است   لاله خالی ساغری در مینای تهی
تخت شاهی باد دایم زیر پای قدر تو   تا بود بر فرق درویشان کلاه کمکهی
رهبر کردار او کن همت ارشاد پیش   در سلوک راه اخلاص تو راهی بشرکی

ایضاً

گیتی است بجز میوه مقصود توئی   بی تخم و ریش هستی موجود توئی
دجال غضب حمار شهوت لیکن   در مهد بدن مهدی موعود توئی
جبریل تو عقل و امت تست تو پیر   ارباب محمد تو محمود توئی
در نفس تو ناصر من بند مشو   کاین جمله زیانند در سود توئی

بیگونه چگونه رونمایی   بیا زنگی و زنگ زدایی
ای مردم دیده دو عالم   در خانه چشم در نبایی
ای آنکه مکان لا مکانی   ای آنکه خودی نه خدایی
بنشسته درون جز تو کس نیست   هر جای بغیر جا کجایی
صد گونه متاع بود در کف   از همت غنم کهی بهایی
ای آنکه بحیث پای داری   کشکول بدست چون گدایی
بچون و چرا تو در اه   با چون رجا خس چرایی

ای گنج نهفته جز تو از تو   از هر چه که گفته ام درایی
از پرتو روی عالم آراست   مو بشده مظهر رسایی

گر رهرو مسلک روانی   بر هرچه ز دل روانی
مشکن شو ذات عدم بود را   هرچند محقق دو دایی
دور اگر تو او ست گفته دوست   گر دست بجز دکنی تو بی
دوری ز خدا از خویش دوریست   نزدیک بجز دنیا ز تو دوری

منم گر من تو با من بس کدامی   توئی گر من مرا من از چه نامی
تو میگویی انا الحق من چه گفتم   نیم من خود تو با خود در کلامی
بجز حق نیست بی حق جستم من   تو موجودی و با من میخرامی
بخویشت کس بپرستیدن ندانست   کنی در خواجگی کار غلامی
چو کرد در ساخت با کعبه جویان   بجا با کافران در بتکرامی
یکی از عشق دل یکبار بر   دو دامی میکشد با تو دو دامی
بجام از مدده رایاتدست منی   تو ما را میکده بست الحرامی
بیر خوئی کرده صف جام گفتی   فرو خوانده هر انجمن جامی

جو از فلک دام هند از دو دمانم | خواهم گشت جانبه دو د دمی
وبس سه رود در زنجان میرود شت | تو نکش بامحال سنبه جوانی

جو تو سب یوسف از برای خود دهم دلی | مرا بابت از شکو بابت الزن
کشتی از خود یابکند [illegible] ملی ادرا | کرا خواهی رفت اکنون جو برک [illegible]

تو را خبر دهای سیابا | بین بهانه بجای نسیابا
هر جوی د نسابیت محرم | ز نور دلیده دالای نیانی
ز [illegible] صوفی کس نگردد | کر براز خوشه برای نیانی
ز امرائیل و اسحق بیت | دم جاجس بیابای نیانی
اگر رشته منشور خواهی | ز خلاجان [illegible] جانی بیانی
ازین گرسس باخان محب [illegible] | هر سم که دارانی نیانی

[illegible] دانش [illegible] | بود [illegible] استه ناری
[illegible] | بگردی ارام یک [illegible] باری

تمت

اسبابی چرخ راز [illegible] گردی | نار راگر دیانج خسرو زکل [illegible]
تا ناشیب [illegible] | بنده را هرچه میگوید [illegible] رنجی

زاشوب محمد علی خطاب جلی | که [illegible] تو نور تی و تاب ولی
یکانه بر تو [illegible] | تو بر تو دد چراغی محمدی دهلی

آزاده توان زلیتچ در سلک [illegible] | بهتر بود از خایا و سلطان [illegible]
با کاه نسازند سر د کردن ادرا | بانوی عجم داده عرب بیکم هندی

زنیفی شاه دلا یت شاه ملا شاه | خطابکه شد از [illegible] خارجی
ز اهل [illegible] | که از نهم بود اد [illegible] بوالله ای
چو جامه [illegible] | محبتی که برپا شد زجنس دنیای
فصل [illegible] اراده ت [illegible] | خویش [illegible] داری

خورشید [illegible] | سالکان [illegible] الکندی
[illegible] | روز و شب [illegible]

بابا شاه پنبه بود مهر عارف انسان   هوش چو ملایی آید نجات در زندگی
کردی خیال این کارت نشد نمود هوا   کو همراه آید جلا را از آتش خرسندگی
خفر دمو بدکر جه بسیار بنوا ز یکجنبه یک   بهر او تن زندگی شد بخش این دل زندگی

ای که پیوسته فکر زر داری   ترک ظلمت کن ار درین کاری
در قضا بای حدیث نشنیدی   دل ز دولت هوان و هون خواری

میر محمد مقیم انکه رفیق داوری   کرده زدهن خود نفس آینه سکندری
بس از رسطوی نظر سید فلسفی امام   صورت خجر دل و رو دید و همکو هری
طوبی سدره دستگاه دست برای دو [illegible]   همامه سیر و قدار دهش دل خوبری
چهره شاهدی صحنه یادش برد   کرده خامه اش شکل خلق و جنبری
صادق جعفر جز سپهر برس در دو [illegible]   زانکه ناطر ارتست همه بسیر جعفری

این چرخ مینای بجای کنبد نیلوفری   دیده است قیصری با تخت و تاج لردلا
این زاد کوت ریا پیوسته دشمنی در دفا   خجز زر خود زر در دعا از جانی دلپذیر
غافل فوج دو [illegible] پای ستم [illegible]   خیال بر ستم فطرتش از نسبت دارد زری

مهر عارش با خرد دینش براهی حق   تغییر فرقان میکند اما تو ان ز کربلا

ای خواجه بزر فکنده دایم نظری   ملکن [illegible] از ستم چو باد گذری
همراه پس از مرگ چه یا ز زیبری   کر رستم زالی و اگر زال زری

نواب حکیم الملک مجموعه دانایی   سقراط هر مندی بقراط شناسایی
ادریس زمین مدرس تابر چنین فلک مسعد   در حکمت نیز راستی جامات توانایی
برهان بیانظری در مسلک شابین   استاد شهاب الدین در مذهب بغدادی
مهر فلک اشراق در چشم فلاطونی   معراج ارسطویی در مذهب مشائی
در زمعت حق چو بی روح فلک اطلس   در جهر خضر باهش ناموس شکیبایی
از حق در دانش بیت دیده دانش   از نهکی خارای نو زنک بخارای
در معرفت بی انسان کبرا از دی   ظاهر در مینایی باطن دم عیسایی
موسی صفتی کو را توریت حدیث اید   از حق جل النور شش شود رهبو [illegible]
فرعون غضب همی یا مان طمع مسلم   از صورت تا حد لیش [illegible] نایی
تن خوم سر کرد و دی عقل قوی در روح او   واجب که بدیدن در رحمت تنهایی
بر صحت اسلام این برهانی شده [illegible]   کور رهبر ایانست از رحمت الهی

در آینه [illegible] نور [illegible] بیابی ز رعنایی ازو [illegible]

بو فایه [illegible] هرگز نبود [illegible] نیروی اسکندر [illegible]

موسی [illegible] نور [illegible] وز خامه [illegible] دادی ز کلف [illegible]

از آدم [illegible] از حکمت [illegible] سر کرم زمین [illegible]

از شوق [illegible] در راه تو [illegible]

هر دو جهان ایزدی ست شاه او [illegible] آینه خدا [illegible]

شمس [illegible] ذات حق [illegible] او دست خدای [illegible] او دست [illegible]

دیده [illegible] تافته نور حق از در صفحات عنبری

[illegible] نایب حق امین حق در همه کار داوری

[illegible] خلعت [illegible] از [illegible]

روزه [illegible] آسمان [illegible] مهر [illegible] سجدات داوری

[illegible] نور این جهان نسخه مصحف [illegible] از قلم مقدری

دست [illegible] آسمان [illegible] بار [illegible] خاتم [illegible]

مهر نبوت فلک مصحف داور ملک چشم جهان ابو الحسن [illegible]

[illegible] ذات [illegible] که چهار [illegible]

[illegible]

[illegible] استاد [illegible] درس [illegible] چرخ [illegible]

بام [illegible] بر منبر [illegible]

منشی چرخ [illegible] ماه بر [illegible] خامه [illegible]

ماه [illegible] شهر [illegible] یافته [illegible] نور [illegible]

[illegible] نور [illegible] گوهر [illegible]

جمله جهان [illegible] رونقی از [illegible] سپهر [illegible]

چرخ بجای خاتم است [illegible] دست [illegible] ایزدی کرد [illegible]

شد [illegible] خدای [illegible] دین حق [illegible] گر تو [illegible]

[illegible] زانکه تو [illegible] غلام [illegible]

[illegible] خصم او خوار و ذلیل [illegible] آنکه [illegible] دوست [illegible]

[illegible] خصم [illegible] خصم [illegible] خصم تو [illegible] بهادری

چشم [illegible] چرخ [illegible] [illegible] تو [illegible]

[illegible] خاقان زمانه [illegible]

[illegible] [illegible]

کم از ارباب دگر ز ارباب علوی در گذشت … چون تو اونبود نیدا امهات عنصری
جا بود هر ز اهم بوده شد بخبر دز … کر بنشد در جهات او را مشتری
شاه داد ز همایون گر در مرات جمع … تا هست عکس تاج او خواهد مهجاودانی

ای همایون جانشین نای صاحبقران … ای جهانگیری کز فیروز اکبری

چون به صدیق و فاروق و هم عثمان … روی ز ارم خورا [illegible] رد که علیم دانی
بهر ترجیح تشیع بنشین ز انصاف … صادق القول چنین گفت پیمبر یا [illegible]
جو تو در کسوت انسان شده روح مجرد … یافت ترجیح ازین بر ملکی انسانی
شاهی پوش ز بیم تو سراسر کافر … زور دو دشمن تو سرخ رخ میدانی
ملکستان تو زینت مجددت ز توی … منزلستان فروغ خرد ای [illegible]
ز تو بی بهر [illegible] مردم کابل مانند … تو که از خوان کرم بخش ده کرمانی
چون [illegible] ایران [illegible] نی ز تو … تو که خورشید سپهر کرم و احسانی
سیمبرزنست کی ز غرب براید خورشید … چون ز رخ تو سیقا منظر زا بو [illegible]
خوش مجلیست کی از غرب براید خورشید … چون ز رخ تو مطالعت [illegible]
کز نه مهد دم شد [illegible] ز دست کرت … مرجع هو جود تقاضای سلطانی

دبیر [illegible] و نشه ز تمت [illegible] از یک [illegible] معاف … ز ربو با بالله و افغان حشر بو حالی
آل عباس منقبت جامه سرور صفوی … دا جبل عدوکه بشدی بو بند در السانی
عالم از تیغ تو در بیم و ز لطفت بامید … ز انکه شیر افکنی و در بخشش و رخانانی
خرم از کار تو بسیار دل شاه جهان … چون تو همی منشی و امر و نهی دستانی
بر که مانند کنم چون که نداری مانند … روی بی یار سرد دم که ندارم تانی
تا بمهر تو ز دهد هو ز بماند الله … تا بخورشید دهد چرخ کند ایوانی
خان خانان و امیر الامرا باشی مدام … خبر کان تو شد ز ادار ز سلطانی
چره کهنه نورد ز [illegible] رم بس ز رست … با جهان جامه که جم داشت بلی بند زلیلی
د رجهان خلق که بوسته به رزم صابم … حکم روزه نه دارم اگر از لی تا بی
این که سر بست نسبت خواب ندارم [illegible] … خلق گویند بجهت بتو نکی پنهانی

هفتکستان ز ربکان مرکز دون کجان … ز خاک [illegible] کاه از شانه مردم ثانی
رغتق دولت شاه زذری د ز زشکیم … بو زداد رو بو خواه نفس [illegible] جهانی
تیخ جدر بسیر ز از درن خرم … هزار بیا ز سال از شهنشاه زمانی

دیگر بتاج ز سر بد اری … دیار از تخت بادیای ودرنی

بگندم بهشت آدم بهشت است   تو یک پایی که صد انبار داری
ملک در ماند و انسان رسیده   بمنزل برد بار از برد باری
وزین نحل درخشان لب دوست   شدم در خلقتش لفظی حصاری

به بیضا عیان جو ماه عیب جیبی   کجا بینی که با خشم است جیبی
بهر معرفت یوسف نهایا   سرایل تو دکنعان ز بیمی
بی بینی ز صانع این عجز را   چو افتاده در برهانش نفیبی
بتابا نازی از مو بجسم   برای استخوان کلب کلبی

تا محشری دمادمی کند جلوه گری   غیری نبود عیسی خوان مزدی
زرتست عروس لطف تیزی گو   باد ادلب شاه بمرد دات سکری
ز بینی آدم چون نبود زر دل اینی   کاشش میوه دو نرگانیها اللای ذره میز

بی آب و تاب چرخ گنوار بردی   قهر جو نفسیه دم مسیح مرزی
بجا مجرد است تاهم ملکوجان   دو زر ز خلقتم آمده ابجد بمر
ز دست تنفست جنه جام می زرست   کس افتاده افتادهاش بمخاریز

می خور که در بهشت نیابی ارج   عیش کلنک دلو بسید محمدیا

نگرود که از ملت تجاسی   مه صاحب جی نعره نادان ساحر
با عمال تمام و علم کامل   جزا زفرق و فرقان الهی

ز فیض جینی زلف دست بنیا   و جود شانه کشته چوب چینی

شاه دارا بود بنیک صاحب عالم بلوا   موبد عالم کمال و صاحب عالم کمالات

خوش می بود ز خویش اگر می بندی   دوری حلاوت خویش نزدیک جودی
دانش دوری عار نامه و نامی حق   موبد تشدی چه سود مومن نشدیا

گر بار نه کانه دو زنستم چه سود   حق نظر میبود دم از سنگ کی دانستمی

مه در کعبه توحید آخر گشتی   مالک یکسان نه دو در جستی
جسمانی کلام قیم الله دارد قیوم   حق نظر نکو دم موبد مسلمان

گرده‌ام از دست شیدان بد نگون | یک در صحرا نیم ابنی از شان بی گور

حیف بهر احتسابم ذره میاد زدم | برسم ... شیدان بگور

خوبی کاه غلط فرمایه تیمم کن چو من | قارمیکو پر چو من پایه وضو سازی ز جوی

ریح میکو چو طبله ... | نیست داریت بنگاهی آرام کرجوی

بر نماید ... سبیل | ... کلاه وجبه را چو موی

یک اقامت میکند نفس ... | چون موذن شد ... صبح ...

موبد آسایش جان در جهان دیگر | اینی در چار سوی ... مجوی

تمت تمام شد دیوان

بسم الله الرحمن الرحیم

بنام آنکه هستی آفریده ست | ز جنتش گلستان را گزیده ست

ستای اوراکه کامل آینه یافت | ده و دو شهر مه محراب ساز دیفت

زمینش نقطه برکار آسمان ست | که خاک عاشقان و عارفان ست

همین بس پی‌کذرگاه شهانت | مقام عاشقان و عارفان ست

جنبدی گرهوا از ذکر ایه | زکوه و دشت اد افغان بر آید

قرار ترمیم را خواهد این گوز | دراز از دمی کرد و شب و روز

بنیادش سر ز کیوان برکشیده | بصدرش ... دست او رسیده

ز ... کیس نخواهد شد برابر | بران بالای بالا دست کشور

بگرد ارسیجای زمین بود | که پای او بچارم آسمان سود

بنی زان آسمانها را بسود | گزین شاخ جهارش نردبان بود

هیولای نخست ... | ز شاخ ... اصل و فرع عالم

ز آغاز دا الجنس نشانت | توان گفتن که سیخ بیکرانست

بلوکان دار ... گردون | ... است ستاسوی گردون

چو گوی در کفش چرخ مهی ست | یقین ادحامل عرشش بری ست

بای صادق شده فرمان احمد | ملک دیدم که دارد ...

ز برکشی سبز گردون مینماید | جزین برهان برای رنگ ناید

کاظمه را از دان لاله اوست | ز گرد انش جبین وان هاله اوست

که ابر باران بر آسمانست | که عکس از حباب ... انت

فلکها چند باد خام ساختش | دل ... دست فرختش

... اد اعداد تاد | عماد آسمان از شاخ داداد

و مکتوب چون کیوان سیارد | معلیا دست ... می‌نگارد

کر ... | نولیده عرشی چون ...

... | ...

ستور بسته ان برشد مجنون / بهر کس گشته مجنون لیلی گلگون
چه توفیقست از یزدان دانائید / ان شیران برداز که بپشد
سر دستی یا فکنده بیداست / که باد دستهای برگ بیداشت
رشفتاوش جان را جا ش بی کام / رشاه آکوی ابش رنگ بهرام
قبهاش لیلی تیش گشته / بکام خود بخواب لذت نشته
تبلیل شال انوش برشد کام / بهشتی ابهی فشرده با جام
جمی احد برسیب و سنبل ست / دبیکن نار دنار خلیل ست
سراسر نارگش است عروست / بر درانگشت خاون دستبوست
حبشی بسته شهور انگور / بپاس هاشمی بر خاتش نوز
شهان در یوزه گیش تاک نخریا / نبی فرموده ان الفقر فخری
سرای حاصی انگور باشد / جهان در عهد تش سرور باشد
تواکنون خسروی را انگور اموز / که از دوستار شعر و منشات اموز
رفاکش کشته جم نای گشته نامی / خطا جام بی اد شرح جامی
بهی را پاک برد تا برکشیدست / که از سیب ذقن بر افروده است
ریب بهی غبغب تاپان بر شکست / ازان چاه ذقن هر آب اشک
بکلبش جعفری کل انت نرگ / از دو کاکو عون اله برمک

سنه [illegible]

سزد گر جعفری را ز خوانم اورا / کی راج مشتری دانم اورا
کند اهل جمی را از درایت / بکیش جعفری صادق بدایت
جمی را شیخ آن نبی اوست / دبود نشان التمغای کفت دوست
ریحانش خطا ریحان گشته / به بیداکری کالمحمل ده خوابه
جمی تخت وبر تاج خسروی ست / دران کلبا گلبنی بخیوست
نارم گردد صف کابی گل / کنیز و بنده جبلیش و سنبل
بل پر ارغوان راز است بتلم / که دور ستار ارغوان راج [illegible]
جو کوئی ارغوان ارغون شه ایلیا / زال قان قان درست این
دانم وجه تاب زلف خوبان / جمی گویم کرمست زعشق بجان
در دو نرگس بچشم نور بینا / خمار جهان شده [illegible]
دا علم نظر در دیده دیدم / نظر کردم فرد [illegible] رسیدم
و مفت چشم نرگس اهل از بس / کند تصنیف شرح حکمت العین
بیاموز معنی راز بلبل / ناملی گه بخشید [illegible] سنبل
کل عباسی ادر از عباس / دزد عباس [illegible]
به سبزه خرم و صد دست / قدیم این حاشیه بود [illegible]
ا صد برگ شهر داز کابل / هزاری منصب از کل یافت [illegible]

گل مخمل در درونش چشمها | بیرون آنکه زبرگ [illegible]
سواد مصر از بشام تو رم | روان بر سبزه رود نیل [illegible]
ز قمری باد گوشش گوکو | روان ماست آب جاری جو
روان الیس چو تنک چشم مشتاق | گلستان برد از دو صفت [illegible]
شود از پرتو برگ خزان آب | بچشم دیده در عین [illegible]
طلای دست افشار از شنیدی | ز زی جاری تو خود در آب دیدی
چو عکس ماه را در حوض یابی | سرای ماه شد در برج آبی
در آب حوض او خود دیده رو را | نرد خوانند عین الشمس او را
ز دیده رسته عکس مهر انور | خوردی گشت عکسش چشمه خور
رهانی بسکه سطحش با گلستان است | تو گویی آب عین عاشقان است
نه حوض است اینجا بر آب مصفا | که او تغییر کرد افسرده ها را
نه حوض است این که جار العدو اسا | کند تغییر کشف آیه ها را
ز عکس [illegible] گلاب روشن | برغم عاشقان [illegible]
ز بس در آب عکس بوستان است | نه [illegible] گلستان جهان است
چو تابد بر در آب آفتابش | بگویم [illegible]
چو گردد آفتاب [illegible] | [illegible] شرح [illegible]

صفای مردابی از آب اینجا | درو عکس فلک [illegible]
بهر موقف [illegible] معارف | ز نی بشنو کنون شرح مواقف
بفرمان سپهسالار خرد | علی مردان امیر مهر پرتو
چراغ افروختند از هر کناره | [illegible]
درخشان [illegible] فانوس قندیل | صدای [illegible] صورت [illegible]
بهر شاخی میان فانوس روشن | سراسر باغ گلزار دشت
چراغ افکند عکس خویش در آب | فتاد آتش [illegible]
میان آب و آتش گرم صد تاب | مصابیح القلوب [illegible]
چو مه خورشید گشت از آب طالع | [illegible]
[illegible] حوض او [illegible] | [illegible] آتش شاه جهان [illegible]
که چشم گلستان جان از دیانت | [illegible] جان [illegible]
سوی چشمه خورشید را [illegible] | جهان آید [illegible]
[illegible] آسمانش | که گیرد آب [illegible]
بفیض حضرت شاه جهانست | که چشم چرخ [illegible] آتش [illegible]
[illegible] آتش [illegible] | که دارد قصد [illegible]
[illegible] آهنگ [illegible] | [illegible] آسمان خلقش [illegible]

زهی بالا چه پیوسته البس　　سر سر دردان دادن خطابش
بپای سرو سالکی گشته منتیس　　بیاسرد جهان حوفی ما بین
کنار جوی باشد سرو کلش　　زهی سروی میان آب روشن

خدای جهان را کسی انباز نیست　　بدان بود انجام و آغاز نیست
چو اشکال و تمثال در رنگ صور　　بود ذات ایزد بکشف و نظر
بگنجش نبرد نبی انبیا　　نکرد ادراک او اولیا
ببین در فرد مانند فکر حکیم　　ببردار چه راه حدوث قدیم
ازان نور بر رنگ حادثان　　نشانهایش قاصر اندر بیان
در این راه آنکس که دانا ترست　　بنادانی خویش دانا ترست
وجود خرد پرتو نور اوست　　روان فلک عکس از نور اوست
ببین آسمان سایه نور اوست　　فروزان جهان پرتو نور اوست
نمود لیت لی بود هستی فزاد　　را نیست بالا و پستی نژاد
چراغی کس دانست که هست بود　　خرد بنشاد و درست خار الموذ
بود قطره دل دو دستدار　　کند دایم از ذره گوهر کنار

کی

بزرگی تو خشتجان گذاشت　　که آنک چه خوب گذاشت
حصار سموات گشتش مقام　　نگفتی کدای سپهر حرام
تن او سپرد و نه مردم بخاک　　روان بر فرازد تن اندر مغاک
کنانک کشور به او را مرید　　زعهر بود رهنما فراز آوریده
چنین کنند نشست بر گرد گور　　که تندیل لا گشت رخشنده نور

زهی ده دو سیخ سرکت استوار　　شدش استر جسیم بالی حصار
کنانک را گفت دیوانه　　نه زنیسان بود کار فرزانه
زر زندگان داستانی بزور　　کند بهر جان داده مرده
خدا مخور و کردان خدا دادن دکر　　خدا را بخوان و بدان ذکر

زنیکو گشتم مرد دانشوری　　شنیدم که پرسید صاحب‌دلی
به صورت پرستی بمعنی رسید　　کس از حق شفا یاد از عقیده
چنین و سیخ از درد مرد تمام　　که شیخ زنام شکر نیست کلام
زتقلید راحت به تحقیق نیست　　که تقلید تحقیق تو کمتر نیست

زعو لحان تا قفس ره بسی است — کنون فهم کن عارف ره کسی است
بگفتار گر نیست کردار یار — بخود داری بخشش نیاید بکار
کر نام شکر کام شیرین نساخت — بجان بند گر بجوالست تاخت
کرا مرد زر گوی در که بر دان یکیست — یقین این لحان ست و در وی یکی است
جو نزدیک بنشد سبزدان روان — زبانت نکرد و بیزدان روان

بدل هم جا گیر واللذی — دار سیاس راه کوتاه بی
زهوجی بگیر در قفس روز و شب — بیاد خدای گشاید دو لب
برد گرچه پیوسته نام کریم — برد گر چو دست عاند رمیم
نخیزد ز منقار طوطی صدا — بجز از صغیر و نخستین نوا
که در طوطی دشت و صحرا بود — نه زان بس که زینگونه گویا بود

تو خود مایه دوزخ و بهشت — خدا جو دراین عرصه دو جا را بهشت
بهشتی و دوزخ ز اخلاق خود — ببین نیک و نفس آفاق خود

[illegible] — [illegible] گشته [illegible]

که خور و قصور ای خیام نسای — بدر گفت عارف ز جنت برای
شکوه سخنور ز جنتش بود — بر و مشت جنت ز رحمت بود
ز رضوان چنین کرد آنکه سوال — که کو جهره حور و آب زلال
در اینجا ز خوبی نیابم نشان — که دنیاست نیکو ببین این جهان
چنین پاسخ آورد رضوان به در — که این نیکوئیها ز جنت مجو
که مینو نشینان ز دنیا تمام — بیا با خود بدار السلام
ز ولدان و غلمان و حور و قصور — بخواهی آنچه هست از در سود و سور
تو با خود نیاورده ای این مایه را — نه بیتی زن و جفت همسایه را

شنیدم ز رجا سر سروری — بدرد آمده در پی آذری
مگر نیست در بار آب دوزخ نهاد — بر مالک دوزخش در گشاد
بدوزخ درون گرمی اصلا ندید — اگر خندا او ز کسی بشنید
ز مالک چنین کرد دانا سوال — که دوزخ چرا دارد افسرده حال
چنین داد مالک مر او را جواب — که دوزخ ندارد خود تف و تاب
کسانی که گرمی ده دوزخند — بدنیا درون کنده با [illegible]
[illegible] — زید کاری [illegible]

بود مایه بنده بودن شکم　　برد آبرو بیش از بیش و کم
بدان کرسی مرگ بیند اهال　　فزونش مرگ سیر خواند زوال
ز بسیار خوردن بود کنار　　که بسیار خوار است بسیار خوار

شنیدم یکی از پی ازرق دلق　　نکو کیش خود را نمودی بخلق
مرا گفت بی تو بی انبار شب　　بود جوع در روز بار طرب
ازان کذب خاص خودش بر عوام　　سری یافت شاه شیخ کیشش نام
خردمند بیدار دل عارفی　　ز راز جهان جهان دل آگهی
مهمی شیخ را جای در حجره داد　　بنزدیک او مصحفش را نهاد
یکی نان بر افراز طاق بلند　　نهاد و در حجره را کرد بند
برد نیمه شب جوع آمد پدید　　مهمان شیخ بر طاق راهی چو دید
که کرسی در آن خانه حاضر نبود　　برآمد بقرآن و نان در ربود
قضا خامه در زیر پایان ببست　　فرو جست زان پس که آن نان نشست

اگر خواهی از مرگ سیری نجات　　بهل جسم و بردار علم ذات

بجای که نار در سیلان زمان　　روان را روان کن روان خوردنی

هفتاد هشتاد سالت عمر تمام　　فزون از ین طبیعت نکس مستدام
ازین هشت رو رست و هست خب　　ز هشتاد بینی کسی زنده کاید طلب
بخواب شب شبکه چه بیدار ماند　　دل خسته پریشی و غم نشاند
چو از بیست بربیست انبار تو　　بود تا دم مرگ دمساز تو
رگ و پی شود سست با استخوان　　ز هوش و ز قوت نماند نشان
عصا جلد شد دست ز هکر تو　　بجای کند قامت بر تو رز
بطعن عزیزان تو باشی هدف　　گهر رود باتو ماند صدف
تو اندوخته دیگری می برد　　تو دون نداری بسر می خورد
برنج عزیزان روان در الم　　برو در تن و جان تن و جان درم
شود ... خویش جو خویش　　بگوشی آید طعن فرزند خویش
بهر دم کنی مرگ را آرزو　　دلی کی فلک درد دارد ازو
سرانجام در کور راند ستور　　همه میران چه پوران چه بهرام گور
انوشیروان را روان زنده کرد　　تهی تن خویش درد کرد
بوستان دبستان بنیادی دل　　نوازند منصور را جز دل ر

کسانی که دنیا نشست آمدند — بیا یک به بند دوست آمدند
بجای کنار رسید روان — روان و روان کی روان کی روان

برآوازه دانش خویشتن — شناسی خدا را بتحقیق و ظن
ز ابر داستارات خوان ضم — شفا دان لب طایف سوز و غم
چنین گفت در روزگار قدیم — شنیدم که بود است شهر عظیم
اگر چند آن شهر معمور بود — ولی دیده ساکنان کور بود
گذر شد در آن ره شهی دادکیش — یکی پیل البرز بر برزش به پیش
چو کوران شنیدند اوصاف پیل — شتابان برفتند برخند میل
نبرده بوده پیل به جان نشان — کنون آمد از پیل شان زان نشان
ز هر کوی دانسته برین شتافت — که شاید بیودن توان یافت
چو انبوه گشتند بر گرد پیل — یکی باتش گرفت اعضات پیل
دیا خود ستونیست [illegible] — بدین یافتم پیل [illegible] را کنون
یکی بر کف پای او دست راند — خود از پیل زنان نخواند
دگر دست بر نامی پیش برد — چنین گفت کز نیست شکین بخورد

بدوران او دست کوری رسید — تقاص چو دست است گفتا بدو
دگر دست زد بر دنبالش ز خواست — یکی درج گفتا که پیلست راست
یکی سود خرطوم او سودمند — چنین گفت پیل است همچون کمند
امینی به پیشانی پیل دست — زد و گفت بگفت نقاره است
دگر دست بر گوش میسود و گفت — سر دار پیلست شتران بهفت شانت
دگر پشت او سود چون تخت یافت — چو تخت است و میگفت شادان
یکی دم فرو سود بالا و زیر — چنین گفت پیلست همچون نفیر
دگر دست زد بر شکم با ملال — بر آن شد که پیلست همچون جوال
ز کوران یکی یافت فر از خلیل — برایا فسرده دید اعضای پیل
چو کوران سوی شهر گشتند باز — بهر کوی شد هر یکی قصه ساز
بهر کوی یا کوری بشنی رسید — همه مردم گوش گشته مرید
[illegible] کرد این سان — جداگانه در پیل شد دین شان
بتاخیر هم قصه ساز آمدند — براه جدال بر فسراز آمدند
[illegible] ز هر یک دلیل — که اینگونه باید بود شکل پیل
[illegible] برپای او دست سود — برادر وش که پیلست همچون عمود
دگر [illegible] که در جنگ [illegible] بود — بدانند بس کس اشنا بود

رمثی که فرموده بیت بیان — چنین گفت در کشور زنگیان
بی زنگیان پیل را می‌خورند — چنین پیل مانند کرگدنند
چنین ناصحی گفت با بردوان — که در شکند قلعه را پیل جان
شد جای گوهر بحر درج راست — چو پیلست بی جسته داد خواست
رمثی که خرطوم پیل بود — چنین گفت در روز کوپال خود
به بحذ یکی مرده دلیران بند — بر آنست پیلست همچون کمند
کمی گور پیشانی پیل بود — دلیل او بر میان بمردم نمود
که گیرنده بر کاسی نقاره خام — ازان پس صدا آید ای نیکنام
بود جفت نقاره داور بلند — یگانه نوید و شاهان بلند
خود شنیدن پیل معروف نیست — بر اندیس پیل نقاره هشت
رمثی که بر گوش او دست برد — بجای دلیل اینچنین ره سپرد
که پوسته دار و زبر خاشی بیم — بود پیل در پیش لشکر متعلم
دلیران پس پشت او در پناه — سپر سان بود لا جرم پیل شاه
دگر آنکه بر پشت او راه یافت — جا پای دلیل او بدان ره شتافت
که ساز شیب نشنیده بود — [illegible] تخت مستم [illegible]
رمثی که دم دار بود [illegible] — که اندازه پیل تو دانی نهفت

خود شیش شنید نوبر با وبیر — نفس دان که پیلست چنگی نفیر
دگر گفت گوی که حجت مراست — اگر کو سی گو می من بجاست
نفیری چنین داد او را جواب — که من کردنم داد زینگونه تاب
رمثی که گوفت [illegible] ستکی بود گاه — بی میخورد پیل عنبر با جشاه
بود جای گرسی مکان داد حال — نفس دان خوالست پیل از کمال
سخن مختلف گشت در شکل پیل — خداهب جد امد و قال و قیل
به ایشان چنین گفت بیننده مرد — که هر چند اینست درمان درد
شما آنچه گویید ازو اشتهاست — دریا پیل را عضو خواندن خطاست
بچشم خرد ازخت نوری دلیل — بدان نور دیدم سراپای پیل
بزرگان کوران دران داوری — بگفتند تو ملحد کافری
ازان شهر را نور بیننده را — که او کاست کار است نار است [illegible]
فلان ان کونه داند خلق — خداوند دان را براند خلق
ز کوران [illegible] ساری پیل — شنیدند جمعی کثیر و قلیل
مرا معانی که [illegible] که دانا بود — خلاف [illegible] مخالف شنو

بر کنیده دانش مراز [illegible] سرود — ان بوده پیل [illegible] شد محمود

تو مود خود چنان بهشت ستونها | نه با ستون خوانم بس هیچکونها
چنین قول فاخر اطاعت خرد | بود لی تبادل د تفسیر زور
دگر گفت چون راد آمد درین | ستون است چنان شه راست دنیا
دگر گفت باشد ستون چون … | بنا هست چنان آن خرد مند بس
دگر گفت باشد هم ستون استوار | رسد که ابا خرد مند دانش شعار
بود چنین به وجه به بیشک حجج | بنا را بنا باشد ابری نامور

ز خبر به دانش و ریا لب کشود | بود گندم چنان راست و بود
چه گندم بود بهترین نبات | دگر گفت ارزان که و نبات
که چنان سپید است والا بها | سپید است ستان جوا که خدا
سپیدی چو مخصوص جو شد بگو | که نادان جوای است چنان بگو
سپید که باشد دگر گفت چنان | ز نانی است با از جوا رون دلیل
دگر گفت استاد دانا مرد رزد | ز نان خورد بادا است چندان زاد
ز حلوا خورش نیست بهتر دگر | بود چنان حلوا بر …
ز گوزینه زین گونه چون … ا | بحر … بهشت شد …

رسیمان ز زرینه و آهنین | سخن مختلف راندند اندرین چنین
رگوینده زینگونه آمد سخن | چنان است چنان ای … وتن
یکی صندلی خواند دیگر چنار | هم از آهنم نجم را زاد داد

ز زر جبه آمد حدیث دراز | درین باب در شکار در راز
یکی پرزر گفت دیگر رسیم | دگر خواند خلیش ز هیدو سیم

دگر سیه آوازه آمد بلند | چنان است چنان چون و چند در
رسیمین ز زرینه و آهنین | جداگانه گفتند تو این درین

ز زر سینی ترسی ز نیسان حدیث | شنیدند خاقی قدیم و حدیث
یکی از رسی گفت باشد سپید | دگرگ پوست ترک …

… نیکو شد ز دات … | ز … شد در قال و قیل
رسیمین ز زرین دو جو بس سخن | یکه … داستان …

نفس گرد مراد ابلند — به دریا نت سیل [illegible]
ز سیم و زر و روی گفتند باز — جداگانه هر یک قصه ساز

چو الیه در جستی سیل بیش — سخنها بگفتند از دین و کیش
یکی گفت دیگر گفت خام — دگر گفت از جامه و یخ تمام

گروهی ز دانشوران زین سبب — نشستند با هم یکی چند کس
یکی گفت هر سیل باشد روان — برآید از آبست نهری روان
دگر گفت ساکن بود بی گمان — برآید ز خاک زمین سست آن
یکی گفت هم ساکن است و روان — تو غیر هوا سیل را خود مخوان
دگر گفت با چشم دل بس گذشت — برون از این سیل خود انگشت
یکی گفت کو دیده بیست مست — کند مست [illegible] هست
بود خم منبک ذوق زنبیل — پس این قول [illegible] ز رشو الیل
دگر گفت [illegible] سیل و شمی گشت — بجز [illegible] احمد شدن
یکی خوبرنس [illegible] — [illegible] شیشه نازک [illegible]

یکی گفت آن سیل باشد سپید — بود [illegible] چشم بی از امید
دگر گفت هر سیل باشد سیاه — شبستان [illegible] گشتش [illegible] گاه
برآید راحت بود دیده نش — بیاید [illegible] شکوه فهمید نش
بیابان شنایی رفر صحاب سیل — نتابید دادار رب خلیل

تمام آنکه اندر گرد ورد شش — برابر [illegible] آتش ساخت گلشن
چراغ تنهایی را برافروخت — بر پروانه و [illegible] سوخت
ز بسیار آشکار زینا شکارا — [illegible] نهان پیدا تر پیدا
نهان در پرده های آشکارا — نهان آشکارا را دیده داری

ا [illegible] رخش نور محمد — چه کوهان کون [illegible] به موجود
ره ماه صدق او صدیق اکبر — کهی پرتو زد نور شید انور
بحر علی عمر [illegible] آن نور — که [illegible] دیده دل نور
ز [illegible] ذو النورین پیدا — [illegible] پیدا
بود [illegible] علی ز آن نور بیا — [illegible] نور عیسی سلم دانا

[illegible]

بهست از همه هست این چارچیز — سراسر چار دیوار عنا اسیر

نه در غار از عشیر پرهیز — گر آزادی به آزادی بیاویز
خدایا چویان پرستار خدا اند — ز گونا گون کنش کیشان جوانند

سرافرازان کالیموان پرچیس — ازو در نیکبختی بخت بپیس
به بهرام سپهر تیغ نخواست — رخون نکوهش چوبی بر داشت
فروغ الکیی دانش کرده خورشید — شد دشمن از اشکر آن بزم ناهید
و بهیی کردار او را شیر نگاشت — مهین و بهین کاری [illegible] نیابدات
کنشی با دانش او بود انباز — زمهکی سو رجب گرد بو واز

بهر کیش و به هر مذهب رسیدم — ز دانشمند هر کیشی شنیدم
که بنیاد رستی نیک و بدی کاست — که آیین ست دانا گفت راست
بمیر و نیک و چه دشوار دیدم — باسامی صد بیکار دیدم
وی تا بتوانی راست پوشی — ز لوح نفس نقش کاست بر اسی

بزرگی نه ز بزرگان بر جمع — که بود بهی ز نور ظهور المس
جهان را ساز از ارکان دور — چو عنقا جسم او در چشم مستور
بت شد از بینی شکسته — ز محراب و ز بت خارج نشسته
ز ریغ و شادی گیتی گذشته — تمیز دین و آیین در نوشته
چو گنجی کرده کنج غار ماوا — بهمت گشته مار نفس خود را
از آن رو کرده غار کوه ماوا — که بود در راه حق چون کوه بر جا
قسم خورده که نسراید دروغی — نگیرد کذب از نزد فروغی
قضا را بت شد از خود بینی شکسته — ز محراب و ز بت خارج نشسته
ز ریغ و شادی گیتی گذشته — تمیز دین و آیین در نوشته
چو گنجی کرده کنج غار ماوا — بهمت گشته مار نفس خود را
از آن رو کرده غار کوه ماوا — که بود در راه حق چون کوه بر جا
قسم خورده که نسراید دروغی — نگیرد کذب از نزد فروغی
قضا را آهوی بجز روح روزی — گریزان شد ز بیم گرسنه یوزی
پس مرد نهانی جا بکند گذر در — ز ریغ و زحمت و شتم خدا [illegible]
رمی آن نازنین سیاه خونخوار — چو بوت [illegible] تا خست نیاز
رها کرده بال نشان صیه برسید — [illegible] دانش عارف برسید

اگر خبر ز [illegible] چیزی بگویم   جهان باشد گر با میاد دیویم را
بنی معنی کشنده با بر او نشه   غرض صیاد در رهبر جوهر ادکت
اگر گویم کرمن او را نه انم   یقین گویم که سوی کذب رانم
بکمبر باشد از [illegible] بیارم   بلفظ رمز به معنی گذارم
پس از بام سخ اندیشه داد دانا   که آنانی که دیدند آهوست را
زبانی همت با ایشان که گویم بنید   نه یا تا خمره جویان به بویند
کی تو میدهد از وی نشانت   نیوست او من این گویم بجانت
خبر آهوست اگر این در راه بردار   مراد او نویش راز آهو میازار
بدان اکنون که بنیاد هر دو حجت   زبان خود ترجمان لطف و حشم است
ترا ایم در جهان این هر سه حلت   خود اندر بدن صاحب کمالست
بود آهو روان پاک دانا   غرض صیاد ذات است جویا
جواب مستقیمت اعتدال است   که سالم از کم و بیش است ذات است
میان ره باشی تا فرزانه گردی   زکیش ابلهان بیگانه گردی

بگوشش نشنه از خرابات بینشلی   نمی باشد بر ارباب بینشم
بهمان لب تا [illegible] دین جدا است   [illegible] بر تو ذات خود نیست

کرا ز

تب کفاد اهل کشف داند   که از گفتار ایشان در نماند
درون کعبه جابت دیر سازد   ولی در بتکده محض نماز
زنغض جهد بت علت کز نستم   نتوجب ور زشت خود بهشتم
مرا تا زه بسر یم یار دارند   نیازم را خارش یار دارم

براهیمی ویدا آذر نمایی   ترا شید بت آیین روانی
یکی از ظاهر اهان در را دید   برد نمرود راز از حیل نجید
که چون بیهوده سنگی میتراشی   نخ دین را نباخی میخراشی
جوابش داد مردی دانش آئین   که ای نادیده خود هنگامه بین
نبی بیهوده سنگی میتراشم   خداوند جهان را میتراشم
ازین معنی هر تر بت سفت بیار   چو آذر گرم شد هنگام گفتار
اگر که ز داد از دو امیخراشد   خدای خود ز سنگی میتراشد
والبس داد عارف باز از هوشی   که نیود حت میدهم در باب خموشی
آزار بغا ذ [illegible] اد جون خود بر   آزاری داده غیر گشت [illegible]
[illegible] قا ازاد حی د نودنا   [illegible] د مارک [illegible] ادو [illegible]
نز جانی داد را هیچ جا [illegible]   [illegible] از اشکار [illegible]

بعلم خویشتن چیزی کان پسندی — بذات ایزدی بر تر نه بندی
بفکر نوح سنجیده [illegible] — برای خود خدای میبر [illegible]
چه شد گر یک رهت [illegible] — نقیبه [illegible] خدای میپرستم
جوابی گو [illegible] — خدا گو از خورشید [illegible]
بجز ایزد خداوند کس [illegible] — چه میگیری ز راه [illegible] این جا

بگو با من که خود باز کردی — ز جایی نامدی نی ره سپردی
بیاد هستی بایستی موبد — چو موبد دانستی ار کردی موبد
تبه امید فرداری گیتی — خدای لامکان و جای گیتی

گرایی کبک تر کش بسته در کوه — ز بیم باز ساکن بود اندوه
قضا را باز را بهر شکار وحشی — گذار افتاد سوی کوه وحشی
که کبک آنجا ز بیم او نهان بود — چو باز آنجا به پرواز فرمود
بزیر بابی شد کبک پنهان — سبک بد شد و کشتنش پر و بال
بنا چار [illegible] اگر دیر ه روز — شد وحشی آرام جان [illegible]
چو نقش [illegible] سخن [illegible] — بجای پرده [illegible]

وجود کبک از تن باز کردند — ز نا سازی در او دمساز گردند
خرد خندید کبک باز [illegible] — منم گفتا بهای باز [illegible]
بکلی بسته بودم باز گشتم — چو مردم با حیات تا باز گشتم
ز رنج یکدم او باز مهیا شد — بجنگ دوست دشمن [illegible]
هر آنست نیست در مردن تبه کار — هر آن [illegible] بیهوده ز دام و بیدار
ز زنگستان گل بر یک [illegible] — بر [illegible] زنگ در [illegible]
نادان [illegible] — از آن [illegible]

الهی گوهر دانه نمایی — غنی باطن و ظاهر نمایی
[illegible] که خدایی — که تا داند بخبر قدر گدایی
برو زبر تری و در راه [illegible] — بداماد ز خویشان [illegible]
فراز آورد اندازه احوال — فرو تر گشت از اقرار [illegible]
دل [illegible] عزم کو توالی — مراد را [illegible] بسر دادی
خدمت [illegible] یافت — دل از فر [illegible] یافت
[illegible] — دلش [illegible]
[illegible] — بنزد [illegible]

ز دانش بسی گشت دستور شاه	دید از جهان برخود کرده شد
که از دم بکرد از پی کارزار	نه ادم تخت بخت شهریاری
سریر از شه و ران … ماه	چو فرزند شش نبد بعد شهی ماند
سر خود قالب تاج … کرد	سریر شاه را بخشش زحمت کرد
بجد شنید با خود صحبت …	نفضلت کرد باید کرد …
بزد موبدی خنک دان شد	زر و نیکیان و موبدان شد
ز دانای جمل آرام که یافت	ز دانشی به بنیا گوهری یافت
بقول مرشدان ایزد شناس	به دریای محبت آشنا شد
همه گوش بنده تا جام بنکرد	بچرخ ماه نفس او راه طی کرد
بس از خودی بچرخ بر رفت	ز چرخ او بسوی ناپدیده یافت
ازان بس گشت با خورشید انباز	دگر دم کرد با بهرام پرواز
ز انجم چرخ تا هر مرکز کرد	پس از هر فرزی سوی کیوان کرد
دگر بکجا پر شد و از عرش بگذشت	سراسر عالم جهان بپوست
فرو گشت … دید بر رود	به از میکائیل بسته زنجور
بخود گفت … با خدا بود	نبود خویشتن باید جدا بود
ز وخ ایزدی هستی بزدود	… که ان بود بخود

چو زان آمد ز دستان شد بجا	غمی شد زان جدای بخت انا
رسید او از که اکنون با جدای	بسوز آمد ازین اوان خدای
جز این میگفت دیگر باید گفت	بر انهم … ان نفس بهشت آشت
وزان عالم بمنزل کرد دانا	نشیمن تنها یافت بینا
غمی شد که از ایزد جدا شد	سروش گوش او را آشنا شد
که اکنون نیز با ذات خدای	نه بیداری که از ایزد جدای
شبستان غیر یافت بس جا	غمین شد که با حق بیت زنها
که اکنون نیز با ذات خدای	ببیداری که از ایزد جدای
خود گفتش که اکنون بجشای	در انجام نشان بی نشانی
پس از شاهی بدستوریش برد	بگفتا ناحق باز دستور
سروش چوش گفتش با خدای	ز دستوریش ازان پس شد جدای
… بهین اختر را داشت	ز خود نزد یکتا بود جدا داشت
خدا گفتش … نزد اکنون بدان	پس آنگه زان ورفت اکنون
مراد او ابشن … دادند …	سپاس گمایه واندیشه پرسا
چنان داشت که ایزد جدا شد	سروش هوش … همتا شد
که اکنون … سم نه بیداد …	چو بشنید این سخن … باور

چنان کشور خدائیش حکم زود — که گردان چاکری در زدار بود
چنان پنداشت کز ایزد جدا ام — سرودش آسمان که گفتم باز برخوانم
پس از یکچند گشت از جهت یکتا — نماند آن سیم و مال و جاه و دنیا
برافتاد از حصار کدخدای — چو عشاق حقیقی بینوایی
گمان بردایندم از ایزد جدا ام — سرودش آمد نخستین قصه برخوانم
که در هر حال موبد با خدایی — چو عشاق حقیقی بینوایی
گمان بردایندم از ایزد جدا ام — سرودش آمد نخستین قصه برخوانم
که در هر حال موبد با خدایی — مدان ممکن ز ذات او جدایی
به پنداری کس از ایزد جدا ماند — فتاد او ام شد باقی خدا ماند
سخن زین اینکار از سر آیم — خدا موجود خود معدوم مایم
هر آن چیزی که او هستی پذیرد — فروغ اوست زان آتش ناگزیرد
زر از زر شود جز زر نباشد — زر است آن پاره افسر نباشد
سعادت کیش مرد دانش اندوز — شبستان روان زین یافت نوروز
چو دولت دید و بد گشت یکتا — ز تن بگسست و بگذشت از گمانها
سروستان نور دید و جا شد — ز خود بیگانه با حق آشنا شد
به بی چونی بوستان جهنیت — مراد از زنده جاوید اینست

درین فنطوس کردم آشکارا — ز دار آگستان بی انباز دارا
مطول گر نکردم مختصر را — دلی بخشد اشارائم شفاها
نجات اینست در قانون این فن — ز خرمن دانه جو وز دانه خرمن
بنام نامی داراشکوهی — جهانگیر همایون حق پژوهی
خود دیدم سوز بخش سوگوارش — نهادم نام خرم نوبهارش
ز خرم نوبهار از گل بچینی — برادر اقنش عیان تاریخ بینی

یکی کوه دیدیم سر در سحاب — نهان گشته در دور او آفتاب
منجم چو بالای این که رسد — کواکب نه بیند نه بند رصد
اگر کوه باشد زمین را وتد — ستون فلک گفتش این را سزد
ز بس بود وسعت و رفعت این کوه را — برافراز او لا خلا لا ملا
کناری ماد آخرش آشناست — بچشم جهان سدره المنتهاست
فلک مرغزاریست در پای او — ستاره گهی سنگ در پای او
اگر خود بره راهبر که برد — عجب نیست گر با حمل هم چرد
ز خوشه سنبله خوش گذشت او — روان حوت با ماهی آب جو
بانگ که از این ره رصد — رصد تا نه آید روان بر بلند

شبها چو بکشی … شب کند   هوای خنک گرم از تب کند
مرضها که در طب … است   دوای که در طب پدیدی خطا است
بکر آب او آب کشمیر بود   که در پیکر افکند دق میر بود
اگر بود در کربلا بر شهید   ز لب آبی اینجاست زآب مزید
ملک … کشته بن   روان گرم از آهنگ در بدن
زداد است بیداد در شهر داد   کسی داد گرفت جز آب جو
درین بوم … دیوان تن   بجا کیسه نخواه کرده کفن

بر مردم سنگدل کرده جا   زکاه و بره نام آن که سما
دو پیکر ز شمشیر ایشان …   کمان را اگر قوس … رسد
ز آب روان بگذرد گر یکی   نباشد به از تیر شان ناوکی
نداند کس را خدا … تاج   بخورشید از مهر داد … باج
یکی دیده … و …   ز غفلت … آشنا
بحق خواندن …   نشاید که فرمان دهند …
همی تا مسلمان نخوانند …   مسلمان … گیتی …

همه آدمی زاده گندم برده   چو آدم ز بهشت ان ایزد …
ز … فی بار سام دوزن   هر گرده … خلیل بدن
ز بسیاری کرس … زنده‌اند   ز مردن همه بیشتر مرده دار
مسلمان … دو … نان   بیکجای از جوع خوردند نان
ز قحط از … هر دو کران   مسلمان … خوردند نان
شده … اکنون مصلی طراز   چو نان … مهر نثار
شد از دانه سبحه آشفته   مسیح زرده دست بر کوفته
بجای … روزه بد استوار   شده فارس شهر … سوار

زر و سیم … یک دیده تر   بجز قصه رستم و زال زر
همانا کاین قوم بد گوهرند   که الماس … پرند

موذن … از …   ایا نفس … حک
پر سینه … از … حک   شده … گفت ک
با … گیتی پناه   به دار … این سپاه

خداوندا تا مهر و ماه آفرید | بجز بوعلی آنجا سپهبد که دید
بتوسن بد شیر بزدای دست | بجز بوعلی انجا که از دانشست

بلشکر هندوان جسم پرور | مسلمان وار سایم گشته بکبر
رت پیدا از جب چون حق برتان | بیاد دو دست بی رنگ دوستان
زکردار زمان همه سایه حقبند | زر با مجلس دار شب بخفتند
یکی را خارکش تن کرده بیدار | دگر از آتش اژدر ختنه نار
بغیر از ابکه آسبی کو ارا | بشک کس بدر دشب پیدا
بزرگانی که از اهل تمیزند | ز فضل خویش در مردم عزیزند
بغیر از کند رنگ شهری ند اهند | بجز از کائنات جو بخواهند
بغیر از کائنات جو بخواهند | بجز از کنند رنگ شهری ندارند

در لشکر گویمش بکس از زبان انسان است | این شد سنه و شیه که شهر ز مضافات است

بر درگهش چون رسیدم | صد هند دران سواد دیدم
همه دیده و بساحت مطلق ازرد | دیگو سواد اعظم از تو

هرگوشه سواد اعظم مو | گیتی دیری رخان دران کو
سرای سران بیافتاده | مسکینا با بران نهاده
از جان جبین و نقش از رنگ | خاک مترات لوح از رنگ
از اشک جو باده جو ملتان | وز زردی چو گل زمین گلستان
از بجده هندوان دو در سنگ | شد خاک سیاه از شفق این رنگ
آن گنبد نور بخش انجم | از پیکر کش جرح هفتم
از سنگ ابد بنای گنبد | وز رنگ ازل صفای بستند
گردون گردان بگرد فرشش | مست جنگ باران بدور عرشش
خورشید فروغ چتر گنبد | در آینه فلک جو بید
از پرتو و فیض ایزدی نور | گنبد شد رنگ قلعه طور
گوئی شده مو آن تماشا | نی ساخت شکسته مرغ صارا
کنش است بزیر این نه ایوان | خورشید روان و جسم کیوان
والای وجود [illegible] سد و رند | کالای سواد اعظم هند
کس [illegible] زاد آشنای | رخشنده روان روشنائی
چشم شب قدر راحت آموز | جانش نور و روز دانش افروز
او گوهر کان حسن کامل | جنبش شده جان حسن کامل

کنش است سواد سودمندی / ابر دانش طراز نقشبندی
زان روح رسید منت فراست / چون عقل بدست کنش رام است
موبد حرم از مقام آرام / در حضرت کنش رام [illegible] رام

شنیدستم که پور مردی از راه / بسوی باغ خویش آمد سحرگاه
در آن بستان مرغی جلوه کردید / دلش پرواز او را بند کردید
بدستانش بدام آورد انجام / بدانست او که انجام است این جام
روانش ناز تن آمد بپرواز / که بود دشت بسوی کار دکنه باز
گرامی مرغ کش سیمرغ بنده / سزد با او چنین گفتا بخنده
ترا سیری نخواهد بود از من / که هستم لاغر و زار و فرودین
مرا گر واهلی بر مرز هشتن / سه پندت میدهم در باب کوشش
یکی اکنون دو بر شاخ صنوبر / بباغ راستی از سرد خوشتر
که پور در پذیرفت آن سخن را / چنین گفتا بر ستار چمن را
محال است ایا باید کرد باور / اگر چه گفت باشد نغمه ای شکر
چو از دست که پور کرد پرواز / بسوی شاخ صنوبر شاد شد باز
بهمه چیزی که ممکن نیستش هست / بسوی او خسرو دل تا فتش نیست

چو بر شاخ صنوبر شد بگفت / که چون از چنگ تو بگریختم جفت
مرا خود در شکم چون بیضه ناز / دری باشد که او را هست انباز
اگر [illegible] من می گشودی / مران [illegible] بالک تو بودی
که پور زین خبر شد از رشتن او / که هر چه خواست گیرد از تن او
زبان بر لابه کرد و گفت طرای / بلفظ من [illegible] اسای فردا
ز نعمتهای گوناگون که دارم / بر چینت بیشکار اسا بیارم
وزان پس هر چه خواهی بخشدای / نشاید گر بسنده رفتن ازین جای
خردمند مرغ جسته از بند / که ای بی بهره از فرهنگ و [illegible]
بگفتم انچه عقل نیست مپسند / بگفتار چنین دل را مپیوند
مرا چون در شکم آن در در آید / که آن از حجم اندام افزون تر آید
دوم گفتم [illegible] از رفتن [illegible] / بگفتم هر چه شد [illegible] دل در کن
[illegible] آمدن بهر چه گویی / نیابی انچه گفتم آن بجویی

یکی دانشوری سید آکنش بود / بگاه علم راه کرد ببود
کفرم [illegible] / بشب بردی [illegible]
[illegible] بخشید و فرمود / که چون جام از بد جسم اکنون

شاید جامه این جامه بردن | مدان از جامه‌ام تن راست بردن
کفن دزد از منش والا پسندید | ز نسل او سری خانه بپیچید
چو دانشمند از کوچه بخویش | [illegible] آمد کو زنده مرد کو را [illegible] پیش
کفن دزد این خبر بشنید و بشتافت | بشب هنگام در آمد گور او یافت
درون گور دانشمند را دید | که [illegible] شه زان بد عهد رنجید
بخواهر زید دزد و گفت ای دادای | مرا [illegible] وی تو [illegible] بگشای
بلند [illegible] من داد [illegible] | چو [illegible] این سخن از دزد [illegible]
بدش چوبی بردن انگشت [illegible] | در [illegible] امی از چوبی [illegible]
بدو گفتا خود [illegible] این چوب | پسند [illegible] راست داد [illegible]
بکف [illegible] دزد این چوب [illegible] | [illegible] هنر و [illegible]
بهر جا بود جائی نامدار [illegible] | بزرگی مرده [illegible] زنده [illegible]
[illegible] | بروز آن روزه و [illegible]
[illegible] | بسوی خانه [illegible] تو انگر
به پهلوی توانگر خانه دید | در [illegible] از تو بیگانه دید
زنی را یافت [illegible] کرده [illegible] | ز [illegible] دیگران [illegible]
[illegible] اطفال گریان | بر ایشان [illegible]

[illegible] آنار | کنون رفت از برای چیز بازار
برنج آرد و مال [illegible] نخواهید | برای خورد جان [illegible]
همه زبان بگفتند آن عزیزان | [illegible] زر [illegible]
که حکمت چیست در کار تو امشب | زنش [illegible] چنین آورد بر لب
که ما خویشیم با مرد توانگر | و [illegible] حصه مانند ما از زر
چو چیزی نیست با اطفال گفتم | که آرد [illegible] از بازار [illegible]
[illegible] | ازین کاشانه کوشان [illegible]
بخود دزد گفت دزدی مرد [illegible] | بدزدی زین اسیران [illegible] بردار
ترا امید راستی نیست بد کس | کرم را [illegible] کردار خود کس
[illegible] بینی آشکارا | چنین دزدی کرم را [illegible]
بشب در خانه مرد توانگر | شد و آورد بیرون کیسهٔ زر
همان شب [illegible] | بدیشان داد [illegible]
[illegible] | [illegible] سبز برگ و تازه و تر

در دزدی [illegible] | [illegible] امید
[illegible] | [illegible]

زنخوق مبدع خود در نکه دیو
بپای آسمان این کرد

منزه چرخش از کون و فساد است
بری زآلفت پیو [illegible] گشا

چو رفتار سپهرش مستدیر است
نخواند مستقیم آنکو حقیر است

درخشان کوه تا سنده سیر است
سیاهی از فروغ هور دور است

رئیس عالم بالاست خورشید
امیر و سید اعلی است خورشید

منیر و قاهر و زاهر زنور را
امام و پیشوای چرخ دوّار

حکیم و فاضل و اولاد قدسی
سترگ و مهتر و راعی دوری

نمود هور از نور اله است
سعید و هادی و نعم المسیح

بچارم چرخ باشد جایگاهش
شه است او اختر گردون سپاهش

سر دیش زنده و دانا ست خورشید
ز نور خویشتن پیداست خورشید

امام و حاکم چرخ مدوّر
مجسم روحی و عقل مصوّر

ولیعهد وجود مطلق آمد
عقیده شو امام بر [illegible] آمد

خرابنا رست و جنت یار هما
زجود موجد خود گشته یکتا

ز نور دیش نبستان وجود است
ز دو کلشن و بستان شهود است

ز نورش نور یزدان آشکارا
[illegible] ش از انکو نهان [illegible]

عزیزی از وجود بخت ایزد
ز جود او شهود و بود و موبو

مشتاد اکش از زنگ تباهی
بود نور خدا ظل الهی

مجدّد ارونی چون علم ایزد
نکوخواه جهان چون صبح

زخیلد او پدید انوار داهر
وز و انوار اعلی پایه با سر

وجودش خیر محض و محض خیر است
مخیّر خیر را زاتر و نه سیر است

به پیکر نور را پیرایه داده
زنورش بود نی را مایه داده

تن اما صورت روح آشکارا
به پیکر هوش و از ظلمت مبرا

زنور خود نشان نوران هور باشد
نه نور او پلنگ نور باشد

که باشد سقف قصرش عرش اعلی
بشیخی بهر او کرسی والا

ثوابت نابتان پیشکارش
روان چابک پرستان بکارش

زروح اختران آسمان راست
کمال آخشیجانی جهان راست

رسیدش روزی بالانشینان
فروغش بهره پستی گزینان

ز رای او [illegible] رای هندی
وز و پیرایه آرای هندی

کیانی پا [illegible] وان [illegible] ظهور است
کی کیهان کیا اختر ز نور است

کیاست پیشه دارا چو جعفر است
زکیوان یافت در حکمت ریاست

ز جعفر [illegible] سابر جنبش خرو [illegible]
سکندر دانش و دارای تدبیر

بپهر موبد دانای علوی | بسفلی قاضیان دارای علوی
ستوده قیصر روم و ریاست | چو هرمز هر کس مدارک ریاست
وزارت شاه کردن داده او را | وقوف سر نجون داده او را
زهور او مسیحا بسی چرخ بهرام | چو توریش ترک و جانان جهان را
بمهر مهر آسود ملک هور | بفغفوری و خاقانیش منشور
ز خورشید کی شادی جای ناهید | غنیان فسیح را ز دست امید
طراز مهر و شادی ز دانش | صفای روی شاه آبی صفا خوش
عطارد را عطا خور کرده خام | بدان موبد لسرا ز و تیر نام
دبستان پهری ز و هنر جوی | بدو دارند دانش کوهران روی
به پیشکار هور شاه است | کزین راز داران سپاه است
سوار چیست و چالاک و تنومند | لوند چابک دگر و خردمند
تقرب جسته از وی بکه خدمت | ز خور پرورده انوار حکمت
کمال هور و سیر از خور که دانند | جز و در خور شاه بجهت که خوانند
وان جهیج ولو زهشت مینو | شه هر هفت کشور شاهی کو
حواس خمسه را فیض از خورش | اساس چار ارکانست نوازش
سه فرزند از فروغش نور دیده | دو گیتی از وجودش آفریده

زنگه داد و رستی پدیدار | بی جفتی و انبازی نمودار
جهان شاه و روان خسرو و جودش | فروغ ایزدی باشد شهودش
فروغ گوهر دادار پاک است | گرد دورش سپهر و تیره خاک است
ز خورشید ارشوی آگاه موبد | جز او کس را نخوانی شاه موبد
شهان آخشیجان بنده او | ز ردی بندگی افکنده او
ز مهر او کلاه آبادیان را | سریر از وی سپهر والا دیان را
از و شایان شاهی گشته شایان | وز و یاسانیان بر تخت پایان
ز فر او شهی کلشاهیان را | مهی ز و بیشدادی و کیان را
وز و دراشکانیان گیتی ورا سان | وز و ساسانیان موبد هراسان
بدر کاهش مجاز شهریاری | ز چابک مذهبان بیشکاری
وز و یکچند تازی تازیانه | زده بر پشت اسب خسروانه
بشاهی گشته از خورشید خرسند | سرا است امیرزاده یکچند
وز و سال و زمر چار هنگام | وز و باشد روان دین آزرهید
ز مهرش ارمغانشان چرخ ز دوش | ز خورشیدش دشت و کوه و راغ گلشن
بشیند ادعا هر گشته شید ا | وز کابی لیکان رویان پیدا
برآورد دشش و شبهای آدم | ز مهرش راستی و راسته از عم

زنم

زفیضش سبز کوه و باغ و صحرا | زمرد کاشت کو گمی چرخ مینا
حیات دیو و حیوان از وجودش | وجود آور روان بخشش است جودش
بچشم مردمی در خانه بود | نظیره جود رستکر بنیست [illegible]
بهره می پذیرد مه ز تو نور | بسال مه کند ظلمت ز [illegible] دور
مهین دربان درگاه تو ماه است | [illegible] دودمان آب و جاهست
زتو خیرات راستی و ناخیر | نگار و نیکو سپهای تراتیر
عطارد کاتب مدحت نگار است | ستایش بشنو و پیشکار است
تو شادی بخش و بزم آرای ناهید | زتو دارد بخشش دستور امید
بهمداد سپر از تست بهرام | زتو برجیس سعد اختر و آرام
کیاداری چو کیوان پیشکاری | فراز بام هشتم پرده داری
بگوهر اختر ستان خانه تو | درو باشد دو دستش کاشانه
بهر کاشانه بزمی دگرگون | سپهر آیکی ز دادای شاه [illegible]
زدادت کشیر کاد خوشه یکجا | بداشت سبزه و جوبان [illegible]
فرازین آسمان چتر سر تو | ز اطلس پرده خورشید بر در تو
ولی عهد خدای بی [illegible] | [illegible] کرسید کانات را نوازی
وجود خود وجود [illegible] موبد | پرستار سرشت اخلاص موبد

بپیچ اندر که داری در جهانش | بردن از ز بخشش وجود زمانش
بعلم اندر وختی یا [illegible] ده اورا | موفق کن ز فیضش حب دورا
نکو دار بخشش کنش فرخ للنش ساز | گر [illegible] نوکرامانت [illegible]
کسادکار او را دار آهنگ | مدارش در حصار عنصری تنگ
سازش هیچ محتاج خسیان | تو همی چون افروز [illegible]
خطا لاف باش اورا عطا کن | روان بخشی روان خواهد اورا [illegible]
ز آفات تن و جانش نگهدار | چو از تن رست پیوندش با نوار

تمت الکتاب دیوان شاه موبد

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

فصیح الدین بلخی

احمد یوسف

فصیح الدین بلخی انیسویں صدی کے اواخر کے آدمی تھے (پیدائش ۱۰ فروری ۱۸۸۵ء) انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے امتیازی شان سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ والد کی وفات کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک پونا ملٹری اسکول میں معلم رہے، پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک فورٹ ولیم کالج میں معلمی کی۔ اس کے بعد جزیرۂ فجی کی عدالت عالیہ میں بحیثیت مترجم بحال ہوئے۔ لیکن خرابیٔ صحت کی بنا پر وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے اور وطن واپس آ گئے، یہاں کوارٹر کورس کا امتحان دے کر ملازمت شروع کی۔

فوجی ملازمت کے سلسلے میں پہلی جنگ عظیم میں سیریا، مصر، فلسطین، دمشق، بیروت اور بیت المقدس وغیرہ میں رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر اس نوکری سے استعفا دے دیا۔ کئی برسوں تک سخت معاشی بحران میں مبتلا رہے۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں ریاستی سرائے کیلا میں REVENUE OFFICER اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے بحال ہوئے اور وہاں سے ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ مخطوطات کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے۔

تالیفات:-

۱۔ **تاریخ مگدھ** : سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۴ء۔ ۲۰ ابواب پر پھیلی ہوئی ۴۶۹ صفحات پر مشتمل صوبۂ بہار کی یہ تاریخ ۶۶۳ ق۔م سے شروع ہو کر ۱۹۴۳ء پر ختم ہوتی ہے۔

۲۔ **انشاد شاد** : قومی پریس بانکی پور، ۱۹۴۰ء۔ ۲۲ ص۔ شاد عظیم آبادی کی شاعری کے نقائص بتائے ہیں۔

۳۔ **تذکرۂ نسوانِ ہند** : شمسی پریس پٹنہ، ۱۹۵۶ء۔ ۳۲۵ ص۔

۴۔ **تذکرۂ ہندو شعرائے بہار** : نیشنل بک سنٹر، ۱۹۶۲ء۔ ۱۶۹ ص۔

مقدمۂ کتاب کی تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء (مصنف کا انتقال ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوا) صاحبزادہ

ناظم بلخی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی مورخہ احوال غروری کے عنوان سے فصیح الدین بلخی صاحب کی مختصر سوانح عمری کا اضافہ کیا جو ایک تصویر بھی شامل ہے۔ اس میں ۱۲۰۰ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کے بہار کے ۱۳۱ ہندو شعرا کے حالات مع نمونۂ کلام (اُردو فارسی) کے درج ہیں۔

رسائل میں شائع شدہ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) شوق قدوائی اور شوق نیموی کا ایک شاگرد۔ شائع شدہ 'کوئل' ڈالٹین گنج اپریل ۱۹۶۲ء (۲) امیر مینائی 'صبح نو' اگست ۱۹۵۸ء (۳) مخالفت قیاسی 'اشارہ' پٹنہ مارچ، اپریل۔ (۴) اطراف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام۔ 'انسان' پورنیہ نمبر ۱۹۵۶ء (۵) روزنامہ و سال کی سرگزشت 'تہذیب' دسمبر ۱۹۵۲ء (۶) عظیم آباد کا ایک جوانمرگ شاعر 'تہذیب' اگست ۱۹۵۴ء (۷) اُردو قواعد و لغات کی تدوین 'تہذیب' اپریل ۱۹۵۳ء (۸) تاریخ شعرائے بہار کا مؤلف 'اشارہ' فروری ۱۹۵۹ء (۹) اجاگر چند الفت 'اشارہ' جنوری، فروری ۱۹۶۰ء (۱۰) پلاموں کی تاریخی سرگزشت 'کوئل' ڈالٹین گنج، ستمبر ۱۹۶۱ء (۱۱) شبلی نعمانی 'صبح نو' اگست ۱۹۶۱ء (۱۲) موسیقی اور شاعری 'مصدر' پٹنہ جولائی ۱۹۵۶ء (۱۳) راسخ عظیم آبادی 'صنم' پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹ء (۱۴) امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قبریں 'صبح نو' مئی ۱۹۵۸ء (۱۵) فدوی پر ایک مسدس 'معاصر' پٹنہ ج دوم ۱۹۵۴ء (۱۶) راجہ رام نرائن موزوں 'اشارہ' پٹنہ جنوری ۱۹۵۹ء (۱۷) سرقہ اور توارد 'اشارہ' پٹنہ (۱۸) صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت 'نگار' لکھنؤ (۱۹) عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر 'صدائے عام' خاص نمبر (۲۰) عظیم آباد میں شعرا کے مزارات 'ساحر' جنوری ۱۹۵۸ء پٹنہ (۲۱) وحشی علی جبرتی 'اشارہ' جنوری ۱۹۵۴ء پٹنہ (۲۲) **نواب امداد امام اثر** - (۲۳) منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد 'ندیم' بہار نمبر گیا ۱۹۳۴ء (۲۴) قلعہ رہتاس کی تاریخ 'ندیم' گیا (۲۵) مثنوی گوہر جوہری 'اشارہ' پٹنہ (۲۶) شوق نیموی 'اشارہ' دسمبر ۱۹۵۸ء پٹنہ (۲۷) مولوی شجاع الدین 'صبح نو' پٹنہ۔

فصیح الدین بلخی کے وہ مضامین جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں۔

۱- علی ابراہیم خاں خلیل (؟) ۲- مُلّا غلام یحیٰی بہاری۔

ان کے کچھ اہم ریڈیو ٹاک درج ذیل ہیں:-

۱- صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت ۲- بہار شریف کا میلہ ۳- محمود گاواں
۴- ملک محمد جائسی اور پدماوت ۵- اکبر کے نورتن میں فیضی اور ابوالفضل ۶- تاریخی کتابوں کی بطور مآخذ اہمیت۔

فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱- علم نجوم (سائز ۵ × ۱۰، صفحات ۱۰۹ ۲- تحریک وہابیہ بہار میں THE WAHA-BI MOVEMENT IN BIHAR ۳- آثار بلخیہ ۴- آثار قدیمہ ۵- دستور نجو

غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیل:

۱- علم نجوم (مخطوطہ)

باب اوّل

۱- فصل اوّل: تعداد اسمائے بروج ۲- فصل دوم: حالات بروج ۳- فصل سوم: درجات بروج ۴- فصل چہارم: زمانہ وقیام بروج ۵- فصل پنجم: تعلقات بروج۔ ۶- فصل ششم: نوالسا ۷- فصل ہفتم: اعداد بروج ۸- فصل ہشتم: خواص بروج۔

باب دویم ــ منازل یعنی نچھتر

۱- فصل اوّل: تعداد واسمائے نچھتر ۲- فصل دویم: بیان حروف متعلقہ نچھتر ۳- فصل سویم: خواص نچھتر۔

باب سویم ــ تاثرات

۱- فصل اوّل: ایام اوقات ولادت ۲- فصل دویم: خاصیت ماہ تولد ۳- فصل سویم: خاصیت ہجری ۴- فصل چہارم: خاصیت تاریخ یعنی تتر ۵- فصل پنجم: خواص روز ۶- فصل ششم: خواص نوالسا ۷- فصل ہفتم: خواص کرن۔

باب چہارم ــ ستارگان

۱- فصل اوّل: تعداد اسمائے ستارگان ۲- فصل دویم: حالات ستارگان ۳- فصل سویم: دوستی و دشمنی ستارگان ۴- فصل چہارم: خواص ستارگان ۵- فصل پنجم: سختی و نرمی ستارگان ۶- فصل ششم: مدارج ستارگان ۷- فصل ہفتم: جمعیت واستقامت ستارگان ۸- فصل ہشتم: صورت وسیرت ستارگان ۹- فصل نہم: خواص ازروے مدارج ستارگان ۱۰- فصل دہم: تعلقات ستارگان

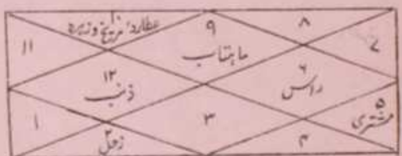
باب پنجم

۱- فصل اوّل: طریقہ کنڈلی بنانے کا ۲- فصل دویم: حقیقت طالع ۳- فصل سویم:

امتحان صحت زائچہ (الف) امتحان اوّل۔ پدر مولود و قمر کا۔ (ب) مکان پیدائش (ت) امتحان مکان نو۔ (ث) امتحان تعداد عورت زچہ خانہ (ج) امتحان چراغ زچہ خانہ (ح) امتحان چارپائی حاملہ (خ) طریقۂ دریافت بابہ (د) امتحان صحت پرسن کنڈلی (زائچہ سوال) ۴۔ فصل چہارم: اقسام خانہ ۵۔ فصل پنجم: منسوبات دروازۂ خانہ ۶۔ فصل ششم: سرخی مداسج ستارگان ۷۔ فصل ہفتم: خواص ستارگان مطابق دروازہ خانہ۔

مجموعی طور پر اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب میں علم نجوم سے متعلق رموز و نکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جابجا ڈائگراموں اور جدول سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اگر کبھی یہ کتاب شائع ہوئی تو اُردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہوگی۔

زائچہ پیدائش جو بلخی صاحب نے خود ہی بنایا تھا



۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز چہار شنبہ ۳ بجے شب مطابق پھاگن بدی ۱۹۱۰ سمبت۔

۲۔ **تحریک وہابیہ بہار میں:** یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس میں کل ۲۳ ابواب ہیں۔ ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) The Wahabi Creed (2) Patna Made a centre of the movement (3) Character of Patna Muslims (4) Patna Maulavis Join Syed Ahmad (5) The doctrine of Hijrat (6) War on the Frontier (7) The Balakot disaster (8) Maulavi Nasiruddin's defeat of Ghazni (9) Wilayat Ali and Enayet Ali as leaders (10) At Kanpur (11) Resumption of activities in 1850 and Sermon in the Fort of Delhi (12) Non-cooperation, Passive resistance and Paralell Government. (13) Enayat Ali against the Britishers (14) Arrest of Wahabi leaders in 1857 (15) British Military expedition to the frontier (16) Maulavi Abdullah resumes leadership (17) Ambala Trial of 1864 (18) Patna Trial of 1869

...confiscation of Properties and destruction of graves ...) The After-Math (21) Arrest and convictions of Amir ...han and Hashmat Dad Khan 1869-70 (22) Indiscrimi...nate Proceedings (23) Release in 1884.

علاوہ ازیں قبور کے گھروں اور قبرستان کے نقشے وغیرہ خصوصی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
کتاب کے پڑھنے سے برٹش سامراج کے مظالم کی بڑی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے ہیں جو ۳۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ کمپنی نئی دلّی سے جلد ہی شائع ہوجائے گی۔

۳ - آثار بلخیہ :۔ بلخی صاحب کی یہ تیسری غیر مطبوعہ کتاب ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے مادۂ تاریخ ۱۳۶۹ھ نکلتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں بلخی صاحب کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم ادھم بلخی، مولانا شمس مظفر بلخی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی جیسے نامور اولیا اور ان کے خاندان کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ اسی خاندان بلخیہ کا نسب نامہ بھی ہے۔

اس کے بعد کے باب میں شہر بلخ کے حالات اور حضرت ابراہیم ادھم بلخی کے واقعات ملتے ہیں۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'بلخیوں کی ہندوستان و بہار میں آمد'۔ آگے ایک چھوٹی سی سرخی ہے 'بلخی شاہزادے کا باغ'۔

چوتھے باب کا عنوان ہے "مولانا شمس بلخی"۔ پانچواں باب ہے 'مولانا برہان الدین شمس مظفر بلخی'۔ چھٹے باب کی سرخی ہے حضرت حسین ملقب بہ نوشہ توحید بلخی۔ ساتویں باب کی سرخی ہے مولانا حسن بلخی۔ آٹھویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم احمد بلخی ملقب بہ لنگر دریا بلخی'۔ نویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی'۔ اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی ذکر آیا ہے اور لکھا ہے کہ حافظ بلخی، مخدوم ابراہیم بلخی کے منجھلے بیٹے تھے۔ آپ ہی کی اولاد ہے جو خانقاہ فتوحہ کا نظم و نسق دیکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم شاہین بلخی، مخدوم محمود بلخی ابن ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے۔ دسویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم درویش بلخی'۔ اس کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں۔ ان کی سرخیاں یوں ہیں: "مولوی محمد ابن قاضی طہارت التوحید بلخی و مولوی حمید الدین بلخی متخلص بہ اوج"۔ یہاں پر کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا یعنی اس کے بعد کے لوگوں کے احوال لیکن اسے موقع نہیں ملا۔

الدین بلخی کا نسب نامہ پدری

حضرت عبد مناف
حضرت ہاشم
حضرت عبدالمطلب
حضرت ابو طالب
حضرت علیؓ
حضرت امام حسینؓ
حضرت زین العابدینؓ
حضرت امام علی اصغر
سیدنا قاسم
امیر سید محمد
سید زید
سید اسحٰق
سید احمد
سید یعقوب
سید محمد
سید نظام الدین
سید ابو سلیمان
سید سلطان ابراہیم ادہم بلخی قدس سرہٗ
سیدنا محمود بلخی
سیدنا شرف الدین بلخی
سیدنا سید الدین بلخی
سیدنا اسلمیٰ بلخی (۱)

---

(۱) سیدنا شمس الدین بلخی
(در زمان سلطان محمد تغلق شہید شد در دیوان ... بلخی)

مولانا قمر الدین بلخی — مولانا سید عزیز بلخی (خلیفہ مخدوم جہاں بلخی) — مولانا امین بلخی

حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی
مخدوم حسن بلخی فردوسی
مخدوم احمد لنگر دریا بلخی
مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی
مخدوم شاہین بلخی
مخدوم ابراہیم بلخی
مخدوم عبداللہ بلخی
حضرت دیوان معین الدین بلخی
حضرت دیوان معمور شاہ بلخی
حضرت دیوان فخر اسلام بلخی
حضرت نسیم اللہ بلخی
قاضی سید عبادت اللہ بلخی
سید واحد بلخی
مولوی سید ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

حفیظ الدین بلخی — عزیز الدین بلخی — نظام الدین بلخی — فصیح الدین بلخی

نادم بلخی

فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ مادری

ملا رکن الدین منیری از اولاد حضرت مخدوم
تاج فقیہ در قصبہ منیر شریف

ملا عبدالشکور
ملا عبدالحکیم
ملا عبدالحلیم
ملا عبدالرقیب
ملا غلام اشرف
ملا غلام یحییٰ
قاضی کمال الحق
قاضی امین الحق
قاضی واعظ الحق

مولوی سید حمید الحق — بی بی مدینہ زوجہ امیر الدین بلخی

بی بی باہرہ زوجہ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

حفیظ الدین بلخی — عزیز الدین بلخی — نظام الدین بلخی — فصیح الدین بلخی (۱)

نادم بلخی

(۱) فصیح الدین بلخی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی لاولد زیادہ دنوں تک بقید حیات نہیں رہیں، دوسری بیوی سے تین اولاد ہوئیں، جن میں صرف ایک نادم بلخی رہ گئے۔

۴- **آثار قدیمہ** : اس کتاب کا ذکر فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب تاریخ مگدھ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ مخطوط مجلد ہے اور خوش نویس کی تحریر میں ہے۔ سائز ۸ × ۱۲ ہے اور صفحات ۲۴۳ ہیں۔ اس مجلد مخطوط میں کل ۲۶۰ سرخیاں اس طرح ہیں : "عظیم آباد کے جغرافیائی حالات۔ گنگا ندی، سون ندی، پن پن ندی، موربر در دیا ندی، پھلگو، متھواس میانہ اور شکری ندی، پہاڑی، عام کیفیت، نباتات، اثمار فصل ربیع، گوبی، آلو کی کاشت، اشجار وثمر۔

قصبہ منیر کا حال : ۸۹۷ھ کی مسجد، لنگر قلی خاں کی قبر ۹۸۳ھ، بڑی درگاہ اور سند ھدر کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۴ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، مقبرے کا کتبہ ۱۰۳۶ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، مخدوم دولت کا مقبرہ، شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷، مقبرے کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ، قصبہ منیر کی مسجد ۱۱۰۳ھ، دوسری مسجد کا کتبہ ۱۲۱۲ھ، بعض مشاہیر کا ذکر، شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ، قصبہ داناپور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ، شاہ محمد اکبر ابوالعلائی قدس سرہ کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۲۳۴ھ، لان سے شاہ درگاہ ارزاں تک، باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ، تبارک علی کی مسجد ۱۲۰۵ھ، ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پر لگا ہوا ہے، ۱۰۴۰ھ، میں یہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ اجالت خاں کی مسجد ۱۲۲۴ھ، مسماۃ نورن کی مسجد ۱۲۲۳ھ، بھکنا پہاڑی، درگاہ شاہ ارزاں سے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ، درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲، شاہ سجاول کا مزار ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۱۳۳ھ، شاہ لبسنت کا مزار ۱۱۵۸ھ، شاہ کرم اللہ کا مزار ۱۱۶۱ھ، شاہ غلام حسین کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کریم بخش کا مزار ۱۲۵۲ھ، عباد اللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۰ھ، کتبہ عیدگاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۰ھ، شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ

نمونیہ سے پچھم دروازے تک : پختی سڑک انگلش روڈ کے انحراف کا حال، شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، کتبہ ۱۹۲۷، ایک لامعلوم شخص کی قبر اور گنبد، ڈنکے کی املی کی مسجد ۱۱۹۶ھ، ایک اور مسجد، ایک لامعلوم قبر اور گنبد، مسجد ۱۲۱۷ھ شاہ باقر کے تکیے کا کتبہ، شاہ حمزہ علی کا کتبہ اور مزار ۱۲۲۶ھ، شاہ کالے کا مقبرہ ۱۱۲۴ھ، لان کی مسجد ۱۲۵۸ھ۔

عدالت کے احاطے میں میجر فاکس کی قبر ۱۷۶۴ء، بی بی ماں کی مسجد ۱۲۱۲ھ، بی بی ماں کی قبر ۱۲۲۵ھ۔

مرادپور، خدابخش لائبریری، مرادپور کی مسجد ۱۲۳۳ھ کا کتبہ، حمام کا کتبہ ۱۲۴۹ھ، پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے مکانات، انجینئرنگ کالج، گولکپور کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خادم علی کی مسجد ۱۲۵۸ھ، تاجو کی مسجد ۱۲۱۴ھ، ۱۲۸۲ھ کی مسجد، پتھر کی مسجد ۱۰۳۶ھ، موہن ڈفالی کی مسجد ۱۲۶۳ھ، ایک انگریز کی قبر ۱۸۲۰ء، جلالت خاں کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۶ھ، حاجی چاند کی مسجد ۱۲۵۲ھ، بی بی لطیف کی قبر کا کتبہ ۱۲۷۶ھ، گلزار باغ میں اثنا عشریہ کی مسجد ۱۲۶۱ھ، شیخ و تیغ علی کی مسجد ۱۲۵۵ھ بی بی مراد بخش کی قبر ۱۲۵۸ھ، شاہ عالم بادشاہ کی جلوس گاہ ۱۲۶۵ھ، پیر بخش ۱۲۶۵ھ۔

لودی کٹرہ سے خواجہ کلاں گھاٹ تک: تکیہ شاہ کی قبر ۱۲۵۷ھ، حسینی بیگم کی قبر، مسماۃ جعفری کی قبر ۱۲۰۳ھ، دولی گھاٹ میں بی بی مخدومن کی مسجد ۱۱۹۰ھ، جانی مسجد میر ابراہیم کی قبر ۱۱۹۹ھ، شیش محل کی دوسری مسجد ۱۲۶۴ھ، دلنریز کا پشتہ، میتن گھاٹ کی مسجد اور حضرت منعم پاک کا مزار، حضرت شاہ عشق کا تکیہ، حاجی تقی کی مسجد اور مقبرے کا ذکر، محمد کریم شاہ کی قبر ۱۳۳۳ھ، بخشی گھاٹ اور ڈاکٹر فلرین کا مکان، رائے صاحب کا پشتہ، حویلی بیگمان۔

پچھم دروازے سے پورب دروازے تک کا حال: مرزا معصوم کی قبر ۱۰۳۳ھ، محلہ گذری کی عمارتیں، مرزا علی کی قبر ۱۲۶۵ھ، شیخ رضا کی مسجد اور ایک قبر، بادشاہ محل اور بادشاہ نواب مارکیٹ، نواب لطف علی خاں بادل کی مسجد ۱۲۰۰ھ، منیر الدولہ کی قبر ۱۱۸۸ھ، سیٹھی بتیال اور رحیم النساء کی قبر ۱۱۷۰ھ، انگریزوں کا گورستان اور مقتل + ۱۷۶۳ء۔

۱۷۶۳ء، محلہ گورہٹہ کی بڑی مسجد ۱۲۱۴ھ، محلہ گورہٹہ کی چھوٹی مسجد ۱۲۱۴ھ، پادری کی حویلی ۱۷۱۳ء، لیڈی روز امام کی قبر ۱۹۲۷ء، بخش محلہ، نواب جعفر علی خاں کا گورستان، اشرف النساء بیگم کی قبر ۱۳۱۰ھ، نواب تصدق حسین خاں کی قبر ۱۳۴۰ھ، مولوی اکرام الحق کی مسجد ۱۳۴۷ھ (جو ٹنی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے)، ارشاد علی عرف چھٹن کی قبر ۱۳۴۳ھ، مہدی علی عرف ٹبن کی قبر ۱۳۴۴ھ، محمدی جان کی مسجد ۱۳۰۵ھ، کوچہ کنگر کی مسجد ۱۲۶۱ھ، محلہ خواجہ میر کلاں، ڈاکٹر صادق خاں کی مسجد ۱۲۹۹ھ، مخدوم حسن علی کا مزار ۱۲۴۴ھ، جعفر خاں کی علامت ۱۰۷۴ھ، حسن علی کا دار العلوم ۱۱۴۲ھ، مسجد بیگو حجام ست گھروا (حسین شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہے) ۹۱۶ھ، بیگو حجام والا کتبہ ۱۰۵۶ھ، اورنگ زیب کی مسجد جو روضہ کی مسجد کہی جاتی ہے ۱۰۹۲ھ، فخر الدولہ کی مسجد ۱۲۰۲ھ، گدام کی مسجد

متصل کٹرہ شائستہ خاں ۱۲۹۶ھ، چوک کی مسجد ۱۲۵۱ھ، خواجہ عنبر کی مسجد ۱۱۰۰ھ، مدرسہ سیف خاں کے سیفی مدرسے کی مسجد ۱۰۳۸ھ، عمارت چہل ستون وکلا عظیم آباد، قلعے کے باہر ایک مسجد ۱۲۲۹ھ، شاہ معروف کی قبر

مغل پورہ کے کتبے: صغریٰ بیگم کی قبر ۱۳۱۲ھ، صغریٰ فاطمہ کی قبر ۱۳۳۴ھ، سید کرامت کی قبر ۱۳۳۲ھ، شیخ احمد علوی کی مسجد ۱۲۵۲ھ، شیخ بہاری کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خواجہ عطاء اللہ کی قبر ۱۲۶۳ھ، شیخ محمد رفی کی قبر، مولوی نوادر علی کی قبر ۱۲۶۳ھ، علی حسین ولد بچو کی قبر ۱۳۲۰ھ، حاجی عباس کی قبر ۱۳۴۰ھ، منظر حسین کی مسجد ۱۳۴۷ھ، منظر حسین کی مسجد ۱۳۰۴ھ، میاں خاں کی قبر ۱۲۷۱ھ۔

جگی چوراہا، گلشن حیدری، کنگھیا ٹولہ، سنار ٹولی، شاہ کی املی، لودی کٹرہ اور دوندی بازار کا حال: یام صاحب کی مسجد ۱۲۴۳ھ، بلاقی کی مسجد ۱۲۰۵ھ، میر قطب الدین کی قبر ۱۱۸۳ھ، گورستان سید علی عظیم کی قبر ۱۲۳۴ھ، سید نظام الدین کی قبر ۱۳۰۵ھ، گھستو بی بی کی قبر ۱۳۱۴ھ، گلشن حیدری و گلشن حیدری کی مسجد، امام باڑہ گلشن حیدری میں جڑا کتبہ ۱۲۵۰ھ، میر نجف علی کی قبر ۱۲۶۱ھ، نواب یوسف علی خاں کی قبر ۱۳۰۴ھ، عبد الحق خاں کی قبر ۱۳۱۰ھ، قبر کلثوم بی بی، بشارت حسین کی قبر ۱۳۰۸ھ، محمد ذاکر کی قبر ۱۳۲۲ھ، سنار ٹولی میں مرزا معشوق کی قبر ۱۳۴۱ھ، محلہ باغ میر گلابی میں شاہ وارث علی کی قبر ۱۲۲۱ھ، محلہ شاہ کی املی میں ایک مقبرہ ۱۲۱۲ھ، کشمیری کوٹھی میں فضل علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ، کنگھیا ٹولہ میں چند کتبے، شیخ غلام یحییٰ حضور کی مسجد ۱۲۰۷ھ، شیخ غلام یحییٰ کی قبر، مراد النساء کی مسجد ۱۲۳۲ھ، لودی کٹرہ میں دوسری مسجد ۱۲۲۲ھ، حکیم احمد حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، ایک گنبد کی مسجد یا دوندی بازار کی مسجد ۱۰۶۱ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۰۵۰ھ۔

منگل روڈ کا حال: پیار النساء کی قبر ۱۱۹۹ھ، جنگی تالاب چوک شکار پور کی مسجد ۱۲۸۸ھ، چوک شکار پور کتبہ کی دوسری مسجد، حاجی تاتار کی مسجد، منشی کاظم علی کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۸ھ، حاجی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ، محلہ رسول پورہ شیر شاہی محلہ محمد مراد شہید سونی کا کتبہ ۹۴۹ھ، اشرف علی خاں فغاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۲۳ھ، حسین بیگم کی مسجد ۱۲۴۳ھ، قبر سید اقبال رضوی بن سید حیدر علی رضوی المعروف بہ جمال حسین ۱۲۲۹ھ، فیض النساء بیگم کی قبر ۱۲۶۷ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد ۱۰۷۲ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۷۲ھ، ممتاز فاطمہ کی قبر ۱۱۸۸ھ، میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ، میر اشرف کی وفات کا قطعہ تاریخ ۱۱۸۸ھ، میر فرحت حسین کی

مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد، شاہ منصور کی قبر۔

نواب ہیبت جنگ کا مقبرہ: واقع محلہ بیگم پور ۱۷۴۸ء، افضل حسین کی قبر ۱۰۶۲ھ، حاجی علی بخش کی مسجد، کلثوم النساء کی مسجد، شاہ ملک کی مسجد، شاہ کرک کی مسجد ۱۳۵۲ھ، شاہ کیرک کی قبر، سرائے کی مسجد اور آمنے سامنے والی مسجد، عبدالرحمان سجاد کی مسجد ۱۱۵۰ھ، تھانہ مال سلامی میں ایک قبر کا کتبہ بغیر نام و تاریخ، ڈلیس کوٹھی اور بدرزی قبر ۱۷۹۰ء، مسجد سیرہ میر کے پاس ایک لڑکے کی قبر ۱۲۱۹ھ۔ مسجد پیر ڈمریا گنگا ندی کے کنارے، منجھلی بیگم کی قبر ۱۲۸۲ھ، شاہ ڈمریا کی قبر، محلہ نون گولہ کی مسجد، شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ طبن کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر ۱۱۵۵ھ، محمد حسین ولد مصنف سیر المتاخرین غلام حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، باڑے کی مسجد ۱۲۷۱ھ، عالی النساء بیگم کی مسجد ۱۲۲۴ھ، بزرگ امجد کی مسجد ۱۱۰۰ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین کی قبر ۱۱۴۰ھ، فرزند علی کا امام باڑہ ۱۲۳۰ھ، کنگن کا مقبرہ، کرہ مال سلامی میں ایک قدیم مسجد، پولیس چوکی کے پاس ایک مندر، باغ جعفر خاں قدم رسول کی مسجد، نادر گنج محمد علی خاں کی قبر ۱۱۰۸ھ، نوری حیدر کا مقبرہ، بواجی کی باؤلی، سبل پور کا حال، مخدوم شہاب الدین پیر جگوت کا مزار (کچی درگاہ)، شاہ آدم صوفی (پکی درگاہ)، اللہ جلالی کی قبر ۱۳۳۷ھ، جھلی کی مسجد ۱۳۱۰ھ۔

مجلد نسخے کے علاوہ اس سائز پر قصبہ سہسرام کا حال درج ذیل ہے:

قصبہ سہسرام و عالمگیری مسجد، آثار قدیمہ سہسرام و تاراچنڈی مندر، حسین نور کا مقبرہ، حسین نور کے مقبرے کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ، ایک عجیب صفت، عید گاہ کے کتبے، دائرے جانب والا کتبہ، دروبانی کا کتبہ، دکھن جانب والا کتبہ، سرمست خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ، معقدر جنگ کا قلعہ، مقام چنڈی پہاڑی کے پاس مسجد ۱۰۲۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ، مہدی حسین کی قبر ۱۲۰۱ھ، امام باڑے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی بازار میں ایک مسجد ۱۱۰۵ھ، جانی بازار میں امام باڑہ ۱۲۰۰ھ، کرن سرائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ، ۱۲۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔

اس کے بعد کاپی سائز پر آٹھ صفحات میں اورنگ آباد کا حال ہے۔

قصبہ اورنگ آباد: عبدالولی خان کی مسجد ۱۱۳۰ھ، موضع سرس شمس الدین خاں کی مسجد ۱۰۷۱ھ، غلام مصطفیٰ کی قبر ۱۲۰۵ھ، نواب غلام حسین کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۲۸۳ھ، قصبہ

دار و دانا، مسماۃ فراست کی قبر ۱۲۶۶ھ۔

دستورِ سخن : قلقؔ صاحب اس کتاب کا صرف پہلا صفحہ صاف کر سکے تھے، باقی اوراق پریشان کی صورت میں ان کے پوتے سید مظفر قلقؔ کے پاس محفوظ ہیں، جو ان پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

صاف شدہ حصے کے مندرجات : اُردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقا، حروفِ تہجی کی قسمیں، حروفِ تازی کی قسمیں اور اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک سرخی، اصطلاحات کی ملتی ہے جس میں حذف و ترمیم، تخفیف، اشباہ و ادغام، تحریک و تسکین، قلب و نقل ابواب مترادف، مشترک و توالی، قیاسی و سماعی اور اشتقاق کے متعلق لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد "فصاحت" کی سرخی ملتی ہے۔

اس میں تنافر، اتصال، توالی، اضافت، ضعفِ تالیف، مخالفتِ قیاس، فکِ اضافت اور استقاط کا بیان ملتا ہے۔

اس کے بعد تکرار اور حشو کی سرخیاں ملتی ہیں۔

اس کتاب میں حروفِ تہجی سے لے کر قواعد، فنِ عروض وغیرہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

••

وسیم احمد اعظمی

خدا بخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات

شیخ علی ابن سینا (۱۰۳۷ - ۹۸۰ء) کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں محققین کا کافی اختلاف ہے۔ سب سے قدیم اور معتبر ماخذ ابو عبید عبد الواحد بن محمد فقیہ جوزجانی (متوفی ۴۳۸ھ) کی مرتب کردہ سوانح ابن سینا ہے۔[1] ابن ابی اصیبعہ، ابوالحسن بیہقی، شہرزوری اور ابن القفطی نے اسی سوانح کو بنیاد قرار دیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس سوانح کے حوالہ سے تصانیف ابن سینا کی تعداد ایک سو ایک بتائی ہے۔ لیکن اس سوانح کے دوسرے نسخہ مطبوعہ قاہرہ میں دو کتابوں کا اضافہ ہے اور نسخہ مطبوعہ انجمن دوستداران ایران میں تین کتابوں کا اضافہ ہے۔ اس طرح ان کی تعداد ۱۰۶ ہو جاتی ہے ــــ دوسرے تذکرہ نگاروں میں حاجی خلیفہ نے ۶۲، بروکلمان نے ۹۹، ذبیح اللہ صفا نے ۲۳۸، یحییٰ مہدوی نے ۲۴۲، جورج شحاتہ قنواتی نے ۲۷۶ اور سعید نفیسی نے ۴۵۶ کتابوں کو ابن سینا کی طرف منسوب کیا ہے۔[2] سعید نفیسی اپنی فہرست کے بارے میں لکھتے ہیں: "ممکن است در فہرست برخی نامہا تکرار نامی دیگری باشد و یک کتاب یا رسالہ را بدو نام ذکر کردہ باشند"۔[3]

سعید نفیسی نے ابن سینا کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر ابن سینا کی سوانح سے متعلق استنبول کا جو نسخہ (فوٹو کاپی) حاصل کر کے ایڈٹ کیا ہے اور اپنے فارسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے اس میں تصانیف ابن سینا کی تعداد صرف ۹۵ ہے۔[4]

خدا بخش لائبریری میں ابن سینا کے جو مخطوطات اس وقت فراہم ہیں[5] ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- رسالہ فی تفسیر قل ھو اللہ احد: ہینڈ لسٹ ۲/۲۵۹۰ (عربی) ص۵ نستعلیق

۱- اس سوانح کا کچھ حصہ خود ابن سینا کا املا کرایا ہوا ہے۔ اس حصہ کی انتہا اس شعر پر ہوتی ہے جب ابن سینا امیر قابوس سے ملنے کی سعیٔ ناکام کے بعد جرجان لوٹ آیا تھا اور وہیں ابو عبید جوزجانی اس سے وابستہ ہوا تھا۔

لما عظمت فلیس مصر واسعی   لما غلا ثمنی عدمت المشتری

اس کے بعد کا حصہ جوزجانی کا تالیف کردہ ہے۔ ۲- ملخص از رسالہ جودیہ ص۳۲ از حکیم سید ظل الرحمٰن۔ ۳- ایضاً ص۳۳

۴- اس کا اردو ترجمہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔

۵- حکیم سید ظل الرحمٰن نے خدا بخش لائبریری میں "قصیدہ لامیہ" کے نام کا ابن سینا کا ایک مخطوطہ کی نشاندہی کی ہے (رسالہ جودیہ ص۵۵) مطبوعہ فہرست خدا بخش میں بھی اس کا اندراج ہے لیکن مخطوطہ موجود نہیں ہے۔ ہماری توضیح طلبی پر انھوں نے بتایا کہ اصل نسخہ کو نہیں دیکھا گیا تھا بلکہ مطبوعہ فہرست پر ہی اکتفا کیا گیا تھا۔ (مکتوب بنام وسیم احمد)

گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۲- رسالہ فی تفسیر قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفلق :- ہینڈ لسٹ ۲/۲۵۹۰ (عربی) ۳ ص نستعلیق

اس میں تین صفحات ہیں۔ تقریباً گیارھویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۳- رسالہ فی تفسیر قُل اعوذ برب النّاس : ہینڈ لسٹ ۳/۲۵۹۰ (عربی) ۲ص

نستعلیق۔ اس میں دو صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۴- تفسیر کا ایک فارسی نسخہ[1] ہینڈ لسٹ ۱۶۴۴ بھی ہے۔ اس میں سورۃ الاخلاص والمعوذتین

کی تفسیر بھی شامل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۳ ویں صدی کا

۵- الارجوزۃ السینائیۃ[2] : ہینڈ لسٹ ۳/۲۲۵۹ (عربی) نستعلیق، کاتب ختی اللہ

اس میں تقریباً بارہ سو انتیس اشعار ہیں۔ ارجوزہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

الحمد للہ الملک الواحد　　رب السموات العلی الماجد

ارجوزہ کے ابتدائی ۱۵ اشعار حمد باری تعالیٰ پر مشتمل ہیں۔ ۱۶ ویں شعر سے باقاعدہ موضوع طب کا

آغاز ہوتا ہے۔ شعر یہ ہے : الطب حفظ صحۃ و برء مرض　　من سبب فی بدن منہ عرض

موسیٰ ابن ابراہیم البغدادی نے "الجوہر النفیس" کے نام سے اس ارجوزہ کی جو شرح لکھی ہے اس کا

آغاز بھی اسی شعر سے ہوتا ہے ——— ارجوزہ کے آغاز سے قبل چھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون میں ارجوزہ کی فنی اور

عروضی حیثیت پر فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مزید پانچ صفحات پر مشتمل ابن سینا سے منسوب ایک مقدمہ ہے جو

اطبا کے طبی شعری سرمایہ کا سرسری جائزہ لینے کے بعد تحریر ہے :

" واتبعت سنن الحکماء وخدمت حضرۃ سیدنا الفقیہ الاجل القاضی

السنی المحل اطال اللہ بقاہ وادام عزہ وعلاہ .... بھذہ الارجوزۃ المشتملۃ ....

۱- اس مجموعہ کے آغاز و اختتام پر تین مہریں ثبت ہیں، ایک مہر کسی کتب خانہ میں اندراج کی نشاندہی کرتی ہے، دوسری

امجد علی شاہ والیٔ اودھ کی ہے، تیسری تقریباً غیر واضح ہے۔ صرف ۱۲۴۴ھ پڑھا جا سکتا ہے۔

۲- اس کا دوسرا نام " الارجوزۃ فی الطب " یا " الفینۃ الطبیۃ معروف بہ ارجوزۃ السینائیۃ " بھی ہے۔ مخطوطہ کے

اختتام کی عبارت ہے : " تمت الارجوزۃ السینائیۃ بعون الخالق البریۃ " مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز حصہ دوم

ص ۱۵ میں " الارجوزۃ فی الطب " تحریر ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۶۱ھ میں مطبع مصطفائی سے شائع ہو چکا ہے۔ ابن سینا کی فارسی کتابوں کے

بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس کی عربی تصانیف کا ترجمہ ہیں۔ (جشن نامہ ابن سینا ص ۵۷)

ارجوزہ کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

وقد فرغت من جمیع العمل — والآن اقطع[1] بقول مکمل

یہ ارجوزہ طب علمی و عملی پر منقسم ہے۔ اس میں کلیات، معالجات، حفظ صحت اور ادویہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس ارجوزہ کی متعدد زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں شرح ابن رشد، الجوہر النفیس، شرح ابن طملوس، شرح عبدالحمید ابن هبة الله، شرح محمد ابن اسماعیل اور شرح احمد بن محمد بن المنہاد کافی مشہور ہیں۔ خدا بخش لائبریری میں الجوہر النفیس کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔ لاطینی زبان میں بھی اس پر کام ہوا ہے۔ اردو میں حکیم عبدالعزیز بٹالوی نے جواہر النفیس کے نام سے اس کا ترجمہ مع شرح کیا ہے۔

۶۔ ترجمہ قول الحکیم تیاذق[2] فی حفظ الصحۃ[3]:۔ ہینڈ لسٹ[4] ۲۵۵۹/۴، ۳ص، نستعلیق، کاتب چھنّی لال کھتری ۱۲۲۵ھ فارسی و عربی مخطوط ہے۔ اس میں ۲۱ اشعار ہیں۔ ۱۱ اشعار عربی میں ہیں اور ۱۰ فارسی میں۔ حکیم تیاذق کے حفظ صحت سے متعلق اقوال کے عربی ترجمہ کا پہلا شعر یہ ہے:

توق اذا استطعمت[5] ادخال مطعم — علی مطعم من قبل فعل الہواضم

آخری شعر:۔ خصال بہا اوصی الحکیم تیاذق — الی العدل نوشیروان ملک[6] الاعاجم

فارسی ترجمہ کا پہلا شعر ہے:

تا طعامی نگذرد از معدہ بالای آن — ہر طعامی کان خوری باشد تمامیں زیان

آخری شعر:۔ پس بکن تو فرد دارد بر بدن بشنو ز من — کان بود بهر ستون بهر قوای مردمان

۷۔ الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ[6]:۔ ہینڈ لسٹ ۲۶۰۰/۳، (عربی) ۹ص۔ اس میں ۱۳۸ اشعار ہیں۔ فصول اربعہ کی تعریف، افلاک کی گردش اور بروج وغیرہ سے پیدا شدہ عوارضات وامرجہ

۱۔ الجوہر النفیس ص ۳۱۱، از موسیٰ بن ابراہیم البغدادی، متوفی ۸۷۶ھ میں "اقطعہ" تحریر ہے۔

۲۔ قبان بن یوسف، متوفی ۱۰۴ھ، وکا طبیب خاص ۹۰ ہجری میں "واسط" میں فوت ہوا۔ (تاریخ الاطبا ص ۴۲)

۳۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے اس کا نام "وصیۃ حفظ الصحۃ (قصیدہ میمیہ)" تجویز کیا ہے۔ (مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۴۷)

۴۔ مطبوعہ فہرست مجمل میں اس کو ہینڈ لسٹ ص ۲۵۵۹/۳ کے ساتھ شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک علیحدہ ارجوزہ ہے لیکن نسخہ مطبوعہ مصطفائی ۱۲۶۱ھ میں الارجوزۃ السینائیہ کے ساتھ ہے۔

۵۔ برلن کے نسخہ میں "اذا ما اشتہت" ہے۔ (مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۴۷)

۶۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۴۲۲، ج ۲ میں رسالہ منظوم ابن سینا تحریر ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں میں واضح طور پر "الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ" مذکور ہے۔

کا بیان ہے۔ آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

یقول راجی ربہ ابن سینا　　ولم یزل بہ باللہ مستعینا

اور اختتام اس شعر پر: محمد و آلہ و عترتہ　　القائمین بعدہ بسنتہ

حکیم سید ظل الرحمٰن اس ارجوزہ کے ایک نسخے کی نشاندہی برلن کے کتب خانہ میں کرتے ہیں[1]۔ ان کی تحریر کے بموجب اس ارجوزہ کا ابتدائی شعر یہ ہے:

اما الفصول اربع فی العام　　دائرۃ فیہا علی الدوام

لیکن یہاں کے نسخے میں ارجوزہ کا یہ پچیسواں شعر اور ترمیم کے ساتھ اس طرح ہے:

ثم الفصول اربع فی العام　　دائرۃ فیہ علی الدوام

اس طرح گویا یہاں کے نسخے میں ۲۴ اشعار زیادہ ہیں اور یہ نسخہ برلن کے نسخے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مخطوطہ عربی نسخ میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ مطبوعہ فہرست مخطوطات مجمل عربی مفتاح الکنوز، ج ۲، ص۱۲۲ میں گیارہویں صدی ہجری کا قرار دیا گیا ہے، لیکن میرے خیال میں اس سے زیادہ قدیم ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ ۲۶۳۷/۱۳ بھی موجود ہے۔ یہ سات صفحات پر مشتمل ہے اور ۹۶ اشعار ملتے ہیں۔ ابتدائی شعر میں ترمیم کا پتہ چلتا ہے جو یہاں اس طرح ہیں:

یقول راجی عفو ربہ ابن سینا　　ولم یزل باللہ مستعینا

۲۵ ویں شعر میں بھی ترمیم ملتی ہے، شعر اس طرح ہے:

ثم الفصول اربعۃ فی العام　　دائرۃ فیہ علی الدوام

یہ ارجوزہ مندرجہ ذیل پر ختم ہوتا ہے:

وبعد هذا انظر الزمان انا　　معتدلا ایام کما قد کانا[2]

مگر ہینڈ لسٹ ۲۶۰۰/۱۳ میں اس کے بعد بھی ۳۹ اشعار ملتے ہیں۔ اس نسخہ میں موسم شتا کا آخری شعر اسی کو قرار دیا گیا ہے جب کہ ہینڈ لسٹ ۲۶۰۰/۱۳ موسم شتا کے اختتام کے بعد دوسری بحث کا پہلا شعر قرار دیا گیا ہے۔ نسخہ خط نسخ میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے لیکن تقریباً بارہویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مقدمہ رسالہ جودیہ ص۲۰　　۲۔ ہینڈ لسٹ ۲۶۰۰/۱۳ میں مناسب ترمیم کے ساتھ شعر اس طرح ہے:

وبعد هذا انظر الزمان　　معتدلا اذا کما قد کان

۸ - **الرسالة فی الفصد:** ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۶ (عربی) ۳ ص نستعلیق - یہ ۱۳ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں فصد کی تعریف، اغراض و مقاصد، نقصانات، فصّاد کی ذمہ داریوں اور فصد کھولنے کے بعد کے عوارضات کا ذکر ہے۔ کتابت نستعلیق میں ہوئی ہے - مخطوطہ تقریباً تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ م ۳۴۸۲ بھی موجود ہے، جو ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۹ - **الرسالة فی حفظ الصحة:** ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۷ (عربی) ۱۶ ص - یہ ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں حفظ صحت اور اس کے مبادیات بیان کئے گئے ہیں۔ فصد، حجامت اور اسہال پر بھی ضمنی طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ خط کو مدنظر رکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کا کاتب بھی وہی ہے جس نے ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۶ کی کتابت کی ہے۔ اس طرح تخمینی طور پر اس کو بھی ۱۳ ویں صدی ہجری کا قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ م ۳۴۸۳ بھی موجود ہے - یہ ۹ صفحات اور ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے - ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۰ - **الرسالة فی شطر الغب[1]:** - ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۸ (عربی) ۶ ص نستعلیق - یہ ۶ صفحات اور ۶ فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں شطر الغب کی شناخت، عوارضات اور اصول علاج کو بیان کیا گیا ہے۔ کاتب وہی ہے جس نے ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۶ و م ۲۵۵۹/۷ کی کتابت۔ اس طرح یہ مخطوطہ بھی تقریباً ۱۳ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ م ۳۴۸۴ بھی ہے - یہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے - اندازاً ۱۴ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۱۱ - **الرسالة فی الحرارة الغریزیة[2]:** - ہینڈلسٹ م ۲۵۵۹/۹ (عربی) ۵ ص - جسم انسانی میں حرارت غریزیہ پر ایک فاضلانہ مضمون کے بطور متعارف ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اگرچہ تحریر

---

۱ - مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۳۴۵ ج ۲ میں مصنف کے نام کا اندراج نہیں ہے، حالانکہ یہ ابن سینا کا مشہور رسالہ ہے۔
۲ - چونکہ مخطوطہ میں رسالہ کا نام تحریر نہیں تھا، غالباً اسی سبب مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۳۴۵ ج ۲ میں مصنف کے نام کا اندراج نہیں کیا گیا۔ یہ ابن سینا کے رسائل میں سے ایک ہے۔

نہیں ہے لیکن مجموعہ کی کتابت غالباً چھنی لال نے امجد علی شاہ کے وقت میں ۱۲۶۱ھ کے قریب کی ہے، کیونکہ جن مخطوطوں پر جو مہریں ثبت ہیں، وہ واضح طور پر اس کی نشاندہی کرتی ہیں۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۸۵/ط بھی ہے۔ یہ ۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ الرسالۃ للشیخ فی الاسئلۃ والجواب[2]:۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۵۵۹/۱۵ (عربی) ۱۴ ص، نستعلیق۔ یہ طب سے متعلق ان ۱۵ سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے جو اس سے مختلف اوقات میں کئے گئے تھے۔ کتابت غالباً چھنی لال نے ۱۳ویں صدی ہجری میں کی ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۸۶ بھی ہے۔ یہ ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۱، ج ۳ میں اس کا نام "مسائل معدودہ" درج ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۳۔ الرسالہ الموسومہ بالفصول[3]:۔ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۵۵۹/۱۲ (عربی)، ۵۷ ص اس میں ۸، فصول ہیں۔ اس میں ابن سینا کے ان خطبات کو جمع کیا گیا ہے جو انھوں نے درس میں دیئے تھے۔ خط نستعلیق میں اس کی کتابت چھنی لال نے ۱۲۷۵ھ میں کی ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۸۷ بھی ہے۔ یہ ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۱، ج ۳ میں اس کا نام "رسالہ معرفۃ النفس والنبض[4]" درج ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ مخطوطہ میں "الرسالہ فی الحرارۃ" تحریر ہے۔

۲۔ مخطوطہ کے آغاز کی عبارت یہ ہے "ھٰذہ مسائل معدودۃ من املاء الشیخ الرئیس ابن علی سینا"، مفتاح الکنوز صفحہ ۳۴۵، ج ۲ میں "رسالہ فی الاسئلہ والاجوبہ" تحریر ہے۔

۳۔ اختتام کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، "تمت الرسالہ الموسومہ بالفصول المستفادۃ من مجلس الشیخ الجلیل رئیس الحکماء ابن علی بن سینا"

۴۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے ابن سینا کے جن تین نادر مخطوطات کا ذکر کیا اور اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ صرف ہندوستان میں ملتے ہیں، ان میں سے ایک رسالہ "رسالہ فی معرفۃ النفس والنبض" بھی ہے، اس کو وہ ابن سینا کے دو رسالے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۴۔ **الرسالہ فی الھندبا:۔** ہینڈلسٹ م۳۴۷۹ (عربی) ۵ص۔ اس رسالہ کی تالیف کے محرکات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے ابن سینا سے ھندبا (کاسنی) کے منافع اور ھندبا غیر مغسول کے استعمال سے پیدا شدہ عوارضات کے بارے میں ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے برجستہ یہ رسالہ لکھ ڈالا[1]۔

اس کو ڈاکٹر سہیل انور نے استانہ سے شائع کرایا ہے۔ کتب خانہ مجلس شوریٰ میں یہی کتاب "رسالہ فی خواص الکاسنی" کے نام سے ہے ——— خدابخش لائبریری کا یہ مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۵۔ **الرسالۃ فی السکنجبین:۔** ہینڈلسٹ م۳۴۸۰ (عربی) ۴ص، نستعلیق۔ اس کو ابن سینا نے اپنے ایک معاصر کے لئے سکنجبین کے فوائد پر لکھا تھا۔ اس میں سکنجبین سے متعلق قدیم یونانی اطبا کی آراء کا جائزہ لیا گیا ہے[2]۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے اردو ترجمہ حکیم تبارک کریم نکیلی مرحوم نے کیا ہے۔

——— (پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ———

"رسالہ فی النفس" اور رسالہ "فی النبض" کے علاوہ تیسرا رسالہ قرار دیتے ہیں اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کی موجودگی کی نشاندہی کرتے ہیں، جب کہ خدابخش لائبریری میں موجود "الرسالۃ الموسومہ بالفصول" اور "رسالہ معرفۃ النفس والنبض" ایک ہی رسالے ہیں۔ ایسی صورت میں جب تک نسخہ مخطوطہ آصفیہ حیدرآباد دیکھ نہیں لیا جاتا اس کی بابت حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

۱۔ عبارت اس طرح ہے:۔ "سئل الشیخ الرئیس ابوعلی بن عبداللہ بن سینا رحمہ اللہ علیہ ان یملی کتاباً کاملۃ فی علۃ امرۃ باستعمال الھندباء غیر مغسول فاخذ الدرج وکتب ارتجالاً"۔

۲۔ عبارت اس طرح ہے:۔ "رسالۃ الشیخ الرئیس ابی الحسن بن عبداللہ بن سینا قدس نفسہ سألت یا اباسعید اسعدک اللہ فی جمیع الوک ان ارسم لک جمل منافع الشراب المسمی سکنجبینا واعلمک الحق فی المساجرۃ التی جرت بینک وبین نفر من الاطباء فی امر السکنجبین الساذج"۔

۱۶- الادویۃ القلبیہ[1] :- ہینڈ لسٹ ۳۴۸[2]، (عربی) ۳۸ ص، نستعلیق۔

اور ادویہ قلبیہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ابن سینا نے اس کو اپنی پہلی آمدِ ہمدان پر شریف سعید ابوالحسن علی بن

کے لئے لکھا تھا ——— ابن سینا کے اس رسالہ پر متعدد زبانوں میں کام کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں حکیم عبد

فلسفی (متوفی ۱۹۷۰ء) نے اس پر کام کیا ہے اور ایک پُر مغز مقدمہ بھی سپردِ قلم کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا

ہے کہ "القانون" کے بعد ابن سینا کی جس کتاب کی سب سے زیادہ پذیرائی ہوئی ہے وہ یہی ہے۔ نسخہ ۱۴ویں صدی

۱۷- الرسالۃ فی القولنج :- ہینڈ لسٹ ۳۴۸۸ (عربی) ۴۸ ص، نستعلیق۔

تین مقالات ہیں جس میں امعاء، ان کے افعال، قولنج کی تعریف، اقسام اور اسباب و علامات کے علاوہ

کے مریضوں کے تحفظ و علاج کا بھی ذکر ہے۔ ابن سینا نے اس رسالہ کو قید کے ایام میں قلعہ فردجان میں لکھا تھا۔

مکمل صورت میں نہیں پایا جاتا[3]۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے ——— یہاں یہ بات بھی قابلِ غور

ابن سینا جو قولنج کے علاج کا ماہر تھا، اور اس بنا پر شمس الدولہ کے دربار تک رسائی ہوئی تھی، مرض قولنج ہی میں

۱۸- رسالہ فی الکیمیا[4] :- ہینڈ لسٹ ۲۵۲۶/۲ (عربی) ۹ ص، نسخ ۹ فصلوں پر

ہے۔ ابن سینا نے یہ رسالہ شیخ ابوالحسن سہل بن محمد السہلی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ مجموعہ ہینڈ لسٹ ۱۵۲۹

میں کاتب کا نام سید اصغر حسن کشمیری تحریر ہے اور سالِ کتابت ۱۲۵۸ھ ہے۔ چونکہ مجموعہ کا خط ایک سا ہے اس لئے

احتمال ہے کہ کاتب نے ہر رسالہ کے اختتام پر نام لکھنے کی بجائے مجموعہ کے آخری رسالے پر نام لکھنا زیادہ مناسب تصور کیا ہو۔

۱- مطبوعہ فہرست مجلّی مفتاح الکنوز ۱۹۱، ج ۳ میں "الاحکام الادویۃ القلبیہ" آئینہ سرگذشت ۳۱، میں "کتاب الادویۃ

القلبیۃ" مقدمہ رسالہ جودیہ ۳۶ میں "الادویۃ القلبیۃ" اور ۳۶ پر "رسالہ فی احکام الادویۃ القلبیۃ

(کتاب الادویۃ القلبیۃ) لکھا ہے۔ انگریزی ترجمہ تفصیلی تعلیقات کے ساتھ حکیم محمد سعید صاحب اور حکیم عبد الحمید صاحب

اہتمام سے ہمدرد (ہند و پاک) نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

۲- غالباً یہ وہی نسخہ ہے جس کی نشاندہی حکیم سید ظل الرحمٰن نے مقدمہ رسالہ جودیہ ۵۷ پر شفاء الملک حکیم سید مظاہر

پٹنہ کے ذاتی ذخیرہ میں کی ہے۔ میرے خیال میں موصوف نے شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد (متوفی ۱۹۵۸ء) کو غلطی سے

حکیم مظاہر حسن لکھ دیا ہے۔ شبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ اب شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد کے یہاں سے خدا بخش

پٹنہ کے مخطوطات ——— میں موجود ہے نیز شفاء الملک کا خطاب یافتہ مظاہر حسن نام کا کوئی طبیب عظیم آباد میں نہیں

اس بارے میں میں نے حکیم محمد اسرار الحق مؤلف "تاریخ اطبائے بہار" سے بھی رجوع کیا تو انھوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا

۳- عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ورق ۱۷۹/ب قلمی نسخہ۔

۴- یہ نام مطبوعہ فہرست "مفتاح الکنوز ۳۴۱" ج دوم سے ماخوذ ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۹- رسالۃ مختصرہ فی معرفۃ ترکیب الروح والنفس و الجسد[1] : ہینڈ لسٹ ۲۵۲۶/۳

اس میں ۱۵ فصول ہیں جس میں تصعید، تحلیل، تخمیر اور تدبیر وغیرہ کا ذکر ہے۔ کتابت غالباً سید اسعد حسن کشمیری کی ہے۔ اس لحاظ سے تقریباً ۱۲۵۰ھ میں کتابت ہوئی ہوگی۔ یہ ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۰- القانون فی الطب : ابن سینا کی شہرۂ آفاق اور مہتم بالشان تالیف ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "اگر بقراط و جالینوس کو حیات نو مل جائے تو وہ ابن سینا کے قانون کے آگے سجدہ ریز ہوں"[2]۔ سر ولیم آسلر نے اسے "میڈیکل بائبل" کہا ہے[3] ــــ ابن سینا نے جرجان میں قیام کے دوران ابو محمد شیرازی کے مکان میں "القانون" لکھنا شروع[4] کیا تھا جس کی تکمیل ہمدان میں ہوئی۔ القانون کی پذیرائی ابن سینا کی حیات ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ اس کی شروح و حواشی کا آغاز بھی ابتدائی عہد سے ہو گیا تھا۔ دنیا کی تمام علمی زبانوں، لاطینی، فرانسیسی، جرمنی، ازبکستانی، انگریزی، عبرانی، فارسی اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے اور شرحیں لکھی گئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں عربی میں اس کی شرح، حاشیہ یا تلخیص معیار علم اور کمال فن کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا۔ یہ کچھ اس عہد کا مزاج بھی تھا۔ لیکن کسی طبی کتاب کی نہ اس قدر شرحیں لکھی گئیں اور نہ اس کثرت و عقیدت سے کسی کا مطالعہ کیا گیا[5]۔

دس لاکھ سے زیادہ الفاظ پر مشتمل یہ تصنیف محض ایک کتاب نہیں ہے، بلکہ تمام طبی علوم کا مجموعہ ہے جس میں ہر شعبۂ فن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے[6]۔ اس میں پانچ کتابیں شامل ہیں۔ پھر ہر کتاب کی متعدد قسمیں ہیں جن کو فنون، تعلیم، مقالات اور فصول وغیرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہاں اس کے متعدد قیمتی نسخے موجود ہیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ہینڈ لسٹ ۲۱۶۰: "القانون" کے کتاب اول پر مشتمل یہاں کے "القانون" کا قدیم مخطوطہ ہے۔ اس میں ۴۴۴ صفحات ہیں۔ کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ خط نسخ میں اس کی کتابت ۷۶۲ھ میں ہوئی۔ ناقص الآخر ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۴: "القانون" کے کتاب اول و ثانی پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۲۰ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت نفیس خط نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی نے ۹۱۶ھ میں کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ کا) لیکن مخطوطہ میں یہ عبارت کہیں بھی درج نہیں ہے۔ مخطوطہ کی ابتدائی عبارت اس نام کی نشاندہی کرتی ہے "فصل مخصوص فی معرفۃ ترکیب الروح والجسد" آئینۂ سرگذشت ص۲۲ میں غالباً اسی کا نام "رسالہ الی السہیلی فی امر دستور الکیمیا" تحریر ہے۔

۱- مخطوطہ میں صرف "معرفۃ ترکیب الروح والنفس والجسد" تحریر ہے۔

۲- چہار مقالہ مع حواشی گب ایڈیشن ص۱۱۷

۳- بحوالہ مقدمہ رسالہ جودیہ ص۲۹

۴- مقدمہ رسالہ جودیہ ص۵۰

۵- 'معارف' جون ۱۹۶۵ء

۶- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص۲۵۳ ج ۱ میں اس کو صرف "جلد اول" قرار دیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے، کہ اس میں "القانون" کی کتاب الثانی بھی شامل ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۵: "القانون" کی کتاب ثالث[1] پر مشتمل ہے۔ اس میں ۸۳۴ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت نفیس خط نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی نے ۹۱۷ھ میں کی ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۶: "القانون" کی کتاب الرابع والخامس[2] پر مشتمل ہے۔ ہینڈ لسٹ ۲۱۵۵ کی کتاب الثالث کا آخری صفحہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں ۸۸۶ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت نفیس خط[3] نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی نے ۸ ربیع الآخر ۹۱۷ھ میں کی ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۷: "القانون" کی کتاب ثالث اور رابع کی ناک کی بیماریوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۹۳۶ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۲ ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۸: "القانون" مکمل ہے۔ اس میں ۹۲۰ صفحات ہیں۔ نفیس خط نسخ میں کتابت ہوئی ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈ لسٹ ۲۱۵۹: "القانون" کتاب اول پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۲۲ صفحات ہیں۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۳ ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈ لسٹ ۴۰۱۳[4]: "القانون" مکمل، اس میں ۱۳۲۶ صفحات ہیں۔ نفیس خط نسخ[5] میں اس کی کتابت ابن بن خلال بن امین المتطبب الصدیقی نے کی ہے۔ مفتاح الکنوز ص ۱۹۵، ج ۳ اور مخطوطہ پر حکیم سید مظاہر ... کے ایک نوٹ کے مطابق سال کتابت ۱۰ ربیع الاول ۷۰۳ھ ہے۔ لیکن میرے خیال میں "سبع عشر ربیع الاول" (۱۷ ربیع الاول) ہے۔ "سبع" کی "س" اور "ع" کے بالائی دائرہ کو دانستہ طور پر کھرچنے کے نشانات ملتے ہیں۔ "ب" کا نقطہ اور "ع" کا زیریں حصہ واضح ہے۔ یہی نہیں بلکہ شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد کلیکشن میں جس قدر کتابیں (مخطوط) یہاں دیکھنے کو ملیں متعدد میں اس طرح کی تحریف یا سیاہی گرا دینے کا عمل ملا ہے[6]۔

۱۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۳، ج ۱ میں اس کو "جلد ثانی" لکھا گیا جو درست نہیں ہے۔

۲۔ فہرست " " " " " میں اسے "جلد ثالث" لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں "القانون" کی کتاب الثالث کا آخری ورق اور کتاب الرابع والخامس شامل ہیں۔ ۳۔ مفتاح الکنوز ص ۲۵۳، ج اول میں خط نستعلیق درج ہے حالانکہ نفیس خط نسخ میں ہے۔ ۴۔ اضافی ورق ۱ الف پر مندرجہ ذیل کتابوں کا نام مذکور ہے:۔ المجموع، الحاصل والمحصول، البر والاثم، القانون، الشفا، الارصاد الکلیہ، الانصاف، النجاۃ، الہدایۃ، الاشارات، المختصر الاوسط، العلائی، لسان العرب، الادویہ المقلبیہ، الموجز، کتاب المعاد، کتاب المبدء والمعاد، بعض الحکمۃ، الآلۃ الرصدیہ، عرض قاطیغوریاس، الجلاد، الاجراء — ورق ۱ الف پر تحریر ہے:۔ "کتب القانون فی الطب لابو علی الشیخ الرئیس ابن سینا مع بعض تالیفہ وھو علم المنطق وعلم الطبیعی وعلم الکلام" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں صرف "القانون فی الطب" ہی ہے۔

۵۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۱۹۵، ج ۳ میں "خط نستعلیق" تحریر ہے جو درست نہیں ہے۔ کتاب نسخ میں ہے۔

۶۔ چیک کرنے پر پتا چلا کہ مخطوطہ تو مظاہر احمد کلکشن کا ہے اور نہ کوئی ایک صفحہ بھی قدامت بڑھانے کے لیے ... [illegible]

ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۶۹-۷۰ "القانون" کی کتاب[1] الثالث پر مشتمل ہے۔ اس میں ۵۹۶ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ سنہ کتابت ۱۲ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ ہے۔

ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۷۱ "القانون" کی کتاب الاول[2] والثانی پر مشتمل ہے اس میں ۴۳۰ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ چونکہ طرز تحریر ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۶۹-۷۰ کی طرح ہے اس لئے ۱۲۶۰ھ کا معلوم ہوتا ہے۔

ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۷۲-۷۳ "القانون" کی کتاب[1] الرابع والخامس پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۸۴ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ طرز کتابت ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۶۹-۷۰ کا سا ہے اس لئے ۱۲۶۰ھ کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۲۱- **التدارک لنوع خطأ والتدبیر**[3]: ہینڈ لسٹ نمبر ۳۱۹۳ (عربی) ص ۱۰۷، نستعلیق۔ اس میں ۷ مقالات ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :- فی تعدیل انواع الخطا، فی الہواء الحار، فی مضار الحمام الا ان یکون ہواء الحمام معتدلاً، فی ذکر الاغذیة، فی الشراب، فی الحرکات، فی امر الاستفراغ، فی من اخرجه الفصد۔ مشہور ہے کہ اس کو ابن سینا نے ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کی فرمائش پر لکھا تھا[4]۔ اس کی کتابت جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۲۲- **رسالہ کیمیا**: ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۷۹ (فارسی) ص ۲۲، نستعلیق۔ اس میں کیمیا اور اس کے مبادیات سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں ۶ فصول ہیں۔ اس کے مباحث، اور عربی طبی مخطوطہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۵۲۶/۲ کے مباحث ایک سے ہیں، لیکن عربی مخطوطہ ۹ فصلوں پر مشتمل ہے اور اس فارسی مخطوطہ میں صرف ۶ فصول ہیں۔ یہ ۱۳ ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۱- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۲ ج ۳ میں اس کو کتاب القانون "الجزء الاوّل والثانی" تحریر کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ اختتام کی عبارت یہ ہے "تمت الکتاب الثالث من القانون"۔ ۲- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۲ ج ۳ میں کتاب "القانون" الجزء الثالث تحریر ہے جو درست نہیں ہے۔ ۳- اس مخطوطہ کے متعدد نام ملتے ہیں مثلاً: "دفع المضار الکلیة عن الابدان الانسانیة"، "کتاب التدارک لانواع خطاء التدبیر"، "کتاب التدارک لانواع خطاء فی التدبیر"۔ مقدمہ رسالہ جودیہ صفحہ ۲۱، صفحہ ۵۵، "ایرانی سرگذشت" صفحہ ۲۲ میں "مقالہ فی تدارک الخطاء الواقع فی التدبیر الطبی" تحریر ہے۔ ۴- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۹ ج ۳ میں ابن سینا کو اس مخطوطہ کا مصنف اور ابوالحسن السہلی کو اس کا مؤلف قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ نفس مخطوطہ میں صرف اس قدر واضح ہے کہ یہ کتاب ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کے لئے لکھی گئی تھی۔ حکیم سید ظل الرحمان کی تحقیق بھی یہی ہے (مقدمہ رسالہ جودیہ صفحہ ۲۱)۔

۲۳- **رسالہ فی معاد النفس**[1] :- ہینڈلسٹ ۲۵۹۰/۱ (عربی) ص ۳، نستعلیق۔ ابن سینا نے اسے اپنے تلمیذ خاص ابو عبید جوزجانی کے لیے لکھا تھا۔ اس میں نفس سے متعلق مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲ ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۲۴- **کتاب المبداء و المعاد**[2] :- ہینڈلسٹ ۲۵۹۰/۵ (عربی) ص ۷۰، نستعلیق۔ اس مخطوطہ میں ۳ مقالات ہیں اور ہر مقالہ چند فصلوں پر منقسم ہے۔ اس میں مبدأ اوّل، وحدانیت، تعدید صفات، بقائے نفس انسانی اور آخرت وغیرہ کے بیانات شامل ہیں۔ ابن سینا نے اس کو ابو محمد شیرازی[3] اور مجد الدولہ کی طرف انتساب کیا تھا۔ یہ نسخہ ۱۲ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۲۵- **رسالۃ الفردوس**[4] : ہینڈلسٹ ۲۵۹۰/۶، (عربی) ص ۲۴، نستعلیق۔ اس میں معاد کی ماہیت، وجود معاد، تناسخ، نیز موت کے بعد کے احوال و طبقات وغیرہ کا بیان ہے۔ اس مجموعہ کے ۲۵۹۰/۷ میں کاتب کا نام عبدالکریم تحریر ہے۔ چونکہ خط بالکل ایک سا ہے اس لیے خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے اس کی بھی کتابت عبدالکریم کے ہاتھوں ہی ہوئی ہو۔ تقریباً ۱۲ ویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۲۶- **اجوبۃ المسائل العشرۃ** :- ہینڈلسٹ ۲۵۹۰/۷، (عربی) ص ۶، نستعلیق۔ ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۰ سوالوں کے جواب ہیں جو ابن سینا سے مختلف مواقع پر کیے گئے تھے۔ کتابت عبدالکریم نے ۹ ذی القعدہ ۱۱۳۹ھ میں انجام دی ہے ــــــ یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ[5] بھی موجود ہے جس کا ہینڈلسٹ ۲۶۳۱/۱۲[6] ہے۔ یہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱- مخطوطہ میں "رسالہ فی معاد امر النفس" تحریر ہے۔ ۲- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۲۰ جلد دوم میں "رسالہ فی المبداء و المعاد" تحریر ہے۔ لیکن آئینہ سرگذشت ص ۳۰ میں اس کا نام "کتاب المبدأ و المعاد" تحریر ہے۔

۳- آئینہ سرگذشت ص ۳۰ جلال تذکرہ ابن سینا میں ابن سینا کو صرف ابو محمد شیرازی کا پڑوسی قرار دیتے ہیں اور اس کتاب کو ابو عبید جوزجانی کے لیے تصنیف کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں " تذکرہ ابن سینا ص ۱۴ و ص ۱۵ از جلال ۱۹۵۸ء در بیکشن خدا بخش لائبریری۔ ۴- مخطوطہ میں ایک اضافی تحریر میں "اضحیۃ فی امر المعاد" درج ہے۔ لیکن اس کے اختتام پر "رسالۃ الفردوس" واضح طور پر تحریر ہے؛ آئینہ سرگذشت میں ص ۳۲ میں اس کا نام "الرسالۃ الاضحویۃ فی المعاد" تحریر ہے۔

۵- اگرچہ دونوں نسخے ایک ہی ہیں۔ لیکن مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۱۹ و ص ۲۵۷ جلد دوم میں علی الترتیب فن حکمت اور فن ہیئت میں شمار کیا گیا ہے۔

۶- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۷ ج ۲، اس کا شمار ص ۲۶۳۱/۹ کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

۲۷- رسالہ فی تحقیق جوہر الاجسام السماویۃ[1]:- ہینڈ لسٹ م ۲۵۹۰/۸ (عربی) ص ۱۰، نستعلیق۔ اجرام سماویہ سے متعلق متعدد فصول ہیں۔ مباحث بڑے دقیق ہیں۔ مخطوط میں ابن سینا کا کہیں بھی نام نہیں ہے۔ اندازہ ہے کہ عبدالکریم کے ہاتھوں ۱۱۳۹ھ میں کتابت ہوئی ہے۔

۲۸- التعلیقات[2]: ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱/۱، ابن سینا کا یہ عربی مخطوط منطق طبیعیات اور الٰہیات کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس میں ۸۱ صفحات ہیں، خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۲۹- الرسالہ فی الحروف[3]: ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱/۱۰[4] (عربی) ص ۴، نستعلیق۔ اس کو ابو منصور محمد بن علی کی فرمایش پر لکھا گیا تھا۔ یہ ۶ فصول پر منقسم ہے۔ اس میں حروف کی پیدایش، تعریف اور حنجرہ و زبان وغیرہ کی تشریح بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آواز ہوا کی لہروں سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی ترسیل بھی اسی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ۱۱ ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۰- مختصر الحدود[5]: ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۸/۵ (عربی) ص ۵، نستعلیق۔ اس میں نقطہ، حد، حرارت، برودت، یبوست، رطوبت، خشونت، صلب، اور سن وغیرہ کی تعریف بیان کی گئی ہیں۔ یہ نسخہ ۱۱ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۳۱- رسالہ فی قوی روح الانسان[6]: ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱/۱۱[7]، ابن سینا کا یہ عربی مخطوط فن حکمت میں ہے۔ ۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں روح کی تقسیم اور اسی سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۱- نظام الدین گیلانی متوفی ۱۰۵۹ھ نے تذکرہ بوعلی سینا عربی ہینڈ لسٹ م ۲۶۳۱/۲۱ میں اس کا نام "رسالہ فی معرفۃ الاجرام السماویہ" لکھا ہے۔ آئینہ سرگذشت ص ۲۳ میں غالباً اسی کو "مقالہ فی الاجرام السماویہ" لکھا گیا ہے۔

۲- مفتاح الکنوز ص ۲۵۶ ج ۲ میں مصنف کا نام درج ہونے سے رہ گیا جب کہ مخطوط میں ابن سینا کا نام واضح طور پر تحریر ہے۔ غالباً یہ مخطوط "تعلیقات استفادھا ابو الفرج الھمدانی الطبیب من مجلسہ وجوابات لہ" سے مختلف ہے۔

۳- اسی کو آئینہ سرگذشت ص ۳۱ میں "مقالہ فی اسباب حدوث الحروف ومخارجہا" کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اصفہان میں لکھا گیا۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے اس کو نہایت اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ معارف ص ۲۴۳، ۱۹۶۵ء۔

۴- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص ۲۵۶ ج ۲ میں اس کو م ۲۶۳۱/۱۵ کے تحت درج کیا گیا ہے، جو میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ ۵- آئینہ سرگذشت ص ۲۱ میں اس کو "کتاب الحدود" لکھا گیا ہے۔

۶- مخطوط کی ایک اضافی تحریر کے مطابق اس کا نام "ترجمہ کلام ابن سینا" ہے۔

۷- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۶ ج دوم میں م ۲۶۳۱/۱۵ کے تحت درج ہے۔ میرے خیال میں درست نہیں ہے۔

۳۲- الاشارات والتنبیہات : ہینڈ لسٹ ۱۸۵۸، ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس
منطق، طبیعات اور الٰہیات کے مباحث شامل ہیں۔ یہ ابن سینا کی آخری تصنیف ہے۔ جسے وہ نااہلوں سے محفوظ
چاہتا تھا[1]۔ سال کتابت ۵۲۰ھ ہے۔

ابن سینا کی اس کتاب کی ایک تلخیص فخرالدین رازی نے 'لباب الاشارات' کے نام سے کی ہے۔ بعد
نصیر الدین محمد الطوسی نے پھر اس کی شرح 'حل المشکلات للاشارات والتنبیہات' کے نام سے کی۔ ابن
المسیحی نے بھی 'شرح الاشارات' کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے[2]۔

یہاں ہینڈ لسٹ ۲۹۳۱/۴۸ کے تحت فہرست 'انہاج وانماط الاشارات'[3] بھی ہے۔ یہ
دو صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ ۱۱ویں صدی

۳۳- الاشارات والتنبیہات (فارسی): ہینڈ لسٹ ۱۸۵۸ - ایک فارسی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔
حالت میں صرف ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں
ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۴- کتاب الشفا[4]: ہینڈ لسٹ ۱۹۰۴/۶ (عربی)، ص ۴۴۰+۴۸۲+۱۶۸
یہ کتاب منطق، طبیعات، ریاضیات اور الٰہیات (حکمت) میں ہے۔ یہاں اس کی تین جلدیں ہیں

کتاب الشفا ابن سینا کی مشہور ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کو انہوں نے امیر شمس الدولہ
کے دربار میں وزارت کے عہدے پر ہوتے ہوئے اپنے شاگرد ابوعبید جوزجانی کے لیے لکھنا شروع کیا تھا۔
ابوعبید جوزجانی نے ابن سینا سے درخواست کی تھی کہ وہ ارسطو کی کتاب کی شرح لکھے۔ جواب میں ابن سینا نے
مجھ کو اس وقت اس طرح کے کام کی فرصت تو نہیں ہے لیکن اگر تم پسند کرو تو ایک ایسی کتاب لکھوں جس میں
جو میرے نزدیک درست ہیں ان کی ترجمانی کروں، نہ تو مخالفوں سے مناظرہ ہو اور نہ ہی ان کے خیالات کی تردید
البتہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابوعبید جوزجانی نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور ابن سینا نے اس کے لیے 'کتاب الشفا'
لکھنا شروع کیا اور تکمیل صرف قوت حافظہ سے کر ڈالی[5]۔

یہاں ہینڈ لسٹ ۲۹۳۱/۴۷ کے تحت فہرست

۱- آئینہ سرگذشت ص ۳۵، شائع کردہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی۔
۲- حکیم سید غلام مہدی کے غیر مطبوعہ مقالے "ابن القف" — "حیات اور کارنامے" سے ماخوذ۔
۳- اس کا اندراج مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز کی کسی بھی جلد میں نہیں ملتا۔
۴- ابن سینا نے اس کو ۱۸ جلدوں میں لکھا ہے۔ "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ورق ۱۸۳ الف قلمی نسخہ۔
۵- آئینہ سرگذشت ص ۱۸۔

کے نام سے ۴ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطہ ہے۔ اس کی کتابت نفیس خط نستعلیق میں ہوئی ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

• ہینڈ لسٹ[1] نمبر ۲۶۴۱/۱۲ ؛ الشفا کا ایک ورق ؛ دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں[2] حکمت کے اقسام اور ان کی ذیلی تقسیم کا بیان ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

• یہاں ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۴۱/۱۳ کا فارسی نسخہ بھی موجود ہے، جو دو صفحات پر مشتمل ہے اور ہینڈ لسٹ ۲۶۴۱/۳۳ ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

• ہینڈ لسٹ نمبر ۲۸۲۲، ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ" کتاب الشفا" کی "الٰہیات" کی بحث پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی ۳۲۶ صفحات ملتے ہیں۔ نفیس خط نستعلیق میں اس کی کتابت عطاء اللہ نے دو شنبہ ۲۳ شوال ۱۰۸۳ھ میں کی ہے۔

۳۵- رسالہ فی تحقیق الزاویہ[3]:- ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۳۱/۱۱[4] (عربی) ص ۳، نستعلیق۔ یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ موجودہ صورت میں ۴ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زاویہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۱ ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۶- الرسالۃ النوروزیۃ: ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۳۱/۱۳[5]، (عربی) ص ۲، نستعلیق، یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ ۲ صفحات اور ۲ فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں موجودات کی ترتیب اور تکوین عالم وغیرہ کا ذکر ہے۔ ۱۱ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۴۱/۳۴[6] بھی ہے۔ یہ ناقص الآخر اور صرف ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۷- رسالہ فی النفس[7]:- ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۳۱/۱۰[8] (عربی) ص ۹، نستعلیق۔ یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۰ فصول ہیں۔ نفس سے متعلق کامیاب بحثیں ملتی ہیں۔ ۱۱ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۱- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۴۶، ج ۲ میں اس کو "ورق واحد من کتاب الشفاء" لکھا گیا ہے اور مجموعہ کا ۱۴ واں مخطوطہ شمار کیا گیا ہے۔
۲- ممکن ہے اس کا نام "مقالہ فی اقسام الحکمت" ہی ہو۔ کیونکہ آئندہ سرگذشت ص ۳۶ پر اس کتاب کا اندراج ہے۔
۳- مخطوطہ میں "رسالہ فی تحقیق حقیقۃ الزاویۃ" تحریر ہے۔ آئینہ سرگذشت ص ۳۱ میں "رسالہ الی سہل المسیحی فی الزاویۃ" کے تحت غالباً یہی رسالہ ہے۔ ۴- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص ۲۵۶ ج ۲ میں یہ نمبر ۲۶۳۱/۶ کے تحت درج ہے۔
۵- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص ۲۵۶، ج دوم میں یہ نمبر ۲۶۳۱/۸ کے تحت درج ہے۔ ۶- مخطوطہ میں ایک اضافی تحریر میں اس کا نام "رسالۃ الشیخ فی بیان مقطعات" درج ہے۔ اس رسالے کا اندراج مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز میں مجموعہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۶۴۱ کے تحت نہیں ملتا۔ ۷- مخطوطہ میں کہیں بھی ابن سینا کا نام درج نہیں ہے۔
۸- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۶، ج ۲ میں اس کا اندراج نمبر ۲۶۳۱/۱۰ کے تحت ہے۔

اشاریہ

خدابخش لائبریری پٹنہ میں ابن سینا کے مخطوطات کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ یہ مخطوطات جن دوسری لائبریریوں پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے:

۱- اجوبۃ المسائل العشرۃ۔ ۲- الادویۃ القلبیۃ۔ رضارام پور، عرفانیہ ٹونک، مکتبہ قولا، حمیدیہ۔ ۳- الارجوزۃ السینائیۃ ۴- الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ۔ ۵- (الرسالۃ) للشیخ فی الاسئلۃ و الجواب، رضارامپور، ۶- الاشارات و التنبیہات، رضارامپور، سلطان احمد استنبول۔ ۷- (رسالۃ) فی تحقیق جوہر الاجسام السماویۃ، رضارامپور۔ ۸- التدارک نوع خطا و التدبیر، آصفیہ، رضارامپور، حمیدیہ۔ ۹- رسالۃ فی معرفۃ ترکیب الروح و النفس الجسد، ۱۰- التعلیقات، رضارامپور۔ ۱۱- رسالۃ فی تفسیر قل اعوذ برب الفلق، رضارامپور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۲- رسالۃ فی تفسیر قل اعوذ برب الناس، رضارامپور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۳- رسالۃ فی تفسیر قل ھو اللہ احد، رضارام پور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۴- مختصر الحدود۔ ۱۵- (الرسالۃ) الفرق بین الحارۃ الغریزۃ و الغریبۃ۔ رضارامپور۔ ۱۶- (الرسالۃ) فی الحروف، رضارام پور، عرفانیہ ٹونک، حمیدیہ ترکی۔ ۱۷- (الرسالۃ) فی حفظ الصحۃ۔ آصفیہ، رضارام پور۔ ۱۸- (رسالۃ) فی تحقیق الزاویۃ۔ ۱۹- (الرسالۃ) فی السکنجبین، آصفیہ، رضارامپور ۲۰- (الرسالۃ) فی شطر الغب، آصفیہ، رضارامپور۔ ۲۱- (کتاب) الشفا- آصفیہ، رضارام پور، آزاد- ۲۲- (الرسالۃ) فی الفصد، آصفیہ، رضارامپور۔ ۲۳- (رسالۃ) الفردوس، حمیدیہ۔ ۲۴- (الرسالۃ) الموسومۃ بالفصول، رضارامپور۔ ۲۵- القانون فی الطب، آصفیہ، رضارامپور، آزاد، ندوہ، دیوبند، دہلی، تہران، استنبول۔ ۲۶- (ترجمہ) قول الحکیم تیاذوق فی حفظ الصحۃ۔ ۲۷- (الرسالۃ) فی القولنج- آصفیہ، رضارامپور- ۲۸- (رسالہ) فی قوی روح الانسان۔ ۲۹- (الرسالۃ) فی الکیمیا، آصفیہ- ۳۰- کتاب المبدأ و المعاد- رضارامپور، حمیدیہ- ۳۱- رسالہ معاد النفس- ۳۲- رسالہ فی النفس- آصفیہ، رضا رامپور، ۳۳- الرسالۃ البروزیۃ- آصفیہ، رضارامپور، عرفانیہ ٹونک، حمیدیہ- ۳۴- الرسالۃ فی الھندباء، رضارامپور-

فارسی مخطوطے: ۱- رسالہ کیمیا-

ابن سینا کی تالیفات کے بارے میں

ایک سوال

اطبائے کرام اور ابن سینا کے ماہرین کی خدمت میں

ابن سینا سے منسوب تالیفات میں سے بہت سی چھپ چکی ہیں، متعدد ایسی ہیں جن کے مخطوطات دنیا کے بڑے مشرقی کتب خانوں میں محفوظ ہیں؛ لیکن کچھ ایسی ہیں جن کے بارے میں یا تو یہ طے کر لینا چاہیے کہ اب ناپید ہیں یا پھر وہ بعض دوسری کتابوں کا جُز بن کر یا دوسرے عنوانات کی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں، ان کا پتا لگانا ہے۔

دوسری طرف ایسے متعدد مخطوطات ہیں جن کا نام "آئینۂ سرگزشت" یا دوسرے قدیم مآخذ میں نہیں ہے۔ اُن کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے کہ ابن سینا کی طرف ان کا انتساب کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

آئینۂ سرگزشت کے پیش نظر، خدابخش مخطوطات کو اولاً، اور دنیا کے مشرقی کتابوں کی فہرستوں کو ثانیاً، نظر میں رکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی

مسامحات

مرآۃ العلوم (فہرست مخطوطات فارسی)

جلد اول:

(۱) کتاب نمبر ۲۴۰ - سطور ۱۷ غلط - ۱۷ صحیح - (صفحہ ۶۱)

(۲) کتاب نمبر ۲۷۶ - بجائے "ہفت رسائل سعدی" "رسالہ ہفت گانہ" باید - صفحہ ۶۷

(۳) کتاب نمبر ۴۰۴ - تعداد اوراق ۸۷ غلط - ۷۸ صحیح (صفحہ ۷۳)

(۴) کتاب نمبر ۴۹۶ - تعداد اوراق ۲۳۹ غلط - ۱۳۶ صحیح (صفحہ ۸۲)

(۵) کتاب نمبر ۵۰۴ - تعداد اوراق ۸۵۴ غلط - ۸۴۶ صحیح (صفحہ ۸۴)

(۶) کتاب نمبر ۵۱۰ - در عنوان نام کتاب لفظ "لیلیٰ" غلط - این کتاب لیلیٰ مجنوں نیست، بلکہ شیریں خسرو است (ص ۸۵)

(۷) کتاب نمبر ۲۹۷ و ہم کتاب ۲۹۸ - و خمسۂ لیلیٰ مجنوں غلط است - نامش مجنوں لیلیٰ است (ص ۵۳)

(۸) کتاب نمبر ۵۲۰ - تعداد اوراق ۳۴۲ غلط - ۲۴۳ صحیح (صفحہ ۸۸)

(۹) کتاب نمبر ۵۶۱ - لفظ عظیم آبادی با اسم مصنف محمد رضا غلط است - رجوع کنید بہ فہرست انگریزی جلد دوم در تحت EAST ADDITIONS NO 424 در ضمیمہ فہرست ہذا (صفحہ ۹۲)

(۱۰) کتاب نمبر ۶۵۰ - نمبر فہرست انگریزی ۸۸۱ غلط - ۲۸۷ صحیح (صفحہ ۱۰۰)

(۱۱) کتاب نمبر ۳۰۶ - تعداد اوراق ۴۶ غلط - در فہرست انگریزی مجلد دوم در تحت کتاب نمبر ۲۴۳ تعداد اوراق ۲۹۴ نوشتہ، این ہم غلط است - تعداد اوراق ۱۳۲ صحیح (صفحہ ۱۰۵)

(۱۲) کتاب نمبر ۶۸۱ - تعداد اوراق ۱۱۵ غلط - ۱۵۱ صحیح (صفحہ ۱۰۷)

جلد دوم:

(۱) کتاب نمبر ۱۸۰۳ - تعداد اوراق ۲۴۰ غلط - ۲۴۶ صحیح (صفحہ ۴۶)

(۲) کتاب نمبر ۱۸۶۷ - در کالم نمبر کتاب انگریزی ۱۷۰۰ غلط - ۱۸۸۰ صحیح (صفحہ ۶۱)

(۳) کتاب نمبر ۱۸۶۸ - در کالم نمبر کتاب انگریزی ۱۷۵۰ غلط - ۱۸۵۰ صحیح (صفحہ ۶۱)

(۴) کتاب نمبر ۱۹۰۲ - نام مصنف میر غلام حسن دہلوی غلط - این دیوان غلام حسن بیتھوی است - رجوع کنید

به مضمون نوشتهٔ دکتر ظهور رضوی برق در خدا بخش لائبریری جرنل، شمارهٔ ۱۲ - درین مضمون نام مصنف غلام حسین غلط. نامش غلام حسن است. (صفحه ۶۷)

(۵) مجموعهٔ کتب نمبر ۱۹۷۴ تا ۱۹۸۰ - نام این کتاب این مجموعه آیینهٔ جهان نما است. ر.ک. به فهرست انگریزی، جلد ۳۱ ص ۲۱۸ - (صفحه ۸۲)

(۶) کتاب نمبر ۱۹۹۲، این دیوان وفاست که با مثنوی بشارة الامامت نمبر ۱۹۹۱ باهم مجلد شده. بشارة الامامت تصنیف غلام حسین طباطبائی مصنف سیر المتاخرین است که وفا تخلص میکرد. اینا دیوان از تصنیف اوست. ر.ک. به تذکرهٔ ریاض الوفاق. (صفحه ۸۶)

(۷) کتاب نمبر ۱۹۹۶ - این بیاضیست که دارای تصانیف مختلف است، از آن جمله سبو سپارهٔ زلالی هم است، ولی شش مثنویات شان نقل شده و مثنوی هفتم که "محمود و ایاز" نام دارد درین مجموعه منقول نیست، صرف دیباچهٔ این مثنوی است. (صفحه ۱۰۴)

(۸) نمبر فهرست فارسی در کالم اول ۱۰۱۷ درج شده - ۲۰۱۷ باید. (صفحه ۱۱۰)

●●

مراسلات

استدراک

ابوالکلام آزاد کے خط کے بارے میں

خدابخش لائبریری میں ابوالکلام آزاد کا ایک خط محفوظ ہے جس کا عکس "جرنل" کے شم... میں شائع ہو چکا ہے۔ یادداشت کے لیے اس کا متن حسب ذیل ہے:

۱۱ - کولوٹولا اسٹریٹ، کلکتہ

"جناب مکرم! افسوس ہے کہ کثرت کار اور ہجوم احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ ... ہوں۔ پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ چکی ہے اور صرف ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہے۔ میں اس کو بھی ... کر دیتا مگر ہجوم احباب ایک گھنٹہ کی فرصت نہیں دیتا۔ اس لیے آج شام کو ڈھاکہ روانہ ہوں گا اور پہلی جنوری ... یقیناً واپس آ جاؤں گا۔ پہلی سے ... کا کام وقت ہوا اور انشاء اللہ بہت جلد قیام پریس کی صورت ہو جائے گی۔

لیکن ایک نہایت ضروری معاملہ ہے جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورتیں ... ہوتیں تو میری خودداری اس خط کے لکھنے سے سخت مانع آتی۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق "اخبار" مجھے اس وقت پیشگی دیدیں، بشرطیکہ پیشگی دینے ... مانع نہ ہو۔ ڈھاکہ سے واپسی پر اخبار جاری ہو جائے گا اور انشاء اللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہو جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر نہ ہوگا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ یہ پیشگی رقم اس وقت میرے لیے ایک نہایت ... اور بیحد مفید رقم ہوگی۔

اسکے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کی دوستانہ توجہ کا ممنون ہوں۔

ابوالکلام آزاد
۲۵ دسمبر ۱۹۰۶ء

اس خط کی اس لائبریری میں موجودگی کی تقریب یہ ہے کہ اس خط کے مکتوب الیہ اخبار "دارالسلطنت" (کلکتہ) کے ... مولوی کبیرالدین احمد خدابخش خاں کے خسر تھے، یعنی ان کی تیسری بی بی راضیہ خاتون کے والد۔ راضیہ خاتون کے بارے میں ... کے شمارہ ۵ میں ان کے دواوین کے تعارف کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے۔ شمس العلماء خان بہادر مولوی کبیرالدین احمد کے ... نام "اردو گائیڈ پریس" (پریس کا نام پہلے "مطبع مظہر العجائب" تھا) اور اخبار کا نام "اردو گائیڈ" تھا۔ عتیق الر... صاحب[1] نے اس کے بارے میں مندرجہ ذیل اطلاعات فراہم کی ہیں:

"اخبار اردو گائیڈ ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ اردو کا سب سے پہلا روزنامہ ... یہ ٹائپ میں چھپتا تھا اور دو ورقی تھا۔ بعد میں مولوی صاحب نے ایک دوسرا اخبار "دارالسلطنت" ... نام سے نکالا۔"

۱۔ سید عتیق الحسن صاحب کی مفید کتاب کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور انکی مطبوعات: ایک تذکرہ، اگو ۱۹۸۲ء میں عثمانیہ بکڈپو کلکتہ ...

مثنوی خوابِ حسرت عرف پٹنے کی کہانی

"حسرت[1] تخلص، غلام رسول نام، محلہ چوراہا آغا حسینا عظیم آباد کے رہنے والے۔ ولادت ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ اس وقت ۴۱ سال کی عمر ہے۔ مشہور شوقی شاہ کے نواسے ہیں۔ ترکہ میں شان فقیری و قناعت اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔ کاکل رکھتے ہیں۔ بیماروں کے علاج بھی کر لیتے ہیں۔ فال تعویذ میں بھی دخل ہے۔ صناع و محنتی آدمی ہیں۔ تقریباً ۱۵ سال سے مشق سخن کرتے ہیں۔ برادر شاد سے تلمذ رہا۔ دیوان مرتب ہے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ کلام اچھا اور درد میں ڈوبا ہوا، پُر درد، مؤثر ہوتا ہے۔ لکنت کی وجہ کر پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔"

(گلشن حیات: از قیس نمبر ۱۹۲۵ء)

حمدِ خالق میں سرنگوں ہے قلم — جس کے انصاف سے سوا ہیں کرم
سرِ تسلیم آپ جھکتا ہے — کب یہ اوروں کے در پہ جھکتا ہے
اس کے محبوب کی ثنا کیا ہو — آپ خلاق جس کا شیدا ہو
آل و اصحاب کی جو مدح کروں — زندگی بھر لکھوں تو پھر نہ لکھوں
بس ہے اپنے لئے یہی تحریر — پڑھ لو قرآں میں آیۂ تطہیر
گو کہ یہ داستاں پُرانی ہے — گو کہ دھندلی سی اِک نشانی ہے
عبرت انگیز یہ نصیحت ہے — خوب دلچسپ یہ حکایت ہے
ایسا گلزار تھا عظیم آباد — شاد ہوتا تھا دیکھ کر ناشاد
رشکِ جنت تھی ہر گلی اس کی — کیا بتاؤں بہار کیسی تھی!
نہر گنگا کی اک طرف جاری — اک طرف تھی بہار "جلّے" کی
عیش و عشرت کے ماسوا اس میں — کب گزر غم کا تھا ذرا اس میں
کون ایسا یہاں تھا — تھا نہ مسکن جہاں رئیسوں کا
شہر گلزار تھا گلی آباد — رہنے والے یہاں کے سب تھے شاد
دن کو ہولی کا چہچہا تھا صدا — رات کو تھا سماں دیوالی کا
مفلسی اور تنگدستی کا — نام لینا بھی عار تھا گویا
جو تھا خوش حال تھا بہر صورت — مطمئن دل تھا پاس تھی دولت
ہے جو پٹنے میں اک پٹن دیبی — وہ بنا کردہ ہے اشوکا کی

۱- حسرت نے نومبر یا دسمبر ۱۹۴۱ء میں رحلت کی اور آغا حسینا کی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ (مکتوب گرامی جناب محمود علی خاں صبا شاگردِ شوق)

شہر کیا ہے کہ اک نشانی ہے — راجہ پاٹن کی راجدھانی ہے
شہر میں دو بڑے تھے دروازے — یہ بنائے گئے تھے حکمت سے
ایک پورب کا، ایک پچھم کا — فوج رہتی تھی اس پہ پہرا تھا
ہیں بزرگوں کی تربتیں بھی یہاں — جس کے باقی ہیں بعض بعض نشاں
شاہ جنگلو کے، شاہ مجنوں کے — ہیں پرانے بہت ہی دو تکیے
ہے محلہ یہاں جو مچھرٹا — داتا لنگن کا ہے وہاں روضہ
وہ جو مشہور شاہ ارزاں ہیں — سارے ولیوں کے آپ دیواں ہیں
سوئے ہیں خاک میں یہیں کی آہ — شاہ کالے بھی اور چھتا شاہ
شاہ حمزہ کا، شاہ باقر کا — متبرک ہے شہر میں تکیہ
ایک ڈنڈیا سنار جمرو تھا — ہے جو بانی امام باڑے کا
رکھی ایسی خلوص سے بنیاد — جس نے مانگی یہاں بر آئی مراد
اہل دل تھا نہ کوئی نوذر سا — ٹکسی منڈی میں ہے مزار ان کا
کیا زمانے نے غیر حالت کی — لوح تک مٹ گئی ہے تربت کی
ڈھائی کنگورے کی بھی مسجد کا — ہے یقیں نام تو سنا ہوگا
پڑھ لو تاریخ صاف ہے لکھی — ہے وہ تعمیر دور بابر کی
مسجد شیر شاہ اگر دیکھو — تم باللہ تم کو حیرت ہو
وہ جو مسجد یہاں ہے پتھر کی — ہے وہ شاہ جہاں کی بنوائی
ہے جو مسجد حسینی بیگم کی — تھا اسی میں امام باڑا بھی
اینٹ ایسی لگائی تھی اس میں — بال کی کب رسائی تھی اس میں
تولیت اس کے ہاتھ میں آئی — کی شہادت امام باڑے کی
وقف نواب کا ہے حال زبوں — کیا کہوں اور کس زباں سے کہوں
اس عمارت کا بھی ہے حال تباہ — ایک عبرت کا ہے مرقع آہ
بوا جی کی جو ایک "بولی" تھی — آپ ہی تھی نظیر وہ اپنی
کتنے اللہ والے ایسے تھے — فیض جاری ہے جن کی تربت سے

تھے جو کاظم علی خاں نواب — ان کی مسجد کا بھی ہے حال خراب
منشی کاظم علی جو تھے مشہور — جا بجا سے ہے وہ بھی مسجد چور
دیکھو عزت حلال پیسے کی — دیکھو برکت حلال پیسے کی
اک ضعیفہ جو سوئی والی تھی — مسجد اس نے بھی ایک بنوائی
کوئی شاعر ہے آج بیدل سا — اب کوئی بھی ہے مثل راسخ کا[1]
خود غرض سے ہے آج بھی نفرت — آب گل میں ہے آج تک لذت
جیسی ترکاریاں یہاں کھائیں — ہند بھر میں نہ ویسی ہاتھ آئیں
مالدہ آم میرے پٹنے کا — کہیے اس کو بہشت کا میوہ
ہے عرق یا قوام کا شیرہ — نرم شیریں ہے اس قدر گتا
شوق دیکھو شتاب رائے کا — ایسا پٹنے میں باغ بنوایا
بیل انگور کی لگائی جب — شاخ اس کی ثمر بھی لائی جب
تھے وہ انگور مثل کابل کے — اس سے شاداب ویسے ہی میٹھے
وصف اس کا میں کیا کروں تحریر — شہر اپنا تھا خطۂ کشمیر
تھا یہی شہر یہ بہار افسوس — یا ہے اُجڑا ہوا دیار افسوس
یاد آتے ہیں وہ بزرگ و امیر — آج ملتی نہیں ہے جن کی نظیر
ہے محلہ یہاں جو حاجی گنج — تھے یہیں تو رئیس نکتہ سنج
میر عباس، میر محسن کا — کُل رئیسوں میں نام روشن تھا
تھے جو جعفر حسین خاں مغفور — ہیں سخاوت میں آج تک مشہور
کتنے مفلس غریب پلتے تھے — کتنی بیواؤں کے وظیفے تھے
اب کوئی ہے نہ شاد سے بڑھ کے — دُور آخر کے میر ثانی تھے
ہے دول پورہ اک محلہ جو — پہلے کیا تھا نہ یاد ہے مجھ کو
خواجہ گوہر علی سادہ نواب — جن کے دم سے کھلی تھی راہ ثواب
کتنے بیکس یتیم پلتے تھے — سب نمک خوار تھے ریاست کے
میر سنگی بھی اور آغا میر — باحیا باکرم تھے باتوقیر
وہ علی میر تھے جو خوش القاب — ہوگا کیا کوئی اس سخی کا جواب
شیخ ہادی بھی اور نصیرالدین — ان کی تمثیل کیا ملے گی کہیں

۱- شاعر کے قلم سے دوسرا وزن: نام روشن ہے اب بھی راسخ کا

تھے جو عبدالرحیم خوش انجام
اُن کا چرسے کا تھا یہاں گودام

گویا حاتم تھے وہ سخاوت میں
کم نہیں تھے کسی سے دولت میں

تھے جو محلی میں وہ نہال حسین
یاد ان کی بھی کرتی ہے بے چین

اور اُن کا بھی فیض جاری تھا
شاد کرتے تھے دل غریبوں کا

ہے جو کٹرا شائستہ خاں کا یہاں
ہائے رہتے تھے خواجگان وہاں

خواجہ عتیق تھے، خواجہ یوسف تھے
کیا لکھوں وصف ان بزرگوں کے

ان کی جا اب ہیں خواجہ ابراھیم
ہیں وہ ڈپٹی ذکی خلیل و فہیم

ان بزرگوں کے نام لیوا ہیں
باحیا، باکرم سراپا ہیں

ان کے اخلاق کی، مروّت کی
مجھ سے توصیف ہو نہیں سکتی

اِک محلہ یہاں ہے جھاؤ گنج
تھے وہاں پر بھی چند نکتہ سنج

وہ جو تاجر وہاں تھے اچھے خاں
ان کو تو جانتا ہے ہر انساں

ان کی پٹنے میں تھی بڑی عزت
تاجروں میں تمام تھی شہرت

تھا سخاوت کا موجزن دریا
ان کا ہر روز فیض جاری تھا

ہے نہ ثانی گمائی خاں کا آج
تھا سخاوت کا سر پہ ان کے تاج

بیوہ بیکس کی وہ خبر لیتے
جتنا جو مانگتا وہی دیتے

سنگی دالان جو محلہ ہے
اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا ہے

تھے وہاں بھی رئیس باحشمت
سب غنی دل تھے، پاس تھی دولت

وہ منارام جو مہاجن تھا
للّو بابو کا گویا ثانی تھا

اس نے شادی میں اپنے بیٹے کی
سارے پٹنے کی دل سے دعوت کی

میر عبدالسعید امیر کبیر
نام آور تھے اور باتوقیر

جس نے "فتنہ" میں اپنے بیٹے کے
کیا ہی بے مثل طغرے بنوائے

ہر محلے میں حصہ آیا تھا
تھا ہر ایک خوان تین گنج کا

قلعہ مشہور ہے لب گنگا
تھا محل بھی اسی جگہ ان کا

اب نہیں وہ رئیس گزری کے
تھی غریبوں کی پرورش جن سے

کی تواضع ہر ایک کی زر سے
کوئی خالی پھرا نہیں در سے

وہ محمد نواب با اخلاق
آج تک ہیں وہ شہرۂ آفاق

تھے جو نواب میر لطف علی — مدح توصیف کیا لکھوں ان کی
اشرفی کے وہ ٹکڑے کٹوا کے — پاس اپنے ہمیشہ رکھتے تھے
سائلوں کو مدام دیتے تھے — اور جنت وہ مول لیتے تھے
ہے ولایت علی سا کون امیر — لاٹ صاحب نے جن کی کی توقیر
ان کی صحبت تھی یا کوئی دربار — مرجع خلق تھی وہی سرکار
تھے وہ کاظم علی خاں ثانی — ہائے صورت وہ ان کی نورانی
ان کی تہذیب کو سخاوت کو — مختصر بھی لکھوں تو دفتر ہو
تھے جو محبوب خاطر احباب — نام تھا جن کا بادشاہ نواب
ہوں گے پیدا رئیس کب ایسے — نرم دل تھے غریب پرور تھے
ہے یہیں اک محلۂ دیواں — ہندو مذہب کے تھے رئیس وہاں
نند لال اور رائے سلطاں تھے — جن کے جد ناظموں کے دیواں تھے
رائے رادھا کرشن ذی رتبہ — وہ بھی ٹپنے کے گویا تھے راجا
وہ مغل پورہ ہے محلہ جو — حال اس کا سناؤں کیا تم کو
اس محلے میں تھے رئیس ایسے — دل بھر آتا ہے ذکر سے جن کے
لوگ کھاتے قسم تھے قسمت کی — انتہا تھی نہ کوئی دولت کی
جانے کیا جرم کیا گناہ ہوا — وہ محلہ بھی سب تباہ ہوا
تھا رئیسوں کو شوق ورزش کا — اس میں محنت تھی دل بہلتا تھا
فن میں بنوٹ کے کوئی تھا فائق — کوئی گدکے پھری کا تھا شائق
تھے جو یوسف علی خاں نواب — ان سے واقف ہیں شہر کے احباب
پہلوان خوشنویس شاعر تھے — ایسے بیسوں فنوں کے ماہر تھے
سب کو بے حد لحاظ تھا ان کا — کون ان کا ادب نہ کرتا تھا
تھے مغل پورے میں علی مرزا — ننھے آغا سے ربط از حد تھا
سب کو حیرت میں ڈالا دونوں نے — ایسا خیمہ بنایا دونوں نے
توڑ کر اس کو ہاتھ میں لے لو — پھر ہے خیمہ جو کھول کر دیکھو
ننھا صاحب صدر گلی والے — خوشنویس و رئیس شاعر تھے

میرے اُستاد سے تلمذ تھا　　لکھنؤ میں یہ اُن کا تھا شہرا
ہر غزل میں عجب صفائی ہے　　نوح نے کیا زبان پائی ہے
گویا اُستاد کی نشانی تھے　　مختصر یہ کہ شاد ثانی تھے
وہ جو اُستاد بھائی تھے بیتاب　　جن کو روتے ہیں آج تک احباب
تھے جو راجہ یہاں نظامت کے　　امری پرشاد ان کے پوتے تھے
معتقد بھی تھے شاد نامی کے　　تھے ثنا خواں اسی گرامی کے
صاف گو تھے وہ پاک طینت تھی　　کیا طبیعت تھی، کیا سخاوت تھی
تھے جو اس شہر میں کنور سکھراج　　ان سے پلتے تھے مفلس و محتاج
عربی، فارسی کتابوں کا　　کیا کتب خانہ ان کے گھر میں تھا
اچھے احباب، آپ اچھے تھے　　سچے احباب، آپ سچے تھے
صاحب علم قدر دانِ کمال　　تھے وہ رتبہ شناس شانِ کمال
وہ زمین دار 'لودی کٹرے' کے　　شہر میں اک بہار تھی جن سے
سب شریف و نجیب باتوفیق　　منکسر خوش مزاج اور خلیق
پیارے صاحب 'لنگھیا ٹولے' میں　　میر کچھو تھے 'لودی کٹرے' میں
تھے مبارک حسین ایسے رئیس　　ہوں گے اب حشر تک نہ ویسے رئیس
آہ دشہ لال کی ثنا کیا ہو　　حق تو یہ ہے رئیس ایسا ہو
وہ جو یوسف حسین صاحب تھے　　تھے وہ مرحوم اچھوں سے اچھے
جس سے کی دوستی نباہ دیا　　منہ سے جس کو جو کہہ دیا وہ کیا
ہوگا اب ان کا کوئی کیا ثانی　　تھے کفایت حسین لاثانی
میر واجد حسین باتوقیر　　ان کی بھی دل پہ نقش ہے تصویر
تھے خدا بخش خاں وکیل یہاں　　ہیں کتب خانے کے وہ روحِ رواں
دیکھئے تو طلسم خانہ ہے　　کیا کتابوں کا اِک خزانہ ہے
تھے جو مرحوم مولوی یحییٰ　　کہیئے دریا انہیں سخاوت کا
دارِ عقبیٰ میں گھر بناتے تھے　　جو کماتے تھے وہ لٹاتے تھے
کیسے کیسے طبیب تھے اگلے　　تجربہ کار تھے، مسیحا تھے

ہو گا عبد الحمید سا نہ حکیم　　عالم و فاضل و فہیم و عظیم
میر کاظم حسین صاحب نے　　معرکوں کے بہت علاج کیے
میرے پٹنے میں تھے وہ کاریگر　　شہر والوں کو ناز تھا جن پر
میں نہ بھولوں گا نام گرگن کا　　اس نے کمپاس اک بنایا تھا
ایسی ایجاد ایسی صنعت تھی　　اہل یورپ کو جس پہ حیرت تھی
متصل یاں شہر میں ہیں میرے چار　　ان بزرگوں کا ہے اسی پہ مزار
پیر معروف مہدی و منصور　　شاہ نوذر سا اہل دل مغفور
ہے جو بیرون شہر اک بستی　　متبرک ہے، نام ہے 'جھٹلی'
جلوہ گر ہیں وہاں پہ دو مخدوم　　اہل پٹنہ کو خوب ہے معلوم
پیر جگجوت حضرت صوفی　　دھوم دونوں کی ہے کرامت کی
پنج شنبہ کو لوگ جاتے ہیں　　ان بزرگوں سے فیض پاتے ہیں
ان کی روحوں سے میں ہوں شرمندہ　　نام جن جن کا میں نے سہو کیا
میں نے کی ہے یہ مختصر پہ نظر　　پاؤں پھیلائے دیکھ کر چادر
عرض ہے ناظرین والا سے　　سب کے ناموں پہ فاتحہ دیدے
اب اسی شہر کی یہ حالت ہے　　اب اسی شہر کی یہ نوبت ہے
جس طرف کو نگاہ جاتی ہے　　ہو کے مغموم لوٹ آتی ہے
کب کسی کو شگفتہ دل دیکھا　　جس کو دیکھا تو مضمحل دیکھا
ایسا برباد ایسا ناس نہیں　　شہر اتنا کوئی اداس نہیں
نغمہ خواں عندلیب جس جا تھے　　اس جگہ اب ہیں جھوجھ الّو کے
کل جہاں پہ تھے محل عالیشاں　　آج گیدڑ رہیں یا سیار وہاں
خشت کہنہ کا ہے کہیں انبار　　یا کہیں پہ گری ہوئی دیوار
تھے جہاں پھول سے بھرے تھالے　　اب وہاں پہ ہیں ڈھیر کوڑے کے
ہے یہ گلیوں میں حال کیچڑ کا　　جیسے دیوار کا ہے گارا
تنگ و تاریک ہے گلی کوچہ　　شہر میں اس طرح کا سناٹا
جا بجا کھیت اب ہیں گوبی کے　　یا گدھے لوٹتے ہیں دھوبی کے
بند بازار ہے تجارت کا　　بے زری میں ہے سب کا دل مردہ

بڑھ گئی جاہلوں کی اب تعداد　　مل گیا خاک میں عظیم آباد
بوئے الفت سے دل ہوئے خالی　　اب مروّت سے دل ہوئے خالی
اب کہاں عاشقی کے چرچے ہیں　　سب ہی اپنی غرض کے بندے ہیں
زر سا مشکل کشا جو غائب ہو　　کون پھر پوچھتا ہے نطفے کو
چین و آرام سے نہیں کوئی　　ایک حالت ہے اعلیٰ ادنیٰ کی
قحط سے غیر سب کا حال ہوا　　گھر مریضوں سے اسپتال ہوا
جن کو تم اہلِ زر سمجھتے ہو　　فکر سے بے فراغ کب ان کو
اب نہیں اتّفاق آپس میں　　رہ گیا ہے نفاق آپس میں
حرص کے ہیں غریب بیماری　　اور امیروں پہ بے حسی طاری
منصفی، منصفی سے خالی ہے　　بھینس اس کی ہے جس کی لاٹھی ہے
جھوٹ تائید کرنا اچھا ہے　　کیا خوشامد پسند دنیا ہے
ایسی پھیلی وبا خیانت کی　　قدر جاتی رہی دیانت کی
جب سے گونجی صدائے آزادی　　کرتے ہیں اب رذیل غدّاری
اک تو نایاب خود شرافت ہے　　پھر شرافت کا نام ذلت ہے
مٹی کے مول بکتی ہے ہڈی　　قدر کیا خاک ہو شرافت کی
ہنستے ہیں عاقلوں پہ اب جاہل　　بنتے ہیں بیوقوف اب عاقل
اب ہے مسجد کی جا پہ میخانہ　　مذہبی آدمی ہے دیوانہ
گو حقارت ہو خواہ ذلت ہو　　زر کمانے کی کوئی صورت ہو
اس کو خلوت ہی کیا ہے، جلوت کیا　　جس نے پردہ جلا کے خاک کیا
کیا زمانے کی عقل اُلٹی ہے　　عین تہذیب بدتمیزی ہے
اب مساوات کی یہ منزل ہے　　باپ بیٹے کا فرق مشکل ہے
کیوں نہ دنیا کی غیر حالت ہو　　بیوقوفی، کہیں مروّت ہو
غیر پر زر کے مینھ برستے ہیں　　اور حقدار سب ترستے ہیں
اس میں مطلق نہیں ہے بوئے ریا　　میں نے جو کچھ کہا، وہ دل سے کہا

میری گستاخیاں معاف کریں
اپنے حسرت سے دل کو صاف کریں

سیّد برکات احمد

• **ڈاکٹر سید برکات احمد** (پ ۱۹۱۹ء) دہلی یونیورسٹی سے ایل۔ ایم۔ بی اور سٹرنی یونیورسٹی سے انگریزی (لسانیات) میں ایم۔ اے، امریکن یونیورسٹی بیروت (لبنان) سے تاریخ عرب میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور تہران یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ڈی۔ لٹ۔ مادری زبان اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، جرمن اور ترکی زبانوں سے بھی واقفیت ہے۔ وزارت خارجہ حکومت ہند کے تحت امریکا، یورپ، آسٹریلیا اور مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں ہندوستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں اور اقوام متحدہ اور اس کی مختلف افریقی و ایشیائی کمیٹیوں میں ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے رکن رہے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ آپ کی تصانیف میں "جنوبی افریقہ میں قیدیوں پر مظالم" اور "محمدؐ اور یہود" (انگریزی) "خلفائے عباسیہ" (اُردو) قابل ذکر ہیں۔ "قرآنی عربی کا تعارف" (اُردو) زیر طبع ہے۔

••

دلّی کے ایک رئیس جن کے والد محترم کا جامعہ سے گہرا تعلق تھا، صاحب ذوق آدمی تھے۔ گو کتابوں کا شوق خود بھی تھا مگر کتابوں کا بیشتر ذخیرہ انھوں نے والد سے وراثت میں پایا تھا۔ اُن کی داشتہ بھی نہ صرف حسین تھیں، خوش آواز تھیں، بلکہ شعروں کا بھی اچھا ذوق رکھتی تھیں اور دیوانوں کا سارا انتخاب، میرا مطلب اشعار کے مجموعوں سے ہے، ان کے دیوان خانے میں تھا۔ مجھے اس دیوان خانے میں شرف باریابی حاصل تھا۔ میرا لڑکپن تھا جو کچھ ملتا پڑھ ڈالتا۔ ایک دن ایک چھوٹی تقطیع کا دیوان نظر آیا۔ پڑھ تو لیا سمجھ میں بہت کم آیا۔ مگر اس کا کاغذ، طباعت اور سرخ حاشیہ دل کو بھا گیا۔ خریدنے کی کوشش کی مگر نہ ملا۔ چوری کی ہمت نہ ہوئی، چنانچہ مانگ لیا اور اس کے بعد واپس نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میرا کتب خانہ لُٹا تو خدا جانے یہ دیوان کس طرح بچ رہا۔ یہ غصب شدہ دیوان اب بھی میرے پاس ہے۔ غالب اور ذاکر حسین سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ذاکر حسین نے برلن کے زمانہ قیام میں یہ دیوان خود کمپوز کر کے مطبع قادیانی میں چھپوایا تھا۔

کچھ دنوں بعد خالدہ ادیب خانم کے ہندستان آنے کا شہرہ ہوا۔ جامعہ اُن دنوں قرول باغ میں تھی اور قرول باغ جانا آسان کام نہ تھا۔ ٹریم صدر بازار سے گذرتی دِلّی کی آخری سرحد پر ختم ہو جاتی، وہاں سے تانگہ لیا جاتا اور لوگ خاک پھانکتے، دھکّے کھاتے جامعہ پہنچتے۔ میں بھی خالدہ ادیب کا لیکچر سننے گیا۔ اُن دنوں میری معلومات ایسی ویسی ہی تھیں اور یہ معلوم نہ تھا کہ ترکی کی تین مشہور لطیفہ، نسیبہ، اور خالدہ میں کون کون ہے اور ان کا مصطفےٰ کمال پاشا سے کیا رشتہ ہے۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ ہال تقریباً خالی تھا۔ چنانچہ میں سب سے اگلی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو کسی نے کچھ پرسش نہ کی مگر جب معززین حسب دستور آخر میں آنے شروع ہوئے تو جلسے کے ایک مہتمم صاحب نے مجھے اپنی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا میں یہاں سب سے پہلے آیا ہوں اور مجھے اپنی جگہ انتخاب کرنے کا سب سے زیادہ

حق ہے۔ ہال بھر چکا ہے۔ اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں نہ صرف یہ کرسی چھوڑ دوں بلکہ پورے لکچر کے دوران کھڑا رہوں۔ اس کشاکشی کو سُن کر ایک باریش اور وجیہ صاحب تشریف لائے۔ واقعہ دریافت کیا۔ فرمایا آپ تشریف رکھیے۔ جن معزز مہمان کے لئے مجھ سے کرسی خالی کرائی جا رہی تھی انہوں نے ان کو اپنی کرسی پر جا کر بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تو میں اپنی کرسی پر ڈٹا بیٹھا رہا اور اس کے بعد اپنی حرکت پر شرمندگی کا احساس ہوا اور میں ان باریش بزرگ کے پاس گیا۔ عرض کیا آپ میری کرسی پر تشریف رکھیے۔ میں کھڑا رہوں گا۔ انہوں نے فرمایا کیا بہتر ہو ہم دونوں ہی کھڑے رہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ کرسی بھی بھر گئی اور یہ بزرگ کہیں چلے گئے۔ بعد میں میں نے انہیں اسٹیج پر دیکھا۔ پھر معلوم ہوا کہ دیوانِ غالب کے کمپوزیٹر یہی صاحب ہیں۔ خالدہ ادیب کی تقریر تو یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ انہوں نے اسٹیج کے ایک گوشے سے تقریر شروع کی تھی۔ اور جوش خطابت میں سارے اسٹیج کو ایک مشاق بلا کی طرح دس بارہ جملوں میں ناپ لیا اور دوسرے گوشے میں پہنچ گئیں۔ جلسہ جب ختم ہوا تو میں ذاکر صاحب کے پاس گیا، اپنی بدتمیزی کی معافی چاہی اور عرض کیا، جلسے میں آنے کا بڑا مقصد آپ کو دیکھنا آپ کی کمپوزنگ اور ذوق کی داد دینا تھی۔ اپنی حماقت سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یائے مجہول اور یائے معروف کا فرق ملحوظ رکھتے تو بہت اچھا ہوتا۔ مسکرائے اور کہنے لگے اور بھی بہت سی غلطیاں تھیں اب میں کیا کہتا کہ ان غلطیہائے مضامین کو سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں۔ یہ نسخہ کیونکہ نایاب ہو چکا تھا اس لیے دریافت فرمایا مجھے کس طرح ملا۔ میں نے قصہ سنایا۔ فرمایا بھائی آپ نے تو صرف ایک دیوان لے کر ہی واپس نہیں کیا۔ بعض حضرات نے تو پورے کتب خانے اسی طرح بنا لیے۔ اس کے بعد ایک ایسی بات بتائی جس سے میرے دیوان کی قیمت اور بھی بڑھ گئی۔ یہ دیوان ذاکر حسین نے ہی رئیس موصوف کے والد کو پیش کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد مولانا شوکت علی دلی تشریف لائے اور قرول باغ میں قیام فرمایا۔ میں ان دنوں دریا گنج میں رہتا تھا۔ ٹریم اور تانگے کے سفر سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ مولانا کے نواسے شاکر ماجد علی خاں کے ساتھ قرول باغ گیا۔ شوکت علی موجود نہ تھے، کچھ دیر تو ہم نے انتظار کیا۔ میز پر بسکٹوں کا ڈبہ رکھا تھا۔ شوکت علی اچھا کھانے اور خاص کر میٹھے کے شوقین تھے۔ ڈبہ بھی ہنٹلی اینڈ پامرز کے assorted بسکٹوں کا تھا۔ شاکر اٹھا لائے اور ہم دونوں نے بسکٹ منتخب کر کے کھانے شروع کر دیے۔ اتنے میں ذاکر حسین بھی شوکت علی کی تلاش میں آئے۔ ہم دونوں نے یہ ڈبہ ذاکر حسین کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ میں نے کچھ

جھینپ کر کہا چوری کا مال ہے۔ فرمایا "نوش جان"۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا اب غضب کے بعد سرقے کی نوبت آگئی۔ میں نے کہا کھانے کا سامان چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ ہماری تالیف قلب کے لیے ذاکر صاحب نے ایک چاکلیٹ بسکٹ لیا اور فرمایا چوری کا مال ویسے بھی مزیدار ہوتا ہے۔ اتنے میں شوکت علی آگئے اور ہنٹلی اینڈ پامرز کا یہ پورا ڈبہ چائے کے ساتھ اُڑ گیا۔ شوکت علی کے پاس محمد علی لاہوری کا انگریزی کا احمدی ترجمۂ قرآن تھا اور قرآن کریم کا یہ نسخہ مولانا محمد علی کامریڈ کی زیر تلاوت رہتا تھا۔ جیل میں بھی ان کے پاس یہی نسخہ تھا۔ اس نسخے کے حاشیے پر محمد علی کامریڈ کے لکھے ہوئے نوٹ تھے۔ مثلاً ایک آیت کے حاشیے پر لکھا ہوا تھا۔ رات بھر درد اور بے قراری میں گذری۔ صبح تلاوت کے وقت اس آیت پر پہنچا رقت طاری ہوگئی اور درد اور بیقراری سے نجات مل گئی۔ میری اس نسخے پر نظر تھی۔ یہ نسخہ کتابوں کی کھلی الماری میں پڑا ہوا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے کسی کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ یہ collector's item ہے۔ ایک مرتبہ اس نسخے کے فراق میں گیا تو معلوم ہوا گھر پر کوئی نہیں اور مکان بند ہے۔ قرول باغ کا سفر اور اس کی کوفت۔ واپسی کے لئے کوئی سواری نہیں۔ اس خیال سے گیا تھا کہ شاکر اپنی موٹر میں ٹریم کے ناکے تک پہنچا دیں گے۔ اسی ادھیڑ بن میں ذاکر حسین کا خیال آیا۔ مکان پہ پہنچا تو انداز کچھ مرغی خانے کا ہوا۔ باہر مرغیاں ایک طرف بکری اور ایک خالی پلاٹ پہ کتوں کا اجتماع گویا جلسے کی تیاری میں مشغول ہوں۔ ذاکر حسین موجود تھے۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ کھانے کے لیے روک لیا۔ میں نے محمد علی کے قرآن کا تذکرہ کیا۔ فرمانے لگے 'کیا دیوان غالب والا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کی شوکت علی کے پاس ضائع ہو جائے گا۔ گرد پڑی ہوئی ہے اور اس طرح رکھا ہے کہ جس کا دل چاہے لے جائے۔ فرمایا اسے جامعہ لائبریری کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔ میں نے کہا بہت خوب۔ چنانچہ یہ ٹھہرا کہ ذاکر حسین، شوکت علی سے یہ نسخہ مانگ لیں گے۔ کچھ دنوں بعد شوکت علی کا انتقال ہو گیا۔ معلوم نہیں قرآن کریم کا یہ نسخہ اب کہاں ہے۔

اس کے بعد ملاقات ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں ہوئی۔ پرانا قلعہ اور ہمایوں کا مقبرہ غدر کی یاد دلا رہے تھے۔ میرے گھر والے بھی گئے ڈپٹے ہمایوں کے مقبرے میں ایک درخت کے نیچے موت و زیست کی کشمکش سے گذر رہے تھے۔ نہ کھانے کو، نہ اوڑھنے کو اور اکتوبر کی شام۔ میرا منجھلا لڑکا جو اب ماشاءاللہ نیویارک میں رہتا ہے، سخت بخار میں مبتلا۔ اس دوران دلی کے دو صاحب اثر مسلمان

میر مشتاق احمد اور عزیز حسن بقائی تشریف لائے۔ عزیز حسن اس دھج سے آئے کہ سر پہ گاندھی ٹوپی اور شیروانی پر پستول اور کارتوسوں کی پیٹی۔ دونوں صاحب گشت کر کے چلے گئے۔ اس مایوسی کے عالم میں دیکھا کہ ذاکر حسین تشریف لا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ جامعہ کے طالب علم اور کھانے کا سامان۔ اگرچہ قیامت کا ہنگامہ تھا، مگر مجھے دور سے دیکھا۔ تشریف لائے۔ کھانے کا انتظام کیا۔ میرے بچے کو دیکھا، فرمایا گھبرائیے نہیں سوشیلا نائر پرانے قلعہ میں ہیں۔ میں جا کر انہیں بھیجتا ہوں۔

وقت بیت گیا، ذاکر حسین مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ چلے گئے، اور میں وزارت خارجہ میں لے لیا گیا۔ انہی دنوں حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ نے جنوبی مشرقی ایشیا کا عزم کیا اور شفیق الرحمٰن قدوائی کی محبت اور ان کے جذبہ مہمان نوازی نے مجھے انڈونیشیا کھینچ لیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی ان دنوں اقوام متحدہ کی طرف سے جاکرتا میں مقیم تھے اور حکومت انڈونیشیا کا تعلیمی پروگرام مرتب کر رہے تھے۔ جاکرتا سے ذرا فاصلے پر ڈچ حکومت نے گلابوں کا ایک بہت بڑا باغ بنایا ہے۔ وہ دیکھنے گئے۔ دنیا میں گلاب کی جتنی بھی انواع ہیں وہ اس باغ میں تھیں۔ یہاں ایک گہرے براؤن رنگ کا گلاب بھی دیکھا۔ اس کا نام Black rose تھا۔ افسوس اس کے بیج نہ مل سکے۔ ہندوستان واپس ہوا تو ذاکر حسین سے اس کا تذکرہ کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی بھی اتفاق سے موجود تھے۔ کہنے لگے ذاکر صاحب اب گلاب بھی سیاہ ہونے لگا، اب آپ کے پسندیدہ شعر کا کیا ہوگا:

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل ٭ خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

ذاکر حسین صاحب مسکرائے اور فرمایا "بھائی رقیب روسیاہ کا خون بھی سیاہ ہوتا ہے۔ یہ شعر عاشق صادق کے لیے بھی ہے اور رقیب کے لیے بھی۔

صاحبو! اس طویل تشبیب کے بعد مجھے شاید گریز کا اس سے بہتر موقع نہ ملے۔ علی گڑھ کی حالت ان دنوں کچھ اچھی نہیں تھی اور سچ پوچھیے تو اچھی کب تھی۔ وہ کونسا زمانہ تھا جب یہ درس گاہ قوم کے لیڈروں کے برنامۂ انتخاب کی سر فہرست عہدہ داران یونین کے فرائض کا عنوان اور وائس چانسلروں کی تنگ مزاجی یا سیاست کا تختۂ مشق نہ رہی ہو۔ سر سید کے زمانہ میں جو غبن ہوا تھا اس کے طویل سائے نے یونیورسٹی کا ساتھ کب چھوڑا، اور آفتاب احمد خاں اور ضیاء الدین احمد کے زمانہ میں جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی اس کی آگ کب سرد ہوئی۔ کبھی سلگی، کبھی بھڑکی۔ یہاں کی وائس چانسلری

ریاضیات و معاشیات کے ماہروں نے بھی کی اور ایک ریاست کے کامیاب وزیر باتدبیر نے بھی کی۔ ایک وائس چانسلر لڑکوں کے ہاتھ پٹنے کی روایت اپنے ساتھ لائے اور ایسے بھی وائس چانسلر آئے جن کا مزاج بچپن ہی سے ککڑ دانہ تھا۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سید نے مسلمانوں کو سیلاب بلا سے بچانے کے لیے جو ناؤ بنائی تھی اس کی پتوار کب ٹوٹی۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذاکر حسین نے جب اس ناؤ کو سنبھالا تو یہ بیچ منجدھار میں تھی اس کا ناخدا بادبانوں کو کھلا چھوڑ کر جا چکا تھا اور دوسرے ملاّح آہستہ آہستہ ساحل کی طرف تیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان دنوں ترکی میں تھا اور خالدہ ادیب کے مشہور ناول "سینک لی بقال" کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب انقرہ سے استنبول جاتا تو خانم کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ایکدن مسلمانوں کی حالت زار پر گفتگو ہو رہی تھی، بات چلی سلطان عبدالحمید سے اور ختم ہوئی ذاکر حسین پر۔ کہنے لگیں منقسم ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی کے در و دیوار کی مرمت ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و روپ بھی بدلنا ضروری ہے۔ کچھ پُرانے روشندان بند کرنے کی ضرورت ہے کہ وہاں سے اب نہ روشنی آتی ہے اور نہ ہوا۔ کچھ نئے دریچے کھولنے لازم ہیں کہ ہوا اور روشنی کا رُخ بدل گیا ہے۔ کہنے لگیں ذاکر حسین نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ کئی حیثیتوں سے مدحت پاشا کے مشن سے ملتا جلتا ہے۔ میں نے قرول باغ کے مکان بھی دیکھے ہیں اور اوکھلے میں جامعہ کے سنگ بنیاد کی تقریب میں بھی شریک ہوئی ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتی ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کا یہ بانی ہی یونیورسٹی کا معمار ثانی ہوگا۔ خدا کرے اس کا حال مدحت پاشا جیسا نہ ہو۔

رؤف بے ابوالکلام آزاد کے دوستوں میں تھے۔ جب ترکی جانے لگا تو ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ انہوں نے خاص طور پر رؤف بے کا تفصیلی تعارف کرایا اور انہیں سلام کہا۔ رؤف بے ترکی کے انقلابی راہ نماؤں میں نہایت متوازن مزاج کے آدمی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سلطان نے مصطفیٰ کمال کی گرفتاری کا حکم دیا اس وقت ترکی بحریہ کے افسر اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی رؤف بے نے مصطفیٰ کمال کا ساتھ دیا۔ وہ بعد میں ترکی کے وزیر اعظم بھی رہے۔ خالدہ ادیب خانم کی طرح وہ ترکی کو ان راہوں پر لے جانے کو تیار نہ تھے جن پر مصطفیٰ کمال لے گئے۔ میں رؤف بے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابوالکلام آزاد کا سلام پہنچایا۔ دیر تک ہندوستان کی سیاست پر گفتگو رہی۔ پھر خود ہی پوچھا ذاکر حسین کا کیا حال ہے۔ میں نے

حالات تفصیل سے بتائے۔ کہنے لگے شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ ۱۹۲۱ء میں جب جامعہ کا پہلا کانووکیشن ہوا تو میں اس میں شریک تھا۔ ایک انگریزی حکومت ختم ہوگئی، جامعہ اور علیگڈھ میں کوئی اساسی فرق نہیں رہا۔ ذاکر مسلم یونیورسٹی کے ایک قابلِ فخر فرزند ہیں اور ان کا مقام اب ان کی مادر درس گاہ ہے۔

جو رائے خالدہ ادیب خانم اور رؤف بے کی تھی، وہی ذاکر حسین کی بھی تھی۔ خود انہوں نے مقام اور کام کی اہمیت کا جو اندازہ کیا تھا وہ بھی یہی تھا۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

"علی گڈھ جس طرح کام کرے گا، علی گڈھ جس جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڈھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا، ہندستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام اور ہندستان جو سلوک علی گڈھ کے ساتھ کرے گا اس پر ہاں اس پر بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی اختیار کرے گی۔"

تقسیم ملک کے بعد مسلمانانِ ہند کی زندگی کا ایک بڑا سانحہ ذاکر حسین کا مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے استعفیٰ ہے۔ یونیورسٹی کی قیادت سنبھالنے کے ایک سال بعد ہی ذاکر حسین پر دل کا نہایت سخت حملہ ہوا۔ وہ شخص جو جامعہ کے زمانہ میں اپنی جامعہ کی زبوں حالی برداشت کرتا رہا، وہ شخص جو خاموشی سے "ودیا مندر" کے نام پر مطعون ہوتا رہا، وہ شخص جس نے خندہ پیشانی سے ہر مصیبت کو برداشت کیا اور جامعہ کے ساتھیوں کو آلام و مصائب میں خوش رہنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا رہا، اس کا شیشۂ دل سال بھر کے عرصہ میں مسلم یونیورسٹی کے اس کیمپس میں چکنا چور ہوگیا جہاں اس نے اپنی جوانی کا عزیز ترین زمانہ گذارا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوا، تو جامعہ مقروض تھی اور اخراجات کے لئے آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی اور سوال یہ تھا کہ جامعہ کو بند کیا جائے یا زندہ رکھا جائے۔ ذاکر حسین کے دل پر اس وقت کارزاری انفارکشن کا کاری زخم نہیں لگا۔ نہ وہ بیمار ہوئے، نہ بے کیف۔ رشید احمد صدیقی نے ذاکر کے استعفیٰ کی بات بچ بچ کر لکھی ہے، کہتے ہیں:

"علالت کی مسلسل کم و بیش خلش سے ادھر ذاکر صاحب بے کیف رہنے لگے تھے اور کبھی کبھی معمولی باتوں پر بھی بے لطف ہو جایا کرتے تھے۔ اس کا سبب تنہا علالت نہ تھی بلکہ کچھ اور طرح کی ناسازگاریاں تھیں جو یقیناً سنگین نہ تھیں اور عام طور پر اس شخص کو پیش آتی

رہتی ہیں جس کے سپرد اتنا بڑا کام ہو۔ لیکن ان سب نے مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کر دی کہ ذاکر صاحب کو علی گڑھ نہ چھوڑنے پر راضی نہ کیا جا سکا۔"

یہ ایک Understatment ہے۔ رشید احمد صدیقی، ذاکر حسین کے پرانے ساتھی اور دوست تھے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ذاکر حسین نہ آسانی سے ہار ماننے والے ہیں اور نہ ہراساں ہونے والے، انہوں نے مذکورہ بالا بیان میں ایسی بات کہی ہے، جو ذاکر حسین کی پوری شخصیت کا اُلٹ ہے۔ اُنہی دنوں میرا تبادلہ تہران سے شملی ہوا تھا۔ دو دن کے لیے علی گڑھ گیا، تو ذاکر حسین سے ملنے گیا۔ جرمن ڈراما نویس Bertol Berecht کا اُنہی دنوں ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تھا۔ بات ان کے فن پر چل پڑی۔ ذاکر حسین نے کہا برخت راسخ العقیدہ مارکسی ہونے کے باوجود اپنی شاعرانہ اقدار کو مارکسی عقاید کا تابع بنانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر مجھے درست الفاظ یاد ہیں تو شاید ذاکر حسین نے integrity as a poet کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ یہ تو بتا دوں وہی زمانہ ہے، جب ان کی خدمت میں ایک طرف کمیونسٹ اساتذہ کی فہرستیں پیش ہو رہی تھیں، تو دوسری طرف رجعت پسند مسلمانوں کی جدولیں۔ برخت کے پردے میں ذاکر حسین اپنا حال دل کہہ رہے تھے۔ ذاکر حسین نے ایک عظیم الشان کام اپنے ذمہ لیا تھا اور ان کی بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ ان کی مادر درسگاہ اس کام میں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جن باتوں کو رشید احمد ایسی ناسازگاریوں کا نام دے رہے تھے، جو ان کی نگاہ میں سنگین نہیں تھیں، وہی دراصل یونیورسٹی کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ رشید احمد صدیقی نے ذاکر حسین کو استعفا سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور ناکام رہے۔

ذاکر حسین کے آفریدی پٹھان ہونے کی بات ان کے خاندان اور نسب کا حال بیان کرتے ہوئے اس انداز پر کی جاتی ہے کہ گویا یہ امر اتفاقی تھا ورنہ کہاں ذاکر حسین اور کہاں قایم گنج کے پٹھان۔ میرے خیال میں اگر ذاکر حسین کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ذاکر حسین آخر وقت تک قایم گنج کے پٹھان رہے اور تمام عمر ان پٹھانی خوبیوں کی نشو و نما اور پٹھان کمزوریوں کی تہذیب میں لگے رہے۔ قایم گنج کے پٹھانوں کی طرح وہ نہ تلوار کے شوقین تھے اور نہ طپنچے اور خنجر کے دلدادہ۔ مگر غصے میں کسی سے کم نہ تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ یہ غصہ اپنی ذات ہی پر اُتارتے اور اس انداز پر اُتارتے کہ لوگ ان کی جھلاہٹ اور طیش کو بھی ان کا لطف و کرم سمجھتے۔ ان کی پوری عمر ایک اندرونی کشمکش میں صرف ہوئی۔ وہ تہذیب نفس میں تو کامیاب ہو گئے، لیکن اپنے ساتھیوں، دوستوں اور ہمکاروں سے جو کشمکش انہیں کرنی

پڑی وہی انہیں لے ڈوبا۔ رنج اس بات کا نہیں کہ مریضِ دل جانبر نہ ہوا۔ افسوس اس امر کا ہے کہ جس مقص
کے لئے جان دی گئی وہ حاصل نہ ہوا اور جس ادارے نے دل کا درد دیا اس نے اس درد کا فائدہ نہیں ا
یہ مرثیہ ذاکر حسین کا نہیں بلکہ اس قوم کا ہے جو نہ اپنے محسنوں کو پہچانتی ہے اور نہ ان کی قدر کرتی ہے۔" ا
کی بکری" چاندنی کی کہانی نہیں ذاکر حسین کا قصہ ہے۔

امریکا کے دو ڈاکٹروں Meyer Friedman اور Ray Rosenman نے کئی بر
کی تحقیق کے بعد ہارٹ اٹیک کے مریضوں پر ایک کتاب لکھی ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مرض کا حملہ ایک
خاص طبیعت اور مزاج کے شخص پر ہی ہوتا ہے۔ اس شخصیت کو انہوں نے TYPE A کا نام دیا ہے
اس سے قبل کہ میں TYPE A کی شخصیت بیان کروں، رشید احمد صدیقی نے ذاکر حسین کی شخصیت کا جو نقش
کھینچا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

"ذاکر صاحب کی ایک صفت جو ان کے درجے کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ کیسی ہی اہم تقریب کیوں نہ ہو اس کے لئے خطبہ لکھنا ہوگا، تو وہ خود لکھیں گے... چنانچہ اس طرح کے مواقع جب پیش آتے ہیں اور کثرت سے آتے رہتے ہیں، تو وہ اتنے مضطرب ہوتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ آسانی سے سمجھ جاتے ہیں کہ موصوف کسی خطبے کی کوفت میں ہیں خطبہ لکھنے کا اہتمام وہ یہ حساب لگا کر کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خطبہ لکھنے کا کام ختم کرنے اور اس کے پڑھے جانے کے درمیان تھوڑا سا بھی فصل زمانی باقی رہ جائے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آج تک ایسا نہ ہوا کہ خطبہ نامکمل رہ جائے یا اپنی جگہ پر بے مثل نہ ہو... ذاکر صاحب کی قابلیت اور ذہانت کا اظہار یوں تو ہر موقع پر ہوتا ہے لیکن بدیہہ آفرینی اور برجستہ جوابی کے الماسی ریزے اور برق پارے اس وقت دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ حریف کی نامعقولی یا نالائقی پر برہم ہو جائیں... ان کی معرکہ کی تقریر وہ ہوتی ہے جب مباحثہ کے محرک ہونے کی حیثیت سے وہ مخالفین کے جواب میں سب سے آخر میں تقریر کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

"ذاکر صاحب کو تمام عمر دشواریوں میں کام کرنا پڑا اور دشواریوں سے ہی کام لینا پڑا۔ اچھے اور برے کام کی مشکلات اٹھانے اور اٹھاتے رہنے سے انسان کی بعض غیر معلوم اور

غیر معمولی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں - میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو 'ذاکر صاحب' بنانے میں ان دشواریوں کو بڑا دخل ہے ۔"

ذاکر حسین کی شخصیت سازی میں جہاں اٹاوہ اور علی گڑھ نے حصّہ لیا، وہاں برلن نے بھی ان پر کچھ کم اثرات نہیں چھوڑے ۔ ۱۹۶۲ء میں جب جرمن فیڈرل ری پبلک کے صدر Heinrich Lubke ہندوستان آئے تو دلی یونیورسٹی نے انھیں اعزازی ڈگری دی - اس موقعہ پر کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ذاکر حسین نے کہا:

" I feel pardonably proud to be priviledged to this as I personally owe an inestimable debt of gratitude to a German university for my own intellectual and moral make up."

ذاکر حسین نے یہ بات جرمنی کے صدر کو خوش کرنے کے لئے نہیں کی تھی - پونا یونیورسٹی کی جرمن ایسوسی ایشن کو مخاطب کرتے ہوئے بھی انہوں نے ایسی ہی بات کی تھی - انہوں نے بتایا:

" I learnt German some fifty years ago and have never allowed myself to forget it... I almost daily read it and I can tell you the I am very much richer for it.... The German tongue has a directness and a strength and in the hands of its great writers a refinement and a delicacy which make it worth a great deal of trouble to learn it."

جرمن thoroughness ان کی فطرت ثانیہ نہیں تھی بلکہ عین فطرت تھی - ان کی زندگی عبارت تھی خوب سے خوب تر کی تلاش اور جستجو سے، اہم سے اہم اور مشکل سے مشکل کام کرنے کے عزم سے، چیلنج قبول کرنے سے!

اب ذرا Roseman اور Friadman کی بھی سنئے:

" Type A behaviour is a special, well-defined pattern marked by a compelling sense of time urgency-"hurry sickness", aggressiveness and competitiveness .... Type A's engage in a chronic. continuous struggle against circumstances, against themeselves. The behaviour pattern is common among hard-driving and successful businessmen and executive. But excess agression is not always easily detected in type A men, if only because they so often keep such feelings and impulses under deep cover. Indeed, very few of these men are even aware of their excess agression. In almost all type A men is the tendency always to compete with or to challenge other People, whether the activity consists of a sporting contest, a game of cards, or a simple discussion. They tend to bristle at points in a conversation where the ordinary person might either laugh self deprecatingly or pass ever the possibly contentious theme."

خالدہ ادیب خانم دو انقلابوں سے گزری تھیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے انحطاطی دورِ بغاوت سے
اور مصطفیٰ کمال کے دورِ انقلاب سے۔ وہ کہتی ہیں " کوئی ہندوستانی تعلیم یافتہ جس میں ملی ایسا نہ تھا جو

یہ سوال نہ کیا ہو کہ ذاکر حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ہموطنوں میں چیستان ہیں۔ اسی کے ساتھ ان سے زیادہ کھرا آدمی ملنا غیر ممکن ہے . . . جب میری ان سے میونخ میں ملاقات ہوئی تو ان کی عمر ۲۰ سال سے کچھ ہی اُوپر تھی، لیکن داڑھی موجود تھی . . . میں نے اس جامد چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ میں نے اُن کو نہایت غصّے میں اور ترس کھا کے آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے۔ تاہم ہمیشہ اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں . . . وہ مذہبی آدمی ہیں اگرچہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے۔"

خالدہ ادیب نے جس ترکی میں جنم لیا اس میں داڑھی قدامت کا نشان بنتی جارہی تھی۔ خلیفہ اور شیخ الاسلام کے لئے تو خیر داڑھی ضروری تھی لیکن Yong Turks نے داڑھی کو خیرباد کہہ دیا تھا چنانچہ مسجدوں کے پیش اماموں اور موذنوں نے بھی اس اسلامی نشان سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ذاکر حسین قائم گنج اور اٹاوہ کے جس ماحول میں بڑھے، پلے اور پھولے، اس کی روایت میں داڑھی شرافت کا نشان تھی۔ خاص طور پر اہل علم زمیندار خاندانوں میں۔ میں نے ذاکر حسین کے ایسے دو نزدیکی عزیزوں سے جنھوں نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا ہے، ذاکر حسین کی داڑھی کے بارے میں جب پوچھا تو ایک نے کہا شیو Shave کرنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے شائد اس کو بچانے کے لئے داڑھی رکھ لی۔ دوسرے عزیز نے مزاحاً کہا ذاکر حسین کی داڑھی ان کی ذہنی نشوونما اور ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ مرتب سے مرتب تر ہوتی چلی گئی۔ یہ معمولی سی بات ہے لیکن ان کے سوانح نگار کو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاکر حسین مسلمان کے لئے داڑھی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی داڑھی سہل پسندی کا نشان نہیں بلکہ ان کے مرد مسلمان ہونے کی علامت تھی۔

ذاکر حسین کہتے ہیں:

"مسلمانوں کو داڑھی رکھنی چاہیئے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم داڑھی رکھو۔ لیکن یہ ذرا غور کرو کہ آخر داڑھی منڈانے سے کیا فائدہ ہے۔ کیا داڑھی سے صورت بدنما ہوجاتی ہے۔ تم نے شائد داڑھی منڈوں سے مقابلہ نہیں کیا۔ کیا تم نے مغل بادشاہوں کی تصویریں نہیں دیکھیں؟ اُن کی داڑھیاں بدنما ہوتی ہیں؟ آخر تم نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ داڑھی رکھ کر آدمی بدصورت ہوجاتا ہے۔ داڑھی میں ایک خاص حسن ہے، مرد اس سے مرد معلوم ہوتا ہے۔"

رہی ذاکر حسین کی داڑھی کی تراش خراش تو وہ بھی ان کی ذہنی نشوونما ناپنے کا پیمانہ نہیں۔ جن دنوں وہ جرمنی میں تھے اور سوٹ زیب تن کرتے تھے ایسی داڑھی رکھتے تھے جو فرنچ کٹ سے ذرا بڑی اور

ایڈورڈ کٹ سے ذرا مختصر تھی۔ یہ داڑھی فرائڈ کی داڑھی سے ملتی جلتی تھی لیکن اس کا اسلامی فرق نمایاں تھا۔ یہی داڑھی تھوڑی بہت ترمیم واختصار کے ساتھ تادمِ مرگ ان کے حسین اور وجیہ چہرے کی زینت رہی۔ ہندستان واپسی پر انہوں نے جو مقطع اور پٹھانی داڑھی رکھی تھی وہ وقتی تھی اس کا میں "rick Somia" تجزیہ تو اس وقت نہیں کر سکتا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ان دنوں گاندھی جی کے دربار میں جتنے بڑے مقطع ریش بڑے، شوکت بڑے، جوہر بڑے، اجمل بڑے۔ ڈاکٹر انصاری جیسے لوگ کم تھے۔ میں نے ذاکر حسین کی داڑھی کی بات برسبیل تذکرہ نہیں کی۔ میں اسے اہم سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ آدمی اپنے لئے جو وضع قطع اور لباس تجویز کرتا ہے وہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ذاکر حسین مسلمان کے لئے داڑھی ضروری سمجھتے تھے لیکن روایتی مولوی نے داڑھی کا جو حدود اربعہ مقرر کیا ہے اس کے قائل نہ تھے۔

خالدہ ادیب کی اس رائے کی شہادت کہ وہ مذہبی آدمی ہیں اگرچہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے، نہ صرف ان کی داڑھی سے ملتی ہے بلکہ اس خواہش سے بھی کہ پیشانی پر سجدے کا نشان ایسا نہ ہو کہ چھپائے نہ بنے وہ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کے فرمان سے بے خبر نہ تھے لیکن ریاکاری سے خوف زدہ تھے۔ انھیں اپنی عبادت کی تشہیر ناپسند تھی۔ چنانچہ عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "مسلمان نائب صدر جمہوریہ" کا تماشا ملا۔ کیا اب یہ دن آگئے ہیں کہ کوئی مسلمان جیسے تیسے فرض نماز ادا کرلے تو وہ ایک قابل ذکر خوبی سمجھی جائے اور اس کا ذکر معتدد جرائد میں ہو۔" لیکن ایک طرف یہ اخفا ہے، تو دوسری طرف طلبا کی نماز کا اتنا خیال ہے کہ تاکید کے الفاظ میں سختی آگئی ہے، کہتے ہیں:

"تم لوگ نماز کو بھی ایک بار سمجھتے ہو اور پھر کہتے ہو ہمیں نماز کے معاملے میں مجبور نہ کیا جائے۔ ہم نے تم سے کوئی درخواست نہیں کی تھی، کوئی زور نہیں ڈالا تھا۔ تمھیں آریہ سماجی سے مسلمان نہیں بنایا۔ تم نے خود آکر یہ دعویٰ کیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ پھر اگر تمھیں مجبور کرتا ہوں کہ اسلام کے احکام کی پابندی کرو، تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

جامعہ میں ایک بزرگ منشی علی محمد تھے۔ انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ وہ ٹخنے جو پاجامے سے ڈھکے رہیں گے ان کو آخرت میں جہنم کی آگ ڈھکے گی۔ ذاکر حسین ان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تو پائنچے اوپر کر لیتے اور بعد میں پھر نیچا کر لیتے۔ ملاحظہ کیجئے یہ اندرونی کشمکش۔ ایک ذاکر حسین داڑھی کو اسلام کا نشان قرار دیتا ہے اور نماز کی تاکید کرتا ہے۔ دوسرا ذاکر حسین گٹے دار پیشانیوں اور شرعی داڑھیوں سے علیحدہ رہنا چاہتا ہے

خالدہ ادیب خانم نے ذاکر حسین کی اس دینداری کو دیکھ کر ہی کہا تھا کہ "اسلامی دنیا اگر اپنے مذہب کو جو اس کے اخلاق کی بنیاد ہے، ترک کئے بغیر جدید ہونا چاہتی ہے تو اسے عام طور پر ڈاکٹر انصاری اور ذاکر حسین کی تقلید کرنی چاہیے۔"

ذاکر حسین کے مداحوں نے، ان سے محبت کرنے والوں نے جہاں ظواہر پر توجہ دی وہاں ان تمام عوامل پر غور نہیں کیا جن کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ ذاکر حسین کو سمجھنے کے لئے anecdotal narration کی نہیں بلکہ analytical study کی ضرورت ہے۔ میں یہ بات کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو ذاکر حسین کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں، قریب سے جانتے ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور جنھوں نے ان کی معیت میں زندگی گذاری ہے میری جسارت پر اعتراض کریں گے۔ میں پر اندازہوں مگر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ذاکر حسین کو صرف جامعہ کے محدب شیشوں سے دیکھنا جائز نہیں۔ اس سے ذاکر حسین کی شخصیت اجاگر نہیں ہوتی، غیر متوازن ہو جاتی ہے۔

ذاکر حسین کی جامعہ اور محمد علی کی جامعہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ محمد علی کی جامعہ جوشیلا پروٹسٹ تھی۔ ذاکر حسین کی جامعہ سرسید کے سوچے سمجھے ہوئے مشن کا نتیجہ تھی۔ سرسید اور ذاکر حسین دونوں ملت کو جامد روایات کو قید و بند سے نکال کر ایک dynamic culture کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اور عقاید کی سلامتی کا لحاظ رکھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ سرسید نے انگریز اور انگریزی تہذیب کا چڑھتا ہوا سورج دیکھا اور ذاکر حسین نے پراچین بھارت کی اس تہذیب کو دیکھا جو آزاد ہندستان میں نیا جنم لینے والی تھی مگر اسلام کا پیغام دونوں کے سامنے تھا چنانچہ ذاکر حسین عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ جامعہ "ملیہ" ہی نہیں "اسلامیہ" بھی ہے۔ یہ بات ہمیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس لئے یہ بات جتنی مرتبہ جامعہ والوں کو یاد دلائی جائے اچھا ہے اور مناسب۔"

لباس اور اس کی شائستگی اور طلباء کا رکھ رکھاؤ کسی درس گاہ کی شخصیت و خصوصیت کے پہلے نشان ہوتے ہیں۔ ذاکر حسین کی وائس چانسلری کے زمانہ میں آکسفورڈ کی طرح مسلم یونیورسٹی کے academic dress پر کوئی کتابچہ تو نہیں چھپا مگر ذاکر حسین خود اپنی مثال اور عمل سے شائستگی اور انفرادیت کی اس

علامت کے نگہبان تھے۔ موٹر سے اُتر کر طلباء کی شیروانی کے بٹن لگاتے اور ننگے سر طالب علم کو خود اپنی ٹوپی پہنا دیتے۔ ایک مرتبہ کہا:

"مسلمان کا ہندستان میں ایک خاص لباس ہو گیا ہے، وہ ہمیں پہننا چاہیئے۔ اب آپ لوگوں کا یہ حال ہے کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ پتا نہیں چلتا کس قوم کے آدمی ہیں۔"

اب تو یہ حال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم سے لیکر اُس کے اُونچے سے اُونچے استاد اور مہتمم کے سر پر بھی ٹوپی نظر نہیں آئے گی۔ شیروانی کی جگہ نیم آستین بُش شرٹ وہ حضرات زیب تن کئے ہوں گے جن کی طرف طالب علم مثال اور راہبری کے لئے دیکھتے ہیں اور جن کی تقلید وہ اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ علی گڈھ کا طالب علم اپنی سج دھج اپنے طور طریقے سے سارے ملک میں پہچان لیا جاتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ننگے سر طلبا ٹوپی ٹوپی کی صدا بلند کر رہے ہیں اور ان کے ننگے سر اُستاد جنھیں روایت کا نگہبان ہونا چاہیئے تھا ناراض ہو کر اسٹیج سے چلے جاتے ہیں۔ ذرا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ان اکابر کو مسجد میں دیکھئے کہ نماز کے وقت خدا کے دربار میں حاضری کے لئے ان کی پتلون کی جیبوں سے کیسی ملی دَلی شکنوں سے پُر، بھانت بھانت کی ٹوپیاں نکلتی ہیں اور مسجد سے نکلتے ہی اس طرح چھپائی جاتی ہیں گویا ان کا سر پر ہونا باعثِ شرمساری ہے۔

صاحبو! میں چار سال تک یونائیٹڈ نیشنز کے خالی ایوانوں سے اُکتائے ہوئے، تھکے ہوئے، نیم خوابیدہ، اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ڈیلی گیٹوں کے سامنے لمبی تقریریں کرنے اور پڑھنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ ایوانوں میں ڈیلی گیٹ اپنی مرضی سے آتے ہیں، جب دل چاہتا ہے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ اخبار پڑھتے ہیں، کچھ اپنی سفارتوں سے فائل ساتھ لاتے ہیں اور انھیں دیکھتے ہیں۔ کچھ خط لکھتے ہیں اور کچھ سرگوشیاں کرتے ہیں اور ان سب حرکات کے علی الرغم مجھ جیسے بورنگ مقرر اقوام متحدہ کی Documentation کا حجم بڑھاتے رہتے ہیں۔ عادت بُری ہے۔ مگر اب اس عمر میں اصلاح مشکل ہے۔ میں واعظ کی زبان لایا ہوں طولِ مدعا کے لئے امید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ میں آپ کے صرف دو منٹ اور لوں گا۔ حکایت لذیذ بود، دراز تر گفتم۔

ذاکر حسین کی زندگی کے دو دور ہیں۔ ایک دَور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے استعفے سے ختم ہو گیا۔ جب وہ یونیورسٹی آئے تو انکی تمناؤں کا اظہار ان الفاظ میں ہوا:

"علی گڈھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیام و عمل سے ہندستانی مسلمانوں کا کردار بنےگا۔

اور وہ اپنے خونِ جگر کی کاوشوں سے جدید ہندستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھر دینگے۔"

اور جاتے وقت ذاکر حسین حسب ذیل الفاظ کہکر رخصت ہوئے:

"سب سے پہلے میں اپنے اس تامل کا اقرار کرلوں جو مجھے یہاں آنے میں تھا۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا لیکن میں اس لئے آگیا کہ میرے نہ آنے سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ دراصل مجھے آنے میں تامل اس لئے تھا کہ میں اپنے اس رنج اور مایوسی کا اظہار آپکے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا جو مجھے آپکے رویّے سے ہوئی ہے۔ میں اس لئے مایوس ہوں کہ آپ میں ابھی تک پختگی نہیں آئی۔ کوئی بھی شخص آپ کو بہکا سکتا ہے ... آپ کے جذبات بھڑکا سکتا ہے اور آپ نے اپنے جذبات کے سلسلے میں عقل سے کام لینا ابھی تک نہیں سیکھا ... میں آپ کی تعریف پر کیسے اعتبار کروں؟ کون کہہ سکتا ہے کل آپ میرا جنازہ نہ نکالیں گے۔"

ذاکر حسین کی زندگی کا دوسرا دَوران کی گورنری سے شروع ہوا۔ اس دَور کا ایک حصہ درج گزٹ ہے اور دوسرا ناگفتنی۔ اس زمانہ کے سرکاری کاغذات جب تک Official Secrets Act کی قید سے آزاد نہ ہوں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ راشٹرپتی ذاکر حسین نے انجمن ترقی اُردو کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی ۲۲ لاکھ دستخطوں والی عرضداشت پر کیا ایکشن لیا۔ ذاکر حسین گورنر، وائس پریزیڈنٹ، اور پریذیڈنٹ ہوکر مسلمانوں کے حالات سے بےخبر یا بےتعلق نہیں ہو گئے تھے۔ مگر ظاہر ہے ان کا طریقۂ کار بدل گیا تھا۔ وائس پریذیڈنٹی کے زمانہ میں جب مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے علی یاور جنگ کے ساتھ بدسلوکی کی اور محمد کریم چھاگلا نے ان رستے ہوئے زخموں پر نمک چھڑکنے والا بیان دیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاکر حسین نے ۱۶ رمئی ۱۹۶۳ء کے ایک نجی خط میں لکھا:

"علی گڑھ میں جو کچھ ہوا وہ بہت ہی شرمناک ہے۔ اس سے دوسرے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ اس سے زیادہ شرمناک ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں اور کروں گا۔ اگرچہ لڑکوں نے گنجائش بہت کم چھوڑی ہے۔ دعا فرمائیے کہ یونیورسٹی آزمائش سے صحیح سالم نکل آئے۔"

میں سمجھتا ہوں ذاکر حسین مسلمانوں کے سلسلہ میں حکومت کو ہر وقت مطلع کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے کیا کہا اور اس کا کیا اثر ہوا اُس وقت کے کاغذات کی اشاعت پر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ تاہم اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ذاکر حسین کی نائب صدارت اور صدارت کا دور اگرچہ مسلمانوں کے لئے قابلِ فخر اور ہندستان کے

سیکولرزم کے لئے سندِ اعتبار ہے۔ مگر خود ذاکر حسین کے لئے اس میں اطمینانِ قلب کم اور ... ations زیادہ تھیں۔ ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے ایک مشاعرہ میں بڑی مقبول ہوئی۔ اس کا ایک مصرع ذاکر حسین نے کسی اور موقع پر پڑھا تھا۔ مگر یہ ان کے اس دور کی پوری داستان بیان کرتا ہے:

"ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں"

میں ذاکر حسین کے زمانۂ صدارت کے صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کروں گا، جو کافی غلط فہمی کا باعث بنا۔ ذاکر حسین صدر ہوئے تو وہ سری نگر کے شنکر اچاریہ اور جین منی کے پاس گئے اور انھیں کچھ پھل پھول ایک تھال میں پیش کئے اور ان کی آشیرباد حاصل کی۔ اس واقعہ پر اخبارات میں کافی تبصرے ہوئے۔ حیرت یہ ہے کہ اس پورے مباحثے میں ذاکر حسین کے اسلام کا ذکر تو ہوا لیکن خود ان کی شخصیت کی تعمیر میں جن عوامل کا گہرا اثر تھا ان کا ذکر نہیں ہوا۔ ذاکر حسین خان کے دادا غلام حسین خان عرف جھمن خان حیدرآباد کی دکنی کن ٹن جنٹ میں فوجی افسر تھے۔ ریٹائرڈ ہو کر قائم گنج واپس چلے آئے۔ کیونکہ درباداری ان کی سرشت میں نہ تھی۔ فقیروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، خصوصاً دو بزرگوں کرم علی شاہ اور بنس بہاری کی۔ بنس بہاری کبیر پنتھی تھے، نہ بت پرستی کے قائل تھے نہ ذات پات کے۔ پٹھانوں کے ساتھ رہتے اور ان میں بڑے مقبول تھے۔ قائم گنج واپس آکر جھمن خان نے حویلی تعمیر کرانی شروع کی اور ایک دن طیش میں آکر مزدور کو بہت برا بھلا کہا۔ جب ان کے پیر و مرشد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے جھمن خان کو بلوا بھیجا اور فرمایا:

"اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نسلیں اس نئے مکان میں پھلیں اور پھولیں تو ان ناشائستہ الفاظ کے کفارہ کے لئے متھرا جاؤ اور اس کرشن نگری میں فلاں سادھو کی صحبت میں کچھ دن گزارو، تاکہ تمہاری روح اس غیظ و غضب کی کثافت سے پاک ہو۔" اس آفریدی پٹھان نے مرشد کا فرمان لفظاً لفظاً پورا کیا اور واپس آکر حویلی کی تعمیر شروع کی۔ ایسا ہی واقعہ ذاکر حسین کے پیر کے ساتھ بھی گزرا۔ ذاکر حسین کم عمری میں ہی ایک بزرگ حسن شاہ سے بیعت ہو گئے تھے۔ یہی حسن شاہ کسی ہندو کے تلک پر اعتراض کر بیٹھے۔ چنانچہ ان کے مرشد نے ناراضگی کیا اور حکم دیا تم خود تلک لگا کر کشمیر اور دکن کی پدیاترا کرو اور وہاں کے پروہتوں کی چٹھیاں بطور سند لاؤ۔ یہ وہ روایات تھیں جو ذاکر حسین کو تہذیبِ نفس اور انکساری کا سبق حاصل کرنے کے لئے ورثہ میں ملی تھیں۔ غلام حسین خان کے پوتے اور حسن شاہ کے مرید نے ہندوستان کے سب سے بڑے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد اگر سب سے پہلے انکساری اور عجز کا سبق یاد کرنے کے لئے خاندانی نسخہ استعمال کیا تو اسے ...

Perspective میں ہی دیکھنا چاہیئے۔

ذاکر حسین مردِ مسلمان تھے اور ظواہر پر اتنی ہی توجہ دیتے تھے جتنی کہ باطنی پاکیزگی پر۔ لیکن اُن کے تصوف کو شریعت کی ترازو میں تولنا درست نہیں۔ یہ اُن کا ذاتی فعل تھا، سیاسی نہ شرعی۔ عابد رضا بیدار نے اپنی صوفی حسن شاہ کا ایک واقعہ لکھا ہے وہ بیدار صاحب کے الفاظ میں ہی سُنیئے: "صوفی صاحب نے ایک روز ذاکر صاحب سے پوچھا 'کبھی شراب پی ہے تم نے؟' پھر نفی میں جواب پاکر کہنے لگے: 'مگر میں نے پی ہے۔ اگر تمھیں کوئی ایسا 'اللہ والا' مل جائے جس کے ہاتھ سے تمھیں پی جانا چاہیئے تو کبھی انکار نہ کرنا۔' نورانی نے لکھا ہے پوری زندگی ذاکر صاحب کو ایسا واسطہ نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب میں اگر کوئی کمی رہی تو یہی۔ میر کے اس شعر کو انھوں نے پڑھا بہت ہوگا، عمل کبھی نہیں کیا:

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد ÷ کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار ہو۔"

میرے ایک مستشرق دوست ان دونوں قلندروں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ بیدار صاحب نے ذاکر حسین کی جس کمی کا ذکر کیا ہے اگر وہ ان میں نہ ہوتی تو میں بے دھڑک کہہ دیتا کہ ذاکر حسین مثالی قلندر تھے۔

ذاکر حسین کی سب سے بڑی خوبی ان کی integrated personality تھی۔ سر سید ہندوستانی مسلمان کو جیسا مہذب جنٹلمین اور مکمل ہندوستانی بنانا چاہتے تھے اس میں تھوڑی بہت جو کمی رہ گئی تھی وہ ذاکر حسین نے پوری کر دی۔ وہ خود اس کی بہترین مثال تھے۔

۱۹۶۸ء میں ذاکر حسین کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوا۔ سوئٹزرلینڈ اور ویٹکن کے زمانۂ قیام میں مجھے مغربی موسیقی کا جو شوق ہے اسے پورا کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ بات نہ معلوم کس طرح Bach پر چل نکلی۔ معلوم ہوا انھیں اس کے coutatas اور Branden berg concerto خاص طور پر پسند ہیں۔ میں نے ہینڈل کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے دونوں میں فرق ہے۔ باخ کے ہاں شوخی کا ایک رنگ ہے اور سنجیدگی کا ایک ڈھنگ ہے اور وہ دونوں کو الگ الگ رکھتا ہے۔ اس کی موسیقی نہایت حسین ہے اور براہِ راست دل پر اثر کرتی ہے۔ میں نے کہا یوں کہیئے "لگت کلیجوا میں چوٹ" میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا "اس کا بھی ایک مقام ہے"۔

موسیقی اور وہ ریکارڈیڈ موسیقی جو ڈرائنگ روم کی تنہائی میں سُنی جائے محبت اور عبادت کی طرح ایک نہایت ہی پرسنل اور پرائیوٹ چیز ہے اور کسی شخص کے مزاج کی سچی آئینہ دار ہے۔ مصر کی وزارتِ اوقاف

نے المصحف المرتّل کے نام سے قرآن کریم کے جو ریکارڈ تیار کرائے ہیں، ذاکر حسین بڑے خشوع و خضوع سے سنتے تھے۔ مگر بھگتی کی دوسری آوازوں سے بھی روح کو محروم نہیں رکھتے تھے۔ پچھلے دنوں ذاکر حسین کی بڑی صاحبزادی سعیدہ خورشید عالم خاں نے ازراہ کرم مجھے اپنے والد کے ٹیپ اور ریکارڈوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس ذخیرہ میں میرا کے بھجن بھی ہیں، Bach کا چرچ میوزک بھی۔ جب قونیہ گئے تو مولوی سلسلے کے ترکی نغمے بھی لائے۔ خاص کرنے کے ریکارڈ۔ اس مجموعے میں فلمی گانے تو نہیں البتہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر کا گایا ہوا بھجن ہے: "جائے گوکل کے نٹ کھٹ چور"۔ گیتا دتّ کا بھجن "میں تو گردھر کے گھر جاؤں" بھی ہے۔ ایک ٹیپ جگر کی غزل کا ہے جس پر خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا مصرع ہے "اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیان گزرے" مجھے ان ریکارڈوں میں کلو قوال کی نقلیں تو ملیں مگر قوالیاں نہ ملیں۔ روی شنکر اور احمد جان تھرکوا کے ساتھ ساتھ selubart کا Are Maria بھی ہے اور یہودی Meuhin کی Negro's spiritual Melody بھی ——— خود نیگرو موسیقار Paul Robson کے گانوں کے دو ریکارڈ بھی ہیں اور انہی کے ساتھ ام کلثوم کی یا حبیبی، دروز موسیقار فرید الاطرش کا مشہور نغمہ حبیبی اور عبدالوہاب کا نغمہ عاشق الروح بھی۔

ذاکر حسین کی شخصیت عبارت تھی اس حسین امتزاج سے جو ہندستانی کلچر اور تہذیب کی روح ہے۔ ریکارڈوں کے اس مجموعے میں مجھے اندو بالا کا گایا ہوا "لگت کلیجوا میں چوٹ" کا ریکارڈ بھی نظر آگیا اور ذاکر حسین کی آخری مسکراہٹ بھی یاد آگئی۔ اس وقت میں اس مسکراہٹ کو معنی خیز سمجھا تھا۔ اب خیال آتا ہے اس میں ایک اُداسی کی بھی جھلک تھی۔ ان ۸۴ ریکارڈوں میں صرف ایک ریکارڈ ٹوٹا ہوا نکلا۔ یہ شکستہ ریکارڈ مجاز کے مسلم یونیورسٹی کے مشہور ترانے کا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں ذاکر حسین کی نواسی نیلوفر نے کہا یہ ریکارڈ میاں کے زمانے میں ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے پاس ہی بھجن کا ایک ریکارڈ رکھا ہے۔ "میرا کے من کی سونی پڑی ہے ستار"۔

••

(۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء کو خدا بخش لائبریری میں سُنایا گیا)

حسنین سیّد

• **جناب حسنین سیّد** : پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۱۷ء بمقام کوروتی بہیورا (دربھنگہ)۔ ابتدائی تعلیم سوری ہائی اسکول مدھوبنی۔ اگست ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ثانوی سوم میں داخلہ لیا، مئی ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی۔اے کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالہ "جوہر" کے ایڈیٹر، جس کا سالانہ نمبر اقبال پر "جوہر اقبال" کے نام سے شائع بھی ہوا۔

اکتوبر ۱۹۴۱ء سے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہیں۔

ان دنوں درس گاہ اسلامی دربھنگہ کے ناظم ہیں

••

وہ ایک مردِ قلندر تھے

مروّت حسن عالمگیر تھا اُستاد ذاکر کا

استاد ذاکر حسین رحمۃ اللہ سے میری تین یادگار ملاقاتوں میں سے پہلی ملاقات: اگست ۱۹۳۴ء میں جب میں داخلے کے لیے جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی پہنچا تو داخلے کے آخری مرحلے پر مجھ کو استاد رحمۃ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ وہ میرے داخلے کے فارم پر دستخط کر دیں۔ انھوں نے تعارف کے لیے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ایک خط لکھ کر لے گیا تھا، جس میں میں نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں داخلہ لینے کی غرض بتائی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ ملّیہ اسلامیہ اس لئے آیا ہوں کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہاں اسلامی اور دُنیوی دونوں طرح کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ مدھوبنی بہار میں جس سکول میں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس میں اسلامی تعلیم کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے والد صاحب کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ مجھ کو وکیل بنائیں اور مجھے وکیل بننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلہ کو چھوڑ کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں، تو ان پر اپنی تعلیم کے مصارف کا بار نہ ڈالوں اور آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرا داخلہ جامعہ میں ہو جائے تو تعلیمی اوقات کے علاوہ کسی وقت جامعہ کی کوئی خدمت مجھ سے لیں اور اس کے عوض اتنا معاوضہ دیں جس میں کسی طرح یہاں کا خرچ نکال سکوں ——— میرے خط کو پڑھ کر وہ خاموش سے رہے اور فارم پر دستخط کرنے سے پہلے فرمایا "میں آپ سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں" میں نے عرض کیا۔ وہ کیا؟ فرمایا "عہد کیجئے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کروں گا" میں نے عرض کیا "الحمد اللہ میں شعوری طور پر پہلے سے اس پر عامل ہوں" انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیا۔

جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک نہایت حسین و وجیہ پُر وقار شخصیت سے سامنا ہوا تھا اس وقت ان کی عمر ۳۵-۴۰ سال کے قریب رہی ہوگی) سرخ سفید چہرہ اور اس پر بھرپور سیاہ داڑھی بقول حفیظ جالندھری: جلال بھی ہے جمال بھی ہے ——— یہ شخصیت کا کمال بھی ہے۔

انھوں نے ہنستے ہوئے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ایک نہایت چھوٹی ... کے فرش کے اوپر ناریل کی چٹائی تھی۔ سامنے فرشی میز تھی جس پر ہر چیز اپنی جگہ انتہائی سلیقہ سے سجی ہوئی تھی۔ ان کی بائیں طرف دیوار پر شیشے کا ایک فریم آویزاں تھا، جس پر یہ شعر خوشخطی کا بہترین نمونہ پیش کر رہا تھا

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ٭ با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

جب انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیا تو ان سے الوداعی مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آیا اور بہت خوش ...

چند دنوں کے بعد جامعہ کے احاطے میں ان سے آمنا سامنا ہوا۔ انھوں نے مجھے روک کر فرمایا "... ختم ہو جانے کے بعد دو گھنٹے صدر مدرس کے دفتر میں آپ کام کیا کریں گے۔ اس کے عوض آپ کو ۸ روپے ماہانہ ... کریں گے جس سے آپ اپنا جامعہ کا خرچ پورا کرنے کی کوشش کریں۔" اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے اپنا داخلہ جامعہ میں غیر مقیم طالب علم (DAY SCHOLAR) کی حیثیت سے کرایا، کیونکہ ... وقت جامعہ میں دارالاقامہ میں قیام و طعام کے مصارف ۱۶ روپے ماہانہ تھے۔ اس وقت میں جامعہ ملیہ قرول باغ سے اتر کی جانب سبزی منڈی کے ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں ایک مسجد میں رہتا تھا جس کی دوری جامعہ قرول باغ سے دو میل سے کم نہ تھی۔ ایک روز پھر جامعہ میں میرا ان کا آمنا سامنا ہوا اور یہ پوچھا کہ "آپ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے بتایا کہ سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں۔ سن کر خاموش ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد پھر اسی طرح سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے فرمایا "قرول باغ میں جامعہ سے متصل ہی ان کا ... احمد خاں رہتے ہیں، جو طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ہے۔ ان کے کمرے میں گنجائش ہے، آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند دنوں میں سبزی منڈی سے قرول باغ منتقل ہو گیا۔ احمد خاں صاحب نے اپنے کمرے میں جگہ دی لیکن کرایہ قبول نہیں کیا۔ ایک سال تک ان کے ساتھ رہا۔ نہایت مخلص اور شریف آدمی ثابت ہوئے۔ ۸ روپے جامعہ سے جو بطور معاوضہ کے ملتے تھے اس میں سے ... روپے میں نے جامعہ کی فیس تعلیم ادا کی اور چار روپے ماہانہ میں جامعہ کے مطبخ سے دو وقت کھانا جاری کرا لیا ... میں صرف دال اور چپاتیاں ملا کرتی تھیں۔ باقی پونے دو روپے ناشتہ اور اوپر کے خرچ کے لیے کافی ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پھر ایک روز جامعہ میں سرِ راہ ملاقات ہوئی تو استاد علیہ الرحمہ نے مجھے روک کر فرمایا "ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے چھوٹے بچے کو شام کو ایک گھنٹہ ان کی کوٹھی پر جا کر پڑھا دیا کریں۔ دس روپے ماہانہ معاوضہ کے طور پر وہ دیا کریں گے۔" اس طرح جامعہ میں بسہولت تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر آ گیا ...

اور جب تک جامعہ میں قیام رہا ان کی نوازشوں اور کرمفرمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ساری نوازشوں کا تذکرہ اس وقت نامناسب ہے لیکن ایک واقعہ کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک روز جامعہ لائبریری کے برآمدے میں اسٹینڈ پر جہاں روزنامہ اخبار لگے رہتے تھے، لوگ کھڑے ہو کر اخبار پڑھ رہے تھے، میں بھی اخبار دیکھ رہا تھا۔ بائیں طرف کے راستہ سے استاد علیہ الرحمہ گذر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو اُن سے آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر ان کو سلام کیے میں دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ استاد علیہ الرحمہ چلتے چلتے رُک گئے اور پھر جب میں نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا تو انھوں نے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے جواب تو دیا لیکن سلام نہ کرنے کی کوتاہی پر بڑی ندامت محسوس کی —— یہ تھا ان کا ایک انداز تربیت ——

دوسری ملاقات کا تاثر: ۱۹۴۰ء میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہو کر میں دربھنگہ آگیا ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور میں اس سے وابستہ ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا میں رکن بنایا گیا مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے پٹھان کوٹ آتے جاتے میں دہلی میں رُک کر احباب سے ملاقات اور اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ استاد علیہ الرحمہ جب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تب بھی دہلی آتے جاتے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ جماعت کا لٹریچر ان کی خدمت میں پیش کرتا اور جماعت کی سرگرمیوں سے ان کو واقف کراتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تا آنکہ وہ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر ہو کے پٹنہ تشریف لائے۔ ان کا گورنری کا عہدہ قبول کرنا مجھ کو پسند نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ منصب ان کے مقام سے بہت فروتر تھا۔ نہ میں ان سے ملنے گیا اور نہ ان کی خدمت میں خیر مقدم کا کوئی خط ارسال کیا۔ تقریباً چھ مہینے کے بعد انھوں نے پٹنہ کے کسی صاحب سے میرے متعلق تذکرہ کیا کہ "یہاں بہار میں میرے ایک شاگرد ہیں حسنین۔ وہ اب تک ملاقات کے لیے نہیں آئے، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ کبھی کبھی وہ میرا ایمان تازہ کر دیا کرتے تھے" ان صاحب نے پٹنہ میں مجی شبیر احمد (جو ان دنوں پٹنہ میں ایک سوڈا واٹر فیکٹری کے منیجر تھے) سے میرے بارے میں استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو دہرائی۔ ایمان تازہ کرنے کی بات یہ ہے کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا تو جماعت کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ مجی شبیر احمد صاحب نے مجھ کو پٹنہ سے ایک کارڈ لکھا کہ تم اب تک اپنے استاد سے کیوں نہیں مل سکے اور استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو نقل کی۔ اُن کا خط ملنے پر میں نے استادؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا، بعد القاب و آداب میں نے عرض کیا تھا:

"گورنر کی حیثیت سے آپ کو پٹنہ تشریف لائے ہوئے کافی دن ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ نہ تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا اور نہ خیر مقدم کا کوئی خط ہی ارسال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس اُلجھن میں ہوں کہ آپ کے لئے گورنری، قلندری سے کیسے افضل ہو گئی ہے اور آپ نے اسے کیسے پسند فرما لیا؟ اخبارات میں یہ پڑھ کر تو خوشی ہوئی کہ آپ اس ریاست کو ایک نمونے کی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جس کے کارپردازوں کا طرزِ عمل ظلم و جور کا ہو، اس کو نمونے کی ریاست بنانے میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی۔ جماعت اسلامی ہند سے تو آپ بہت حد تک واقف ہیں۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں حکومت بہار کا جو رویہ ہے اس کے متعلق "دعوت" اخبار میں میرا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشا ارسال خدمت ہے۔" (ان دنوں حکومت بہار نے جماعت اسلامی پر SUBVRSIVE ACTIVITIES کا الزام لگایا تھا اور سرکاری ملازمین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لوگ جماعت کی سرگرمیوں سے دور رہیں، ورنہ CONDUCT RULE دفعہ ۲۴ کے تحت ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی)۔ دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ "اب مجھ جیسا معمولی آدمی اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی چاہے تو کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟" اور جماعت کا کچھ تازہ لٹریچر بھی خط کے ساتھ رجسٹرڈ ڈاک سے استاد علیہ الرحمہ کی خدمت میں ارسال کر دیا لیکن پندرہ دنوں تک نہ ان کی طرف سے کوئی جواب آیا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اس پر میں نے معمولی ڈاک سے دوسرا عریضہ ان کی خدمت میں ارسال کیا اور اس میں یہ عرض کیا کہ دو ہفتوں سے زاید ہو گئے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ اور چند کتابیں ارسال کی تھیں تعجب ہے کہ اس کے جواب میں نہ تو آپ کا کوئی گرامی نامہ ملا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں ورنہ آپ سے ایسی توقع نہیں ہے کہ آپ میرے عریضے کا جواب نہ دیں گے۔ میرے اس عریضے کے جواب میں رانچی سے ان کا گرامی نامہ ملا۔ اس خط کا مضمون یہ ہے:

راج بھون۔ رانچی کیمپ
۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

عزیزم حسنین صاحب   السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کے دونوں محبت نامے ملے۔ آپ کا بھیجا ہوا لٹریچر بھی ملا۔ معافی چاہتا ہوں کہ پہلے خط کے جواب میں اتنی دیر ہوئی کہ آپ کو یاد دہانی کرنی پڑی۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہو، اس لیے وجہ لکھے دیتا ہوں۔ میں ذاتی خطوط کے لکھنے میں بہت کاہل ہوں۔ پھر اگر کوئی دوست یا عزیز اپنے خط میں کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے، جو میری شخصی

داخلی زندگی سے متعلق ہو تو مجھے اس کا جواب لکھنا اور دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں پہلی الجھن یہ بتائی ہے کہ گورنری قلندری سے کیسے اور کب سے افضل ہو گئی اور میں نے گورنری کو قلندری پر کیسے ترجیح دی۔ اس کے جواب میں اگر کچھ رکا تو آپ کو ہمدردی ضرور ہونی چاہیئے۔

پہلے تو عزیز من! میں قلندر کب تھا، لیکن سوال کو اپنی ذات سے الگ کر کے ایک اصولی سوال سمجھوں تو اس کا بہت اچھا جواب حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ایک جگہ دیا ہے۔ عبارت نقل کئے دیتا ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا:

"از استاد ابو القاسم قشیریؒ شنیدم کہ گفت بمردمان اندر فقر و غنا ہر کسی سخن گفتہ اند خود را چیزی اختیار کردہ و من آن اختیار کنم کہ حق مرا اختیار کند۔ و من را اندر آن نگاہ دارد، اگر توانگر دارد م غافل گذاشتہ نباشم و گر درویش دارد م حریص و معترض نباشم پس غنا نعمت و اعراض اندر وی آفت و فقر نعمت و حرص اندر وی آفت[1]"

(مطلب: ۔ استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے سنا فرمایا: فقیری اور مالداری کے سلسلے میں لوگوں نے بات کہی ہے اور اس کو اختیار کیا ہے، میں اس کو اختیار کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لئے پسند فرمائے اور مجھ کو اپنی نگاہ میں رکھے۔ اگر مالداری کی حالت میں رہوں تو اللہ سے غافل نہ ہونے پاؤں اور اگر غربت کی حالت میں رہوں تو حریص اور لالچی نہ بنوں۔ لہٰذا مالداری نعمت ہے اور اس حال میں اللہ سے غفلت آفت ہے۔ غریبی اور فقیری بھی نعمت ہے اور اس حال میں حرص آفت ہے۔)

دوسری الجھن کا جواب سہل ہے۔ میں ابھی کوئی تین چار ہفتہ یہاں ہوں۔ وسط اکتوبر سے انشاء اللہ پٹنہ میں رہوں گا۔ آپ ایک کارڈ میرے سکریٹری کو لکھ دیں وہ مجھ سے پوچھ کر آپ کے لئے وقت مقرر کر دیں گے۔ ضرور تشریف لایئے۔ مفصل گفتگو کو بہت جی چاہتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور خوش بھی۔"

خیر طلب: ذاکر حسین

میں نے استادؒ کی ہدایت کے مطابق ان کے سکریٹری کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے وقت مقرر کر کے مجھے مطلع کیا۔ مقررہ وقت پر میں راج بھون پہنچا۔ ان کے ملٹری سکریٹری نے میرا استقبال کیا اور ان کے کمرے تک میری رہنمائی کی۔ میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ استادؒ کو میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر معانقہ کے لئے

۱۔ کشف المحجوب (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء) ص ۲۳

کھینچ لیا اور اسی حال میں قہقہہ لگا کر فرمایا آپ لوگ حکومت پر بہت تنقید کرتے ہیں" پھر اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت
کی۔ میں نے جواب میں عرض کیا "جب ہم مجبور ہوتے ہیں تبھی حکومت پر تنقید کرتے ہیں" اس کے بعد دوسرا سوال
انھوں نے یہ کیا کہ کیا ابھی مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے کہیں یہ کہا ہے کہ "جماعت اسلامی
پاکستان نہیں چاہتی تھی ـــــ ؟" میں نے عرض کیا "کہا ہوگا" جماعت اسلامی تو پوری دنیا
میں اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ہندوستان کے دو ٹکڑوں پر ہی قناعت کر
لی ہے" انھوں نے فرمایا کہ "حسنین صاحب آپ لوگ حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن عام طور
سے ہندوستان کے مسلمان حکومت الٰہیہ نہیں چاہتے ہیں" میں نے ان سے کہا یہ ان کی کم حوصلگی اور
پست ہمتی ہے ورنہ مسلمان کی حیثیت سے : "ہر ملک ملک ماست، ملک خدا ماست" ہر ملک میں حکومت
الٰہیہ یا اللہ کا دین قائم ہونا چاہیئے" اس کے بعد میں نے عرض کیا "آپ کی حکومت نے جماعت اسلامی
SUBVERSIVE کیسے قرار دیدیا، ہم لوگ تو پُرامن طریقے پر لوگوں کو اللہ کے راستے پر بلاتے
ہیں کوئی توڑ پھوڑ، قتل و غارت گری کا طریقہ نہیں اپناتے ہیں" انھوں نے فرمایا "SUBVERSIVE
ہونے کے لئے اتنا کافی ہو سکتا ہے کہ حکومت کے دستور کو تسلیم نہ کیا جائے اور غیر پارلیمانی طریقے سے حکومت
کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دیکھئے کمیونسٹوں نے ملک کے دستور کو مان کر کیرالا میں الکشن میں
حصہ لیا اور الکشن میں کامیاب ہونے پر وہاں حکومت بنائی۔ آپ لوگ بھی دستور کو مان کر پارلیمانی طریقے سے
حکومت کو بدل سکتے ہیں" میں نے عرض کیا کہ اگر SUBVERSIVE سے یہ مطلب ہے تو ہم اقراری مجرم ہیں
یہ فرمائیے کیا ہم آپ کی ریاست میں اللہ کا نام لے سکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ اس سے آپ کو کون روک
سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہم لا الٰہ الا اللہ کی تشریح کریں گے تو پھر SUBVERSIVE آجائے گا
اس پر آپ نے فرمایا کہ ایک چیز ہے پھل اور ایک چیز ہے درخت۔ پھل سے اگر لوگوں کو اختلاف ہے
تو قبل از وقت پھل کا تذکرہ مت کیجئے، درخت لگانے کی کوشش کیجئے۔ جب لوگ اس کے میٹھے پھل
کو چکھیں گے تو مخالفت ترک کر دیں گے" میں نے بادب عرض کیا کہ "درخت لگانے کا عمل چپکے سے اور
اکیلے سے تو نہیں ہوگا اس کی خوبیوں کو بتا کر کچھ لوگوں کو تو اپنے ساتھ لینا ہی ہوگا اور ان کے تعاون ہی سے
یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ میں نے جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقہ کار کا مختصراً تعارف کرایا۔ آپ نے
توجہ اور صبر سے میری باتوں کو سنا اور فرمایا "ٹھیک ہے جس بات کو آدمی حق سمجھے اس کے لئے جدوجہد کرے

س کے بعد میں نے عرض کیا کہ "آپ کی حکومت میری ہمہ وقت نگرانی کیوں کرتی ہے؟ سی، آئی، ڈی کے دو آدمی سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں۔" جواب میں انھوں نے فرمایا "یہ آپ کے لئے ہی مخصوص نہیں ہوگا، تمام سیاسی رکردوں کی نگرانی کی جاتی ہے آپ کی بھی کی جاتی ہوگی۔ اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات ہیں ہے۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں آپ اپنا کام کیجئے۔ راہِ حق میں دشواریاں تو پیش آتی ہی ہیں۔"

جب میں استادؒ سے ملاقات کے لئے پٹنہ پہنچا تھا تو برادرم سید وسیم اللہ صاحب کے یہاں قیام کیا تھا جو ان دنوں سکریٹریٹ میں ملازم تھے اور کسی اونچے منصب پر فائز تھے۔ جماعت اسلامی سے ان کا تعلق ہمدردی' کا تعلق تھا لیکن اس تعلق کی بنا پر ان کے خلاف کاروائی چل رہی تھی۔ استاد مرحوم سے پہلے جو ورنر صاحب تھے انھوں نے کوئی آرڈیننس جاری کیا تھا کہ جو سرکاری ملازم کسی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث یا جائے گا اس کا COMPULSORY RETIREMENT ہو سکتا ہے۔ اسی آرڈیننس کے تحت یم اللہ صاحب کے خلاف کاروائی ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس آرڈیننس کی مدت ختم ہو چکی تھی اور گورنر صاحب بھی شریف لے جا چکے تھے۔ میں نے وسیم اللہ صاحب سے کہا کہ اس آرڈیننس کا نام اور نمبر وغیرہ لکھ کر دیدیں۔ میں استاد رحوم سے اپنی ملاقات میں اسے پیش کر دوں گا۔ وسیم اللہ صاحب نے ایک کاغذ پر اس کا نام اور نمبر وغیرہ لکھ کر ے دیا۔ میں نے اس کو استادؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے چشمہ بدل کر بغور اس کو پڑھا اور پوچھا کہ اس طرح کے کتنے آدمیوں کے خلاف کاروائی ہوئی ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "بہار میں تقریباً ۱۲۰ اشخاص کو جو اعت اسلامی کے رکن تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، پرائمری اسکول کے ٹیچر سے لے کر گزیٹیڈ آفیسر تک کو اعت اسلامی کی رکنیت کے جرم میں برطرف کیا جا چکا ہے۔" ان لوگوں نے ملازمت سے برطرفی کو گوارا کیا اور اعت سے اپنے تعلق کو برقرار رکھا۔ لیکن وسیم اللہ صاحب جماعت کے رکن نہیں ہیں۔ ان پر جماعت کی نیت کا غلط الزام لگا کر ان کو پریشان کیا جا رہا ہے۔" استادؒ نے اس پرزے کو رکھ لیا۔

ہماری یہ ملاقات بہت زیادہ طویل ہوگئی تھی اور ان کے پاس یاد دہانی کی گھنٹی بار بار بجتی رہی۔ ب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مقررہ وقت سے زیادہ ہی وقت صرف ہو چکا ے اور لوگ انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ باقی انشاءاللہ آئندہ —— اس طرح ان سے مصافحہ کر کے رخصت ا اور وہ دروازے تک پہنچا گئے۔

کچھ دنوں کے بعد جب وسیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ان کے خلاف

کاروائی ختم ہو چکی ہے اور ان کی ترقی کے ساتھ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور میرے ساتھ سی آئی ڈی کی ہمہ وقت نگرانی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ دربھنگہ میں سی، آئی، ڈی کے ایک آفیسر نے آکر کہا کہ ہمارے پاس آرڈر آگیا ہے کہ اب آپ کی نگرانی نہ کی جائے۔

تیسری اور آخری ملاقات:۔ جماعت اسلامی ہند نے مجھ کو ۱۹۶۲ء میں دعوت کے تعارف کے سلسلے میں آسام کا امیر حلقہ بنا کر گوہاٹی بھیجا۔ ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک میں آسام میں رہا۔ ابتداء ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی ہند کے اجتماع میں شرکت کے لئے مجھ کو دلی جانا تھا۔ استاد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا کہ میں دلی حاضر ہو رہا ہوں اور ان تاریخوں میں جماعت اسلامی میں مقیم رہوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اگر موقع ہو تو وقت سے مرکز جماعت اسلامی کے پتہ پر مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں استاد محترم کا جلد ہی ایک گرامی نامہ ملا جس میں درج تھا کہ "جن تاریخوں میں آپ دلی میں رہیں گے، ان تاریخوں میں افسوس ہے کہ میں دلی میں نہ رہوں گا۔ پہلے سے جنوب کا پروگرام بن چکا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ملاقات ہوگی۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد استاد کے پرائیوٹ سکریٹری اور ملٹری سکریٹری کے خطوط ملے۔ جس میں درج تھا کہ وہ استاد ۲۵ ... گوہاٹی پہنچ رہے ہیں۔ اس دن شام کو ساڑھے پانچ بجے سرکٹ ہاؤس میں مجھ سے مل کر وہ ... اس کے بعد دوسرے دن سی، آئی، ڈی کے ایک افسر میرے پاس آئے اور بتایا کہ پریسیڈنٹ ۲۵ ... گوہاٹی آرہے ہیں۔ ان کے پروگرام میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔ مہربانی کر کے سی آئی ڈی ... آیئے آپ کو ایک پاس دیا جائے گا اُسے لے کر ہی آپ اُن کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں سی آئی ڈی ... سی آئی ڈی افسر نے مجھ سے پوچھا کہ صدر جمہوریہ ہند کس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ان سے آپ کا کیا تعلق ... میں نے ان کو بتایا کہ وہ میرے استاد رہ چکے ہیں۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی ہے ... سے لے کر ۱۹۳۰ء تک میں وہاں رہا۔ وہ ہمارے استاد بھی رہے اور وائس چانسلر بھی رہے۔ اسی تعلق ... سے ملنا ہے۔ چنانچہ مجھ کو ایک پاس دیا گیا اس کو لے کر میں ان سے ملا۔ میری ملاقات سے پہلے گوہاٹی ... ایک بڑے میدان میں ان کی تقریر تھی۔ پہلے میں اس جلسے میں شریک ہوا اور ان کی تقریر سنی۔ اس کے بعد ... وقت سے چند منٹ پہلے سرکٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ مجھے ویٹنگ روم میں بٹھایا گیا۔ اُن کے ملٹری سکریٹری ... میرے پاس آئے اور بتایا کہ سب سے پہلے آپ کی ملاقات ہے اور آپ کی ملاقات کے لئے پانچ منٹ ...

ہ گیا ہے۔ جب آپ کی طلبی ہوگی تو میں آپ کو ان کے ملاقات کے کمرے میں پہنچا دوں گا اور کمرہ بند کردوں گا۔
ب آپ کا وقت ختم ہوجائے گا تو میں دروازہ کھول کر کھڑا ہوجاؤں گا تو مہربانی کرکے آپ اٹھ جایئے گا ورنہ
ب تک آپ بیٹھے رہیں گے وہ بھی آپ سے باتیں کرتے رہیں گے اور آپ کے بعد والوں کو موقع نہیں مل سکے گا۔
ھانے کہ اس کے بعد نماز کا وقت ہوجائے گا اور وہ نماز پڑھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے مجھ
ادداشت نہیں پیش کرنی ہے اور نہ کوئی لمبی چوڑی گفتگو کرنی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خیر و عافیت
ریافت کریں گے اور وقت ختم ہونے پر اٹھ آئیں گے۔ ہماری یہ گفتگو ملٹری سکریٹری سے ہو رہی تھی کہ
ستاذؔ بی۔ کے نہرو کے ساتھ جو اس وقت آسام کے گورنر تھے سامنے آئے اور ان سے جدا ہو کر ملاقات
کمرے میں گئے اور گھنٹی بجائی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی مجھے طلب کر لیا۔ میں اندر داخل ہوا اور سلام
عرض کیا۔ وہ اٹھے بڑھ کر گلے لگایا۔ خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ "آپ آسام کیسے آگئے؟" میں نے
عرض کیا کہ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں نے جماعت اسلامی ہند بنائی ہے اور کچھ لوگوں نے اپنی زندگیاں
ماعتی سرگرمیوں کے لئے وقف کردی ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔ ۲۲ سالوں تک بہار، اڑیسہ،
بنگال میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت پیش کرتا رہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہاں کچھ کارکن تیار ہو گئے،
اب جماعت نے مجھ کو آسام بھیجا ہے تاکہ یہاں بھی جماعت اسلامی کی دعوت پیش کروں۔ ساتھ ہی ساتھ
سامی زبان میں اسلامی لٹریچر بھی تیار کرانے کا کام میرے سپرد ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آسامی زبان
میں اسلامی لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔" انھوں نے فرمایا "کہ آپ نے بڑے استقلال سے کام کیا۔" میں نے عرض
کیا کہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے کہ اس کام کی سعادت حاصل ہوئی۔
آپ نے فرمایا کہ "آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے تیار کرانے کا کام بھی بہت اہم ہے۔" انھوں نے اپنی
جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے لئے دیا۔ میں نے
قبول کرنے میں تامل کیا کہ آپ سفر کی حالت میں ہیں، خود ہی طور پر دینا کیا ضروری ہے۔ انھوں نے میری جیب میں
نوٹ ڈال دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "پچھلے دنوں آپ نے محسن انسانیت بھیجی ہے۔ سیرت پر یہ کتاب مجھ کو
بہت پسند آئی۔ سیرت پر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا شبلیؒ کی "سیرت النبیؐ" بھی
پڑھی ہے۔ مگر محسن انسانیت مجھ کو بہت پسند آئی۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ
اس مختصر ملاقات میں زیادہ تر انھیں کے ارشادات سنوں گا اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں پوچھوں گا

لیکن جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے پہلی بات یہ عرض کی کہ آج جمعہ کا دن تھا اگر گوہاٹی کی کسی مسجد میں جمعہ نماز بھی آپ کے پروگرام میں شامل ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں کے مسلمانوں کو توقع تھی کہ مسلمان صدر جمہوریہ ہند یہاں کی کسی مسجد میں نماز ادا کریں گے تو قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس سلسلہ میں گوہاٹی کے مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ "میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے اور فرش پر نماز ادا کرنے میں تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر نماز پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی عید بقرعید کے موقع پر دہلی کی عیدگاہ میں چلا جاتا ہوں تو بڑی تکلیف کے ساتھ نماز ادا کر پاتا ہوں۔" میں نے عرض کیا کہ یہ عذر معقول ہے لیکن لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوگی ــــــ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ "آپ کے جو بھی ہوم منسٹر ہوتے ہیں جماعت اسلامی کے خلاف غلط الزام لگایا کرتے ہیں اور ہم لوگ ان کی صفائی میں جو کچھ کہتے ہیں اُن کا وہ کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ایک طرح کے الزامات بار بار دہراتے رہتے ہیں۔" انھوں نے فرمایا کہ "وہ اپنا کام کرتے ہیں، آپ اپنا کام کیجئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل لوگوں کو اور سب جماعتوں کو خوش رکھنے کے لئے اور توازن برقرار رکھنے کے لئے سیاسی لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حقیقت اور صداقت کے خلاف ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کہ خود چوہان جی کی (جو اس وقت ہوم منسٹر تھے) جماعت کے بارے میں اپنی رائے کیا ہے۔ لیکن عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ الکشن میں کامیابی کی خاطر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے الکشن کا موجودہ طریقہ غلط ہے۔" اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ "تب تو الکشن میں جماعت اسلامی کا حصہ نہ لینا حق بجانب ہے۔" اس کا انھوں نے خاموش مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ بھارت میں فسادات کا سلسلہ آخر کبھی ختم بھی ہوگا؟ میرے اس سوال پر وہ افسردہ سے ہو گئے، اور کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا "ہم لوگ مسلمان ہیں اور فسادات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہٰذا فسادات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، ورنہ حکومت کی کونسی کل سیدھی ہے؟ دیکھئے "تلنگانہ" میں کیا ہو رہا ہے؟ (اس وقت آندھرا پردیش میں تلنگانہ کی پُرتشدد تحریک زوروں پر تھی) اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری لیڈر شپ بہت کمزور ہے۔" یہ سنکر میں حیرت میں مبتلا ہو گیا کہ اپنی ہی حکومت کے سلسلے میں صدر جمہوریہ کیا فرما رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ صدر کے ملٹری سکریٹری دروازہ کھول کر کھڑے ہوئے اور میں بھی ان کی ہدایت کے مطابق اٹھ کھڑا ہوا۔ استاد محترم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں الوداعی سلام کر کے ہاتھ ملا کر دروازہ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھے ہوئے

دروازے تک یہ کہتے ہوئے آئے کہ اللہ آپ لوگوں کو کامیاب کرے، آپ لوگوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔" اس آخری ملاقات کے بعد جب میں باہر نکلا تو میں بہت خوش اور مسرور تھا کہ انھوں نے میری سرگرمیوں کی تائید فرمائی اور دعا دی۔ ان کی حوصلہ افزائی اور دعائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور اب تک گونج رہی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ میری خوشی اور مسرت کے لمحات بہت عارضی ثابت ہوئے۔

ایک ہفتہ بعد ۳ مئی کو میرے ایک دوست نے آکر خبر دی کہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کر گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وانّا الیہ راجعون ــــــــ یہ خبر سُن کر میں اس درجہ متأثر ہوا کہ بستر پر جاکر لیٹ گیا اور دیر تک روتا رہا۔ جب کچھ سکون ملا تو وہاں سے اپنے ایک عزیز کے یہاں چلا گیا جن کے پاس ریڈیو سٹ تھا۔ بستر پر لیٹا لیٹا اس وقت تک ریڈیو سُنتا رہا جب تک ان کی تجہیز و تکفین نہ ہوگئی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے ـــــ آمین

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی ان دو حرفوں کی تفسیر تھی : "با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا" یا اقبالؒ کے اس مصرع کے مصداق تھے : " مروّت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا" ــــــــ یا اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق تھے " تم میں سب سے اچھا انسان وہ ہے، جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو ــــ اور اللہ نے مجھ کو اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا" اور ارشادِ ربانی ہے " ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم " تم میں سب سے محترم و مکرم بندہ وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے والا پرہیزگار ہو۔

●●

ریاض الرحمٰن شیروانی

• جناب ریاض الرحمٰن شیروانی: پیدائش ۱۹۲۴ء بمقام حبیب گنج، ضلع علی گڑھ،
تعلیم: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، قاہرہ یونیورسٹی۔ چوتھی صدی ہجری کے عالم ابو الفرج المعافیٰ بن زکریا الجریری النہروانی کے مخطوطے "کتاب الجلیس والأنیس" کی پہلی پچیس مجلسیں ایڈٹ کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں ریڈر کے عہدے پر ترقی ملی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں صدرِ شعبہ کے فرائض انجام دیے۔ یکم مارچ ۱۹۸۳ء کو کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اہم عربی، انگریزی اور اردو کے مجلات و جرائد میں ڈیڑھ سو کے قریب مضامین، تراجم اور تبصرے شائع ہو چکے ہیں جو علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن مجلات و جرائد میں یہ تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں "المجمع العلمی الہندی" علی گڑھ، "اسلام اینڈ ماڈرن ایج" نئی دہلی، "ویوز اینڈ ریویوز" نئی دہلی، "معارف" اعظم گڑھ، "اردو ادب" علی گڑھ، "نگار" کراچی، "فکر و نظر" علی گڑھ، "صبا" حیدر آباد، "شاہکار" الٰہ آباد، "جامعہ" نئی دہلی، "صبح" دہلی، "علیگڑھ میگزین" علی گڑھ، "پگڈنڈی" امرتسر، "آجکل" نئی دہلی قابل ذکر ہیں۔
ہندی انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ بنارس ۱۹۶۰ء میں ابن سینا، پر مضمون اور عربی کے ایک درجن ادبا و شعراء پر نوٹ شائع ہوئے تھے۔

دیگر مشاغل و مناصب: رکن مجلس منتظمہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، سابق نائب صدر انجمن ترقی اردو، اترپردیش، سابق پرووسٹ آفتاب ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سابق رکن اکیڈمک کونسل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

••

۱

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام اور کام سے 'کان ابتدا ہی سے آشنا تھے۔ دہلی علیگڑھ سے دور نہیں اور ذاکر صاحب کا تعلق علی گڑھ سے اتنا قریبی تھا کہ کسی علی گڈھ والے کے لئے ان سے نا آشنا رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں مسلم یونیورسٹی کا نظم و نسق جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا ان سے ذاکر صاحب کے اختلافات تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلم یونیورسٹی کی مختلف علمی اور تعلیمی مجلسوں سے وابستہ تھے اور یونیورسٹی کے علمی اور ادبی حلقوں میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہمارے ملک کی تاریخ میں عام طور سے بڑا پر آشوب اور ہنگامہ خیز دور تھا اور اس سے مسلم یونیورسٹی بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔ جس طرح پورے ملک میں اسی طرح یونیورسٹی میں بھی مسلمان اساتذہ اور طلبہ کی بھاری اکثریت تقسیم ملک کے حق میں تھی۔ میرا تعلق اس چھوٹی سی اقلیت سے تھا جو اس تحریک سے متفق نہیں تھی اور ملک کے اتحاد اور سالمیت کی حامی تھی۔ ہم نے اپنی راہ سوچ سمجھ کر متعین کی تھی اور اس لئے ہمیں یہ حق نہیں تھا کہ اپنے اقلیت میں ہونے کا شکوہ کرتے لیکن ہمیں یہ شکایت ضرور تھی کہ اس وقت یونیورسٹی کا ماحول ایسا تھا جس میں اکثریت کے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی دوسرے نقطۂ نظر کی شنوائی بالکل نہیں تھی، اس کا احترام کرنا تو علیحدہ رہا، اسے برداشت کرنے کے لئے بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ اس لئے اس وقت ہم علی گڈھ کی فضا میں بڑی گھٹن اور اجنبیت محسوس کرتے تھے۔ یہاں کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے جنھوں نے ہمیں بہت تکلیف پہنچائی تھی اور ہماری اداسی اور تنہائی میں اضافہ کر دیا تھا۔

اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جوبلی ہوئی اور ہم نے سنا کہ وہاں ذاکر صاحب نے جامعہ کے اسٹیج پر کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو دوش بدوش جمع کر دیا اور ان کا یکساں احترام کیا تھا ــــ ذاکر صاحب کے اپنے جو سیاسی خیالات تھے ان سے ہر شخص اچھی طرح واقف تھا، اس کے باوجود ان کی یہ فراخ دلی کہ انھوں نے موافقین کے ساتھ مخالفین کی بھی پذیرائی فرمائی اور ان کے احترام میں بھی فرق نہیں آنے دیا، ہمارے لئے ایک بالکل نیا اور علی گڑھ سے یکسر متضاد تجربہ تھا جس سے ان دنوں خود ہمارا سابقہ تھا۔ ذاکر صاحب کی شرافت اور عظمت کا پہلا نقش میرے دل پر اسی واقعے سے ثبت ہوا۔ پھر میں نے ان کا وہ خطبہ پڑھا جو اس موقع پر انھوں نے جامعہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

اور جس میں ایک طرف ان کٹھنائیوں کا ذکر کیا تھا جن سے جامعہ کے کارکنوں کو گزرنا پڑا تھا اور دوسری طرف ملک کے رہنماؤں سے اپیل کی تھی کہ وہ ملک میں پھیلی ہوئی نفرت کو روکیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے شعلوں سے عمر بھر کی کمائی جل کر راکھ ہو جائے اور تعلیم کا کام — جو دراصل محبت کا کام ہے — اس ملک میں ممکن نہ رہے۔ ذاکر صاحب کا یہ خطبہ میرے نزدیک عزم اور خلوص دونوں کا شاہکار ہے اور اسے پڑھ کر آج بھی دل وہی گرمی اور دماغ وہی روشنی محسوس کرتا ہے جو اس نے اوّل روز محسوس کی تھی۔ ان ہی دنوں ذاکر صاحب پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی جسے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور ذاکر صاحب کی شخصیت کا نقش دل میں فروزاں تر ہو گیا۔ اس کتاب میں رشید صاحب نے (جہاں تک مجھے یاد آتا ہے) لکھا تھا کہ وہ اپنے اچھے طالب علموں کو ذاکر صاحب سے ملنے کا مشورہ دیتے تھے تاکہ وہ ان کی شخصیت سے کسب نور کر سکیں۔ یہ کتاب پڑھ کر میرے دل میں بھی ذاکر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ کچھ ہی عرصے بعد معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب علیگڑھ تشریف لائے ہیں اور حسب معمول رشید صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے آخر یا ۱۹۴۷ء کے شروع میں ایک خوشگوار صبح کو ہم تین ساتھی ذاکر صاحب سے ملنے کی آرزو دل میں لئے آفتاب ہوسٹل سے رشید صاحب کے مکان پر پہنچے اور ان کے مکان کے چھوٹے سے لیکن خوبصورت باغیچے میں ذاکر صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم طے کرکے گئے تھے کہ ذاکر صاحب سے اپنا تعارف نہیں کرائیں گے (کیونکہ اتفاق سے ہم تینوں ہی کے بزرگوں سے ذاکر صاحب اچھی طرح واقف تھے) تاکہ ان سے ہماری گفتگو بالکل آزادانہ ماحول میں ہو سکے۔ لیکن ہمارے بیٹھتے ہی ذاکر صاحب نے سب سے پہلے ہمارے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرلیں اور پھر گفتگو شروع ہوئی۔ ہم نے اس وقت کے علیگڑھ کے ماحول کا تذکرہ اور اس سے بیزاری کا اظہار کیا تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ ایم اے کرکے جامعہ چلے آیئے، زیادہ تو نہیں لیکن سو روپے ماہوار جامعہ آپ کو پیش کرے گی۔ وہاں رہ کر علمی کام کیجئے اور اس کے نتائج سے طلبہ کو روشناس کرایئے۔ اس سے چند ہی روز قبل یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی دعوت پر ڈاکٹر سید حسین اور جناب عبدالرحمٰن صدیقی علیگڑھ آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ یونین میں ان کی تقریر ہو، لیکن ڈاکٹر سید حسین کے سیاسی خیالات کی بنا پر یونین کے عہدیداروں نے ان کی تقریر کا اہتمام کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ان سے تقریر کرائی گئی تو طلبہ مزاحمت کریں گے۔ اس صورت میں جناب عبدالرحمٰن صدیقی بھی تقریر کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اور دونوں بغیر تقریر کئے ہوئے ہی علیگڑھ سے واپس چلے گئے تھے۔ اس واقعے کا ہم پر بہت اثر تھا۔ جب اس کا ذکر ہم نے ذاکر صاحب سے کیا تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ڈاکٹر سید حسین ذہین آدمی ہیں، وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہ کہتے جس سے

شکایت پیدا ہوتی۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر یہی حالات رہے تو علیگڈھ والے اچھے لوگوں کی صورت دیکھنے اور ان کی بات سننے کو ترس جائیں گے۔ دوران گفتگو ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔ ذاکر صاحب نے ہم سے سوال کیا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ ہم میں اس وقت نوجوانی کا جوش تھا چنانچہ میں نے اور میرے ایک ساتھی نے جواب دیا کہ ہم قوم کی خدمت کریں گے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ شروع میں سب یہی کہتے ہیں لیکن اگر نائب تحصیلداری بھی مل جائے تو قوم کی خدمت بھول کر اس میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہ فرما کر وہ ہمارے تیسرے ساتھی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کا بھی قوم کی خدمت کرنے کا ارادہ ہے۔ وہ ذاکر صاحب کی گفتگو سے ایسے کھلا گئے تھے کہ انھوں نے سر ہلا کر کہا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس پر ذاکر صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ اب قوم کی خدمت ایسی بُری بات بھی نہیں ہے جس سے آپ اس طرح براءت کا اظہار کریں۔ اس ملاقات کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور ذاکر صاحب کی ذہانت، اخلاص اور سادگی سے طبیعت خاص طور سے متاثر ہوئی۔ اس کے بعد ذاکر صاحب ہمارے ہیرو ہو گئے اور ہمارا دل چاہنے لگا کہ کاش وہ ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ اگرچہ ہم جانتے تھے کہ اس وقت جو حالات تھے ان میں ہمارا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونا ممکن نہیں تھا اور نہ خود ذاکر صاحب ہی کا جامعہ کو چھوڑنا آسان تھا۔

اس وقت کون جانتا تھا کہ جلد ہی حالات میں ایسی خوش گوار تبدیلی ہو گی کہ ہمارا یہ خواب حقیقت بن جائے گا۔ اور ذاکر صاحب واقعی وائس چانسلر ہو کر علیگڈھ تشریف لے آئیں گے۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں ان کا انتخاب اس منصب پر ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کی عجیب کیفیت تھی۔ دس سالہ سیاسی جوش و خروش کے بعد اب مایوسی اور بددلی کا دور دورہ تھا۔ نشہ اُتر چکا تھا، خمار باقی تھا، سب لوگ اعضا شکنی میں مبتلا تھے۔ ہر ایک کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا، خود اپنے مستقبل پر کسی کو اعتماد نہیں تھا۔ ہر شخص سہما اور ڈرا ہوا تھا کہ نہ معلوم کس وقت کیا ہو جائے گا۔ دوسری طرف یونیورسٹی اغیار کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ وہ افراد کی بے راہ روی کا انتقام ادارے سے لینا چاہتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ یونیورسٹی کو بند کر دینا چاہیے۔ کسی کی رائے تھی پاکستان کے فلاں تعلیمی ادارے سے الحاق کر کے اسے ملک بدر کر دینا چاہیے۔ اور کسی طرف سے آواز اٹھی تھی کہ یونیورسٹی کا نظم و نسق حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ غرض جتنے منھ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ تقسیم ملک کے بعد مسلم یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا آخری مرکز بن گئی تھی اور یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کی بالادستی کا کوئی چھوٹا سا نشان بھی باقی رہے۔ ان حالات میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نگاہ دوربیں نے ذاکر صاحب کا وائس چانسلر کے منصب کے لئے انتخاب کر کے مسلم یونیورسٹی پر ایسا احسان کیا جس کے بارے میں وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکے گی اور ذاکر صاحب نے بھی جامعہ کو چھوڑ کر ایسے ایثار کا ثبوت دیا جس کا احساس بہت کم لوگوں کو

۲

ذاکر صاحب سے میری دوسری ملاقات ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۹ء میں اس وقت ہوئی جب وہ مسلم یونیورسٹی
کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ چکے تھے اور میں عربی میں پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لے رہا تھا۔ شعبۂ عربی کے صدر
پروفیسر عبدالعزیز میمن کا ریٹائرمنٹ قریب تھا اور میں ان ہی کی زیرِ نگرانی کام کرنا چاہتا تھا۔ پروفیسر ہادی
حسن فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے۔ وہ شعبۂ عربی کی اندرونی کشمکش کے سبب میمن صاحب سے راضی نہ تھے۔
اس لئے انھیں اس میں تامل تھا کہ کوئی نیا طالب علم میمن صاحب کی زیرِ نگرانی پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لے۔ اس
سے میرے داخلے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت
حال سے انھیں آگاہ کروں۔ اُن دنوں وائس چانسلر کا دفتر وکٹوریہ گیٹ کے اُوپر تھا (بعد میں ذاکر صاحب
کو قلب کی تکلیف ہو جانے کی بنا پر نیچے آ گیا)۔ میں وائس چانسلر کے دفتر میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ
رہا تھا کہ دیکھا کہ ذاکر صاحب سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ نیچے آ کر میں نے اپنی حاضری کا مقصد گوش گزار
کیا تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو کسی ایسے اختلاف کا علم نہیں ہے۔ بہرحال آپ کا داخلہ ہو جائے گا۔
چنانچہ داخلہ ہو گیا۔ ایک سال کے بعد میمن صاحب کا ریٹائرمنٹ ہونے لگا۔ آرزو صاحب (پروفیسر
مختارالدین احمد) اور میں اس وقت ان کے زیرِ نگرانی پی، ایچ، ڈی کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے ذاکر صاحب
کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہمارا کام ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ اگر میمن صاحب ریٹائر ہو گئے تو کام ادھورا
رہ جائے گا اور کوئی ایسا استاد اس وقت شعبۂ عربی میں نہیں ہے جو اس کی تکمیل کرا سکے۔ ذاکر صاحب نے
فرمایا کہ میمن صاحب ریٹائر ہونے کے بعد بھی علی گڑھ ہی میں رہیں گے آپ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے
عرض کیا کہ میمن صاحب کا مزاج یہ نہیں ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری رہنمائی فرمائیں۔ اس پر ذاکر صاحب کا
جواب تھا کہ پھر تو ان کا ریٹائر ہو جانا ہی بہتر ہے۔

ذاکر صاحب ہی کے دورِ وائس چانسلری میں، میں نے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر
(اس وقت یونین کا سب سے بڑا عہدہ یہی تھا، صدر خود وائس چانسلر ہوتا تھا) کا انتخاب لڑا۔ یہ بھی ۱۹۴۹ء

کی بات ہے ۔ ملک کی تقسیم کو تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی اور ابھی تک یونیورسٹی میں مسلم لیگی خیالات کے طلبہ کی اکثریت تھی ۔ یہ انتخاب خالص نظریاتی بنیادوں پر ہوا تھا ۔ تین امیدوار تھے ۔ ایک امیدوار (دو ہوئے) مسلم لیگی تھے ۔ دوسرے کمیونسٹ اور نیشنلسٹ خیالات کی نمائندگی کرتا تھا ۔ اصل مقابلہ مسلم لیگی امیدوار کے درمیان تھا ۔ مسلم لیگی خیالات کے طلبہ کی جانب سے الیکشن میں زور زبردستی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا ۔ بعض اساتذہ کی درپردہ حمایت بھی انھیں حاصل تھی ۔ میرے بعض ساتھیوں نے ذاکر صاحب سے مل کر انھیں اس طرف توجہ دلائی، تو انھوں نے فرمایا کہ آپ الیکشن کو پھولوں کی سیج کیوں سمجھتے ہیں؟ یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے ۔ جب اس راہ پر نکلے ہیں تو جوانمردی سے حالات کا مقابلہ کیجیے' ۔ الیکشن کے بعد ایک دوست نے، جو طالب علم نہیں تھے، ذاکر صاحب کو خط لکھ کر شکایت کی کہ اگر آپ کے دورِ وائس چانسلری میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر کس سے توقع کی جائے ۔ ذاکر صاحب نے اس کا جواب دیا کہ ہتھیلی پر سرسوں (جمتی) نہیں ہے ۔ آہستہ آہستہ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اور پھر ذاکر صاحب نے واقعی سب ٹھیک کر دکھایا ۔

ذاکر صاحب کا انتظامی طریقۂ کار کیا تھا اس پر ایک واقعے سے بہت اچھی روشنی پڑتی ہے ۔ حصول آزادی سے قبل مسلم یونیورسٹی میں محرم کی تعطیلات بہت طویل ہوتی تھیں، یعنی ۱۰، ۱۲، ۱۱ دن ۔ بعد میں یہ کم ہو کر سات دن رہ گئی تھیں ۔ ذاکر صاحب ان میں مزید تخفیف کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ گھٹا کر دو دن کر دی گئیں (اب صرف ایک دن کی تعطیل ہوتی ہے) جب اس تخفیف کا اعلان ہوا تو طلبہ کی طرف سے اس پر احتجاج کیا گیا اور اسٹوڈنٹس یونین کے اُس وقت کے صدر احمد سعید صاحب نے اپنی ایک تقریر میں یہ پھبتی کسی کہ " ذاکر حسین، ذکرِ حسین سے روکنا چاہتے ہیں ۔" معاملہ اور آگے بڑھا اور طلبہ "بھوک ہڑتال" پر بیٹھ گئے ۔ ذاکر صاحب ان کے پاس تشریف لے گئے' اور فرمایا کہ جب تک تم کھانا نہیں کھاؤ گے میں بھی نہیں کھاؤں گا لیکن تعطیل میں بہرحال اضافہ نہیں ہوگا ۔ بالآخر ہڑتال اور احتجاج ختم ہو گیا اور چھٹی جتنی کم کر دی گئی تھی، اُتنی ہی رہی ۔

ذاکر صاحب کے مزاج کا ایک پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کی خدمت میں کوئی درخواست پیش کرتا تو وہ اس پر اپنے تاثر کا آغاز منفی انداز میں فرماتے تھے ۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ درخواست کرنے والا کتنے پانی میں ہے اور اس نے اپنے موقف پر کتنا غور کیا ہے ۔ جب انھیں اس کی استقامت کا احساس ہو جاتا تب اس کی بات مان لیتے ۔ میمن صاحب کے ریٹائر ہو جانے کے بعد

میرا پی، ایچ، ڈی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور اس وقت تک میرا ملازمت کرنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میں نے ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں کوئی علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مشورہ دیں کہ کیا کام کروں۔ ذاکر صاحب اس سے واقف تھے کہ گاؤں میں میری زمینیں ہیں جہاں کاشت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ علمی کام کے مقابلے میں تجارت زیادہ منافع بخش پیشہ ہے، آپ آڑھت کا کام کیوں نہیں کرتے؟ گاؤں سے غلّہ لا کر شہر کی منڈی میں فروخت کریں بہت نفع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا رجحان اِس طرف بالکل نہیں ہے ورنہ ایم اے کیوں کرتا اور پھر پی ایچ ڈی میں داخلہ کیوں لیتا۔ ذاکر صاحب نے اس طرح فرمایا گویا کوئی نئی بات ان کے علم میں آئی ہو۔ "ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ پہلے آپ کسی اچھی علمی کتاب کا انگریزی یا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیجیے؛ اور دیر تک ترجمے کی اہمیت اور اس کے رموز پر روشنی ڈالتے رہے۔ ایک خاص بات یہ فرمائی کہ عام طور سے مسلمان ان یوروپین مصنفین سے خوش ہوتے ہیں جو ان کے مذہب اور اہلِ مذہب کی تعریف کر دیتے ہیں چاہے اِس تعریف میں گہرائی ہو یا نہ ہو۔ آپ کسی ایسی کتاب کا انتخاب نہ کریں بلکہ واقعی کوئی علمی کتاب ترجمے کے لئے منتخب کریں۔ ایک دوست، جو علی گڑھ سے ایم۔ ایس۔ سی کر کے چلے گئے تھے اور گورکھپور میں لکچرار ہو گئے تھے، واپس آئے کہ پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لیں۔ جب ذاکر صاحب سے ملے تو انھوں نے فرمایا کہ "آپ لگی ہوئی ملازمت کیوں چھوڑنا چاہتے ہیں"؟ انھوں نے کہا کہ وہاں ریسرچ کی سہولتیں نہیں ہیں۔ فرمایا یہ بتایئے کہ پہلے ریسرچ ہوئی یا پہلے سہولتیں وجود میں آئیں۔ اگر ریسرچ ہی نہ ہوتی تو سہولتیں کہاں سے وجود میں آجاتیں! بعض طلبہ تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت نہ ملنے کی شکایت لے کر ذاکر صاحب کے پاس جاتے تھے۔ ذاکر صاحب ان میں کسی سے کہتے کہ ملازمت نہ ملنے کی صورت میں آپ رکشا چلایئے! اور کسی سے فرماتے کہ گھاس چھیل کر فروخت کیجیے، کیونکہ تعلیم یافتہ آدمی جو کام بھی کرے گا غیر تعلیم یافتہ آدمی کے مقابلے میں بہتر طور پر کرے گا۔ اِس سے ان کا مقصد ان طلبہ کی ذہانت اور پامردی کا امتحان لینا ہوتا تھا۔ لیکن اکثر طلبہ ان کے اس طرزِ عمل سے ناراض ہو جاتے اور باہر آ کر دوستوں سے ان کا شکوہ کرتے۔ ذاکر صاحب اشخاص کے کردار اور طرزِ عمل کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر نظر رکھتے اور ان سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وی، سی، لاج کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں شیشوں میں سے بیرونی منظر صاف نظر آتا ہے۔ ایک صاحبزادے ان سے ملنے کی غرض سے آرہے تھے کہ بوندیں آگئیں۔ وہ بھاگ کر وی سی لاج کے برآمدے میں پہنچے۔ جب ذاکر صاحب سے ملنے کے لئے کہلوایا تو انھوں نے فوراً اندر بُلا لیا۔ صاحبزادے

جس مقصد سے آئے تھے (جو غالباً مالی مدد سے متعلق تھا) جب وہ گوش گذار کر چکے تو ذاکر صاحب نے فرمایا:
"میاں! جب تم چند بوندوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو زندگی کے مسائل اور مشکلات کا مقابلہ کیسے کروگے!" ا
یہ بھی سمجھایا کہ معمولی رفتار سے چل کر آنے اور بھاگ کر آنے میں تھوڑا ہی فرق پڑتا ہے۔ آدمی کو جتنا بھیگنا
ہے بہر حال بھیگ جاتا ہے۔ اگر کسی پارٹی یا جلسے میں کسی ایک شعبے یا دفتر کے اراکین کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے
دیکھتے تو فرماتے کہ اپنے شعبے یا دفتر کے لوگوں سے تو آپ روز ہی ملتے رہتے ہیں، ایسے جلسوں اور پارٹیوں
میں دوسرے شعبوں اور دفتروں کے اراکین کے ساتھ مل کر بیٹھنا چاہیے تاکہ واقفیت بڑھے اور دوسروں
کے ساتھ تعلقات استوار ہوں۔ اگر کوئی طالب علم شیروانی کے بٹن کھولے ہوئے ہوتا تو اس سے بجائے یہ
کہنے کے کہ بٹن بند کرلو، خود اپنے ہاتھ سے اس کے بٹن بند کرنے لگ جاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ فوراً
باقی بٹن خود بند کر لیتا۔ اس معاملے میں یہی طرز عمل مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر
ابوبکر احمد حلیم (مرحوم) کا بھی تھا۔

پروفیسر عبدالعلیم (مرحوم) کی ترغیب پر میں نے ۱۹۵۳ء میں بطور لکچرار شعبۂ عربی میں کام کرنا شروع
کیا۔ ابتدا میں میرا تقرر عارضی تھا۔ جب ۱۹۵۴ء میں مستقل جگہ نکلی تو سلیکشن کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا
مرحلہ آیا۔ ایکسپرٹ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) اور ڈاکٹر وحید مرزا (مرحوم) تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ سلیکشن
کمیٹی کا ماحول خصوصاً ایک نوگرفتار کے لیے کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب اس ماحول کو اپنی ...
اور پُرلطف فقروں سے بڑی حد تک خوش گوار بنا دیتے تھے۔ مجھ سے پہلا سوال یہ ہوا کہ آپ کو عربی کی کس
صنف سے زیادہ دلچسپی ہے؟ میں نے عرض کیا "جدید نثر سے" ذاکر صاحب نے فوراً فرمایا: "بھئی یہ تو بڑی نئی
بات ہے۔ آپ کے پہلے جتنے امیدوار آئے سب کی دلچسپی قدیم شاعری سے تھی۔ آپ نے شاعری کو نثر اور قدیم
کو جدید سے بدل دیا۔ جبران خلیل جبران کے بارے میں سوال ہوا کہ وہ کس قسم کی نثر لکھتا تھا۔ میں نے جواب دیا
انشائے لطیف سے ملتی جلتی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ انشائے لطیف اس نے نیاز فتحپوری سے سیکھی ہے۔ ایک
دوسرے مصنف جن کا حال ہی انتقال ہوا تھا، کے بارے میں پوچھا گیا کہ ابھی زندہ ہیں یا وفات ہو گئی۔ میں نے
جواب دینے میں کچھ تامل کیا تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال مناسب نہیں ہے۔ جس مصنف کا مطالعہ کر لیا
تو وہ زندہ جاوید ہو گیا۔ اب اس کے مرنے کا کیا سوال ہے! صرف اتنا ہی نہیں، ذاکر صاحب انٹرویو میں بڑی
دلچسپی لیتے تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ جس مضمون کی کسی اسامی کے لیے سلیکشن کمیٹی ہونے والی ہوتی اس کے

متعلق کتابیں لائبریری سے منگوا کر پڑھتے اور پھر امید واروں سے ایسے سوالات کرتے کہ وہ حیران رہ جاتے۔ فرماتے تھے کہ میں تو اس مضمون میں بالکل جاہل ہوں' اس مسئلے کو اس طرح واضح کیجیے کہ مجھ جیسے LAYMAN کی سمجھ میں آجائے۔

ذاکر صاحب کے مزاج میں خودداری اور تواضع کا بڑا لطیف امتزاج تھا۔ جب باہر سے کوئی مہمان یونیورسٹی میں آتا چاہے اس کی حیثیت ذاکر صاحب سے کمتر ہی کیوں نہ ہوتی، اس کے ساتھ اتنے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کرتے کہ بعض اوقات دیکھنے والوں کو اچھا نہ معلوم ہوتا۔ تاہم کسی بڑے سے بڑے آدمی کا دباؤ ہرگز برداشت نہ فرماتے۔ میرے والد ماجد مولوی حاجی عبید الرحمٰن خاں شیروانی صاحب (جو اس وقت یونیورسٹی کے آنریری ٹریزرر تھے) بیان فرماتے ہیں کہ یو۔جی۔سی کی طرف سے یہ مطالبہ تھا کہ طلبہ کی فیس میں اضافہ کیا جائے۔ ذاکر صاحب جانتے تھے کہ مسلم طلبہ کی عام اقتصادی حالت ایسی نہیں کہ وہ یہ بار برداشت کر سکیں۔ چنانچہ وہ اس کے مخالف تھے۔ جب ایک مرتبہ فائننس کمیٹی کی میٹنگ میں یو۔جی۔سی کے نمائندے نے اس پر زیادہ اصرار کیا، تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "بہت اچھا' فیس بڑھا دیجیے' طلبہ کی طرف سے احتجاج ہوگا تو پھر ان پر گولی چلوائیے گا۔" ذاکر صاحب کے تیور دیکھ کر اور ان کا لب و لہجہ محسوس کر کے یو۔جی۔سی کے نمائندے سناٹے میں آگئے۔ اور کہا "ذاکر صاحب' آپ تو ناراض ہو گئے۔ وہی ہوگا جو آپ فرمائیں گے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ فیس جوں کی توں رہی۔ بعض ایسے حضرات (نام لینا مناسب نہیں) جن کی قومی خدمات تھیں، لیکن حالات کی ناسازگاری نے جنھیں سنکی یا چڑچڑا بنا دیا تھا، ذاکر صاحب کے پاس آکر قیام کرتے۔ ذاکر صاحب ان سے گھبراتے تھے لیکن بظاہر اور حتی الامکان ان کی خاطر تواضع اور رکھ رکھاؤ میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اگر کسی کام میں مصروف نہ ہوتے تو اکثر اوقات مجھ جیسے چھوٹوں کو بھی رخصت کرنے کے لیے کمرے سے باہر آجاتے اور کبھی کبھی تو کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے ان کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر انھیں خاصہ جذباتی تہنیت نامہ لکھا تھا۔ اس کا انھوں نے جو جواب عنایت فرمایا اس کا طرزِ تخاطب اور دستخط کا سابقہ اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ مکتوب الیہ کی شخصیت ان کے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے۔ نہ معلوم اس موقع پر ان کی خدمت میں کتنے تہنیت نامے آئے ہوں گے۔ نہ صرف ان سب کا جواب دینا بلکہ مکتوب الیہ کے منصب اور حیثیت کو پیش نظر رکھنا کتنی بڑی بات ہے۔

●●

۳

ذاکر صاحب علی گڈھ آئے تو یہاں کی فضا آہستہ آہستہ بدلنے لگی۔ طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کا کھویا ہوا
بحال ہونے لگا اور بیرونی حملوں کی شدت میں بھی کمی ہو گئی۔ لیکن ذاکر صاحب کا کام آسان نہیں تھا۔ انھیں ایک طرف
یونیورسٹی کو بدلے ہوئے حالات اور نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنا تھا اور دوسری طرف اس کی ان صالح اور جاندار
روایات کو قائم بھی رکھنا تھا جن کی پیداوار خود ذاکر صاحب تھے اور پھر یہ کام اس طرح انجام دینا تھا کہ ہندوستان
کے عوام اور حکومت دونوں کی نظر میں اس ادارے کا اعتبار اور وقار نہ صرف قائم رہے بلکہ روز افزوں ہو۔ یہ بڑا
اور دیر طلب کام تھا، خود ذاکر صاحب کے بقول یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں تھا، بلکہ پتّا مارنے کا کام تھا اور اسے
ذاکر صاحب نے جس طرح انجام دیا اس سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنھیں ان دنوں ذاکر صاحب کی مسیحا نفسی کو قریب سے
دیکھنے کا موقع ملا۔ ذاکر صاحب نے جہاں اس ادارے کے سیکولر کردار پر زور دیا وہاں یہ بات بھی واضح کی
کہ خود ملک اور حکومت کے سیکولرزم کی سب سے بڑی آزمائش گاہ یہی ادارہ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ملک کا آئندہ
نقشہ جو بنے گا اس کے رنگ و آہنگ کا بڑی حد تک اسی بات پر دار و مدار ہوگا کہ اس ادارے کے ساتھ عوام اور حکومت کا
کیا برتاؤ رہتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ابھی اپنے کام کا آغاز ہی کیا تھا کہ ۱۹۴۹ء کے آخر میں ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا اور
وہ علیل ہو کر کچھ عرصے کے لئے علیگڈھ سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایسا محسوس ہوا گویا مخالفین اس موقع کی
تاک میں تھے اور جیسے ہی ذاکر صاحب نے پیٹھ پھیری یونیورسٹی ایک دفعہ پھر اغیار کے حملوں کی زد میں آگئی۔ پریس اور
پلیٹ فارم سے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جانے لگے اور اس کے اساتذہ اور طلبہ کی ملک کے ساتھ وفاداری پر شبہ ظاہر
ہونے لگا۔ ذاکر صاحب کی علیگڈھ واپسی کے کچھ ہی عرصے کے بعد آچاریہ ونوبا بھاوے یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ ذاکر
صاحب نے انھیں مخاطب کر کے اور گواہ بنا کر جو تقریر فرمائی اس سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا رخ نظروں کے سامنے
آیا جو اب تک کم سے کم علی گڈھ والوں کی نظر سے اوجھل تھا۔ اس وقت تک انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت
کا صرف جمال دیکھا تھا۔ اس کے جلال سے آشنا نہیں تھے۔ اب پہلی دفعہ اس کا جلال اپنی پوری ہیبت اور گھن گرج کے
ساتھ رونما ہوا۔ انھوں نے جن تیوروں کے ساتھ اور جن الفاظ میں مسلم یونیورسٹی کے ناقدین و معاندین کی خبر لی اور
انھیں پھٹکارا وہ صرف ذاکر صاحب ہی کر سکتے تھے، کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ تقریر سن کر اور بعد میں اس
کے بعض حصّے اخباروں میں پڑھ کر لوگوں نے محسوس کیا کہ ذاکر صاحب نے اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا بھلے ہی چھوڑ

دیا ہو لیکن ایک گاندھیائی کے جمال کے ساتھ ایک پٹھان کے جلال کی بھی ان میں کمی نہیں ہے اور موقع آنے پر وہ اس سے بھی پوری طرح کام لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے یونیورسٹی کے مخالفین پر اوس پڑ گئی یا انھیں سانپ سونگھ گیا۔ پھر جب تک ذاکر صاحب علیگڈھ رہے، یونیورسٹی کو اس طرح کے نازیبا حملوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا جب قدامت پسند مسلمانوں کی طرف سے بعض ایسے اصلاحات کی مخالفت ہوئی جن کا نفاذ بدلے ہوئے حالات میں ناگزیر اور یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری تھا۔ ذاکر صاحب نے ان مخالفتوں کو بڑے صبر و سکون سے انگیز فرمایا لیکن اس کا اثر اپنے کام پر نہیں پڑنے دیا بلکہ وہی کرتے رہے جو ان کے نزدیک یونیورسٹی کے لئے مناسب اور مفید تھا۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی میں آزادیٔ خیال کی شمعیں فروزاں کیں۔ کسی تعلیمی ادارے میں فکر و نظر پر پابندیاں عائد کرنا یا پہرے بٹھانا ایسا معیوب فعل ہے جس سے ایک طرف اساتذہ کے ذہنوں میں زنگ لگ جاتا ہے اور دوسری طرف طلبہ کی شخصیت پوری طرح پنپنے اور ابھرنے نہیں پاتی ہے۔ ذاکر صاحب اس راز سے بخوبی واقف تھے اور ہر نقطۂ نظر کو تعلیمی اداروں میں فروغ پانے اور پھیلنے کا بھرپور موقع دینے کے حق میں تھے۔ جن لوگوں کی ذہنی تربیت ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ماحول میں ہوئی تھی ان میں سے اکثر کے لئے یہ طرزِ فکر بالکل نیا اور نامانوس تھا اس لئے انھوں نے ذاکر صاحب سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو خود اپنے اصول و نظریات پر بھروسہ نہیں معلوم ہوتا ہے، ورنہ آپ اس طرح کا احتجاج نہ کرتے۔ میں ہر شخص کو اپنے نقطۂ نظر کی تبلیغ کی آزادی دینا چاہتا ہوں بشرطیکہ اس کا اثر یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی اور نظم و نسق پر ناخوشگوار نہ ہو۔ جو نظریہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اور جاندار ہوگا وہ باقی رہے گا۔ دوسرے سب نظریات خود بخود فنا ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ اپنا کام کیجئے اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ جو لوگ نظریاتی اعتبار سے ذاکر صاحب کے ہم خیال تھے ان کی خواہش تھی کہ ذاکر صاحب ان نظریات کی ترویج میں ان کی اعانت کریں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس سے ہمیشہ پہلوتہی فرمائی اور کہا کہ اس طرح کا کام پھولوں کی سیج نہیں ہے، کانٹوں بھرا راستہ ہے؛ جب آپ اس راہ پر چلے ہیں تو اس کے موانع کا خود اپنی ہمت سے مقابلہ کیجیے، دوسروں کا سہارا تلاش نہ کیجیے۔ شروع میں ان کے اس طرزِ عمل سے ایسے لوگوں کو کسی قدر شکایت پیدا ہوئی لیکن جب انھوں نے ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر سمجھ لیا تو نہ صرف ان کی شکایت رفع ہو گئی، بلکہ وہ اس کی خوبی کے قائل بھی ہو گئے۔

کافی عرصے سے یونیورسٹی میں علمی کام کی اہمیت اور وقعت بہت کم ہو گئی تھی۔ تقررات اور ترقیوں کا انحصار

بھی علمی کام کے مقابلے میں بعض دوسری باتوں پر زیادہ تھا۔ ذاکر صاحب نے اس فضا کو بدلنے کی پوری کو
انھوں نے تحقیقی کام کی اہمیت پر زور دیا اور اساتذہ کو محسوس کرایا کہ ان کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں
تک وہ علمی میدان میں کچھ کر کے نہ دکھائیں۔ اس طرح عرصے کے بعد یونیورسٹی میں علمی کام کی طرف توجہ ہوئی۔
بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کام کم ہوتا تھا اس کی نمائش زیادہ ہوتی تھی لیکن بہرحال لوگوں نے محسوس کیا کہ کچھ
بغیر چارہ نہیں ہے۔ جو لوگ واقعی سنجیدہ علمی کام میں مصروف تھے ذاکر صاحب ان کی بہت عزت اور
کرتے تھے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ان کے کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور ان کی راہ میں جو
ہوتی تھیں انھیں دور کرنے میں معاون ہوتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ایسے نوجوان اساتذہ کو جن سے
اچھی توقعات وابستہ تھیں کثیر تعداد میں مزید کسب علم کے لئے یورپ اور امریکہ کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں
کا انتظام فرمایا۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری سے پہلے یونیورسٹی میں پروفیسروں کی تعداد بہت کم تھی
نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کا کوئی شعبہ پروفیسر سے خالی نہ رہے اور اس کوشش میں انھیں پوری کامیابی
مرکزی وزارت تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پر اُن کا اتنا اثر تھا کہ ان کی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔
ہے کہ آج یونیورسٹی کے تقریباً ہر شعبہ میں پروفیسر موجود ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اسی یونیو
طالب علم رہے ہیں یا یہیں لکچرار کے عہدے سے ترقی کر کے اپنے موجودہ منصب تک پہنچے ہیں۔ بڑی بات یہ تھی
ذاکر صاحب علیگڈھ رہے ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ یونیورسٹی کا سربراہ ایک ایسا آدمی ہے جو خود بھی علمی ذوق رکھ
اور دوسروں کے علمی کام کی قدر کرنا بھی جانتا ہے۔ یہ احساس بجائے خود علمی کام پر آمادہ کرنے میں بہت مدد
تھا۔ "سرسید ڈے" کی ایک تقریب میں جس میں یونیورسٹی کے بعض سینئر اساتذہ موجود تھے، ذاکر صاحب نے انھوں
کر کے فرمایا کہ سید احمد خاں صرف علمی آدمی نہیں تھے وہ عملی انسان بھی تھے اور انھوں نے عمل کے میدان میں بڑ
کارہائے نمایاں انجام دیے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا علمی کام اتنا زیادہ ہے جو کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے
باعث رشک ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ جن کا کام صرف علم کی خدمت ہے انھیں سرسید احمد خاں کے اس پہلو سے سب
لینا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ ان کا علمی سرمایہ سید احمد خاں کے مقابلہ میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

ذاکر صاحب کی یہ بھی قطعی رائے تھی کہ یونیورسٹی کے مسائل خود یونیورسٹی کے اندر طے ہونے چاہئیں، باہر
کسی کو ان میں دخل نہیں دینا چاہیے چاہے وہ کوئی بھی ہو، حکومت یا سیاسی جماعتیں یا اشخاص و افراد۔ وہ
اس اصول پر بہت مضبوطی سے قائم رہے اور بیرونی اثرات انھوں نے بہت کم قبول کئے۔ اگرچہ اُن کے

زِ عمل سے بعض اوقات بعض حلقوں میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ وہ یونیورسٹی میں گروہ بندی کو سخت ناپسند کرتے تھے اور جن لوگوں کے بارے میں انھیں شبہ ہو جاتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کی انتظامی اور تعلیمی مجالس میں گروہ بندی کو فروغ دینا چاہتے ہیں ان سے حتی الامکان ان مجالس کو پاک کر کے رہتے تھے۔ انھوں نے ان مجالس میں اساتذہ کی نمائندگی میں اضافہ کیا اور بیرونی ممبروں کی تعداد کم کی۔ اس کا مقصد جہاں یہ تھا کہ تعلیمی مسائل کے حل میں ان لوگوں کی آواز فیصلہ کن ثابت ہو جنھیں ان مسائل کا عملی تجربہ ہے، وہاں یہ بھی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو یونیورسٹی کو گروہ بندی سے نجات ملے۔ جن لوگوں کو ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں ان مجالس میں شرکت کا موقع ملا ان کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب ہر ممبر کو اپنی بات کہنے کی پوری آزادی دیتے تھے لیکن ان کے تدبّر اور شخصیت کا کمال یہ تھا کہ ان کی موجودگی میں مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکیٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل، غرض ہر مجلس میں ہر فیصلہ ہمیشہ اتفاق رائے سے ہوا اور کبھی رائے شماری کی نوبت نہیں آئی۔ اگر کوئی ممبر ان کی کسی رائے سے اختلاف یا کسی فیصلے پر اعتراض کرتا تھا تو وہ فرماتے تھے کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن صرف اعتراض کافی نہیں ہے بلکہ اس مسئلے کا حل تجویز کیجیے۔ اور پھر وہ ممبر یا تو کوئی ایسا حل تجویز کرتا تھا جو ان کے اور دوسرے ممبروں کے لیے قابل قبول ہوتا تھا ورنہ خود ان کی رائے مان لیتا تھا اور اکثر ان ہی کی رائے مانی جاتی تھی کیونکہ وہ سب سے وقیع ہوتی تھی۔

صحتمند دماغ کے لیے صرف صحت مند جسم ہی نہیں، صحت مند ماحول بھی انتہائی ضروری ہے۔ ایسے ماحول کی علی گڑھ میں بڑی کمی تھی۔ یہاں ہر طرف خاک اڑتی تھی اور بالخصوص گرمیوں کے موسم میں یونیورسٹی میں گھروں یا کمروں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ سبزے، پھول، پودوں اور درختوں کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ بلکہ عام خیال یہ تھا کہ یونیورسٹی کی زمین روئیدگی کے لیے سازگار نہیں ہے۔ ذاکر صاحب بہت باذوق آدمی تھے اور ان کی جمالیاتی حس بہت قوی تھی۔ انھیں خاص طور سے پھولوں سے غیر معمولی شغف تھا۔ انھوں نے اپنے زمانۂ وائس چانسلری میں جہاں اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی بالیدگی کا انتظام فرمایا، وہاں ان کے لیے خوش گوار اور صحت مند ماحول مہیا کرنے میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تھوڑی ہی مدت میں یونیورسٹی میں ہر طرف سبزہ لہلہانے لگا۔ پھول کھلنے لگے اور شاداب اور بلند بالا درخت سایہ فگن ہو گئے۔ ان کی دلچسپی اور ہمت افزائی کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی ہوا۔ یونیورسٹی کی عمارتوں اور میدانوں کے علاوہ ذاتی مکان بھی پھولوں سے ڈھک گئے۔ جن لوگوں نے ۲۰، ۲۲ سال پہلے علیگڑھ دیکھا تھا وہ آج اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب کے یہاں تشریف لانے کے بعد یونیورسٹی کی ظاہری شکل و صورت اور اس کے ماحول میں کتنی زبردست اور خوشگوار تبدیلی ہوئی۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے طلبہ کی روحانی نشوونما

اوران کے خالی وقت کو بامعرف بنانے کی خاطر بعض ثقافتی مشاغل کی طرح ڈالی اور اس طرح طلبہ کا جو وقت بے کار گپ یا ہنگاموں میں گزرتا تھا اب ایسے کاموں میں صرف ہونے لگا جو ایک مہذب شخصیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اہم یہ ہے کہ ذاکر صاحب کسی تعلیمی ادارے میں طلبہ کی بنیادی اہمیت کے قائل تھے اور ایسی تمام تدابیر اختیار کرتے تھے جو انھیں ملک کا مفید اور کارآمد شہری بنا سکیں۔ وہ ایسے ڈسپلن کے حامی تھے جو خود طلبہ کے اندر سے پیدا ہو اور نہ کہ اُن پر باہر سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اُن کی وائس چانسلری کے دور میں یونیورسٹی میں ایسے کئی مواقع آئے جب تدبر سے کام نہ لیا جاتا تو کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کے حُسنِ انتظام نے اس کی نوبت نہ آنے دی اور خود طلبہ کے تعاون سے سارے مسائل بحسن و خوبی حل ہو گئے۔ مذہب کی طرف بھی ذاکر صاحب کا یہی رویہ تھا۔ وہ بنیادی طور پر خالص مذہبی آدمی تھے۔ انکی سحر خیزی اور قرآن کے ساتھ گہری وابستگی عام طور پر معلوم ہے لیکن وہ ڈنڈے کے زور سے دوسروں پر مذہبی افکار و اعمال مسلط کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبہ جرمانے کے ڈر سے نماز پڑھیں، یا دوپہر کو کھانا نہ ملنے کے خوف سے روزہ رکھیں۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جب اس طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں تو لوگ ان پابندیوں سے بچنے کے لئے چور دروازے بھی تلاش کر لیتے ہیں اور اس طرح ان میں مذہبی افکار و اعمال کا احترام ہونے کے بجائے اُلٹی منافقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بجائے وہ چاہتے تھے کہ نماز، روزہ اور دوسرے مذہبی اشغال کا داعیہ خود طلبہ کے اندر سے پیدا ہو اور وہ اُنھیں ذوق و شوق سے انجام دیں۔

ذاکر صاحب جتنے باذوق تھے اتنے ہی عالی حوصلہ بھی تھے۔ چھوٹی بات اور چھوٹا خیال ان کے ذہن میں کبھی نہیں آتا تھا اور انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی تھی۔ جو لوگ تقسیم ہند سے قبل یونیورسٹی میں برسر اقتدار تھے ان کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ سرسید کے مشن کے حامل اور ان کے پیرو تھے۔ اس کے بخلاف ذاکر صاحب علی گڑھ تحریک سے بغاوت کر کے عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی وائس چانسلری سے پہلے یونیورسٹی میں "سرسید ڈے" محض ایک رسم کے طور پر منایا جاتا تھا اور جذبے روح سے خالی ہو کر رہ گیا تھا، انھوں نے اس میں روح پیدا کی اور اسے بانی درس گاہ کے شایان شان منانے کا اہتمام فرمایا۔ یونیورسٹی لائبریری میں سرسید کی تصانیف اور ان سے متعلق لٹریچر کی نمائش کا خیال سب سے پہلے ذاکر صاحب ہی کے ذہن میں آیا اور اس نے ان ہی کے اشارے پر عملی صورت اختیار کی۔ رات کو سرسید ہال کے لان پر یونیورسٹی کے سب طلبہ، اساتذہ اور مہمانوں کا ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا، ایسا شاندار اور ولولہ انگیز منظر ہوتا ہے جس

مثال کسی اور تعلیمی ادارے میں ملنا محال ہے۔ یہ روایت ذاکر صاحب ہی نے قائم کی ہے۔ اس ٹور میں، ملک کی بعض مقتدر ہستیاں بھی شرکت کرتی رہی ہیں اور اس کے بارے میں انھوں نے ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں ملک اور بیرون ملک کے متعدد معزز مہمان علیگڈھ تشریف لائے۔ جن میں شاہ سعود اور رضا شاہ پہلوی بھی شامل تھے۔ ذاکر صاحب نے ان کی پذیرائی جس حوصلے اور فراخدلی سے فرمائی اور جیسی شاندار تقریبات منعقد کیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ایسے موقعوں پر وہ روپے پیسے کا خیال بالکل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی ساری توجہ یونیورسٹی کی نیک نامی پر مرکوز رہتی تھی۔ مسز روزویلٹ جب ہندوستان کے دورے پر آئی تھیں تو علیگڈھ بھی تشریف لائی تھیں۔ یہاں سے واپس جاکر انھوں نے اپنے سفر کے تاثرات پر کتاب لکھی تو اس میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے وائس چانسلر (ذاکر صاحب) کا ذکر خاص طور سے کیا۔

ذاکر صاحب کی ذاتی خوبیوں میں میرے نزدیک اوّلیت ان کے جذبۂ ایثار کو حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی جوانی جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں بسر کردی وہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو دوسرے سب کارناموں پر بھاری ہے۔ جب وہ علی گڈھ تشریف لائے تو ان کی عمر ۵۰ سال سے متجاوز تھی اور ۲۲ سال تک بہت قلیل معاوضے پر جامعہ کی سربراہی کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ یہاں آکر انھیں فراغت حاصل ہوئی اور آرام ملا، لیکن ان کی سادگی، جفاکشی اور اخلاق میں فرق نہیں آیا۔ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ نادار طلبہ کی اعانت میں صرف کردیتے تھے۔ جو طلبا ان سے اپنی ذاتی ضرورتوں اور مشکلات کے سلسلے میں ملتے تھے انھیں وہ پورا وقت دیتے تھے اور حتی الامکان ان کی مشکلات حل کرنے کی کوشش فرماتے تھے اور اگر حل نہیں کرسکتے تھے تو کم سے کم انھیں مفید مشوروں سے ضرور نوازتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

ان کی بلند اخلاقی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جب ان کے چھوٹے بھی ان سے ملنے کے لئے جاتے تھے، تو وہ انھیں چھوڑنے کے لئے کمرے سے باہر تشریف لاتے تھے اور کبھی کبھی تو کافی دیر تک کوٹھی کے احاطے میں ٹہل ٹہل کر ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ انھیں حفظِ مراتب کا بھی بہت خیال تھا اور اپنے سے بڑوں کے ساتھ وہ جس انکسار اور نرمی سے پیش آتے تھے موجودہ دَور میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر بھی ہوتا ہے۔ جب ذاکر صاحب وائس چانسلر ہوکر علی گڈھ تشریف لائے تو اس حیثیت سے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے انھیں استقبالیہ دیا گیا۔ اس وقت نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم و مغفور کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے۔ ذاکر صاحب اور نواب صاحب کی نشست تخت پر تھی۔ جلسے کے بعد نواب صاحب تخت سے

اس طرف نہیں اُترے جہاں ان کا جوتا رکھا ہوا تھا، بلکہ دوسری جانب اُترے۔ ذاکر صاحب نے خاموشی سے آگے بڑھ کر
نواب صاحب کا جوتا اٹھایا اور لاکر ان کے قریب رکھ دیا۔ نواب صاحب برابر منع کرتے رہے کہ آپ کیا کر رہے
ذاکر صاحب کے نزدیک گویا یہ کوئی خاص بات ہی نہ تھی۔ انھوں نے صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔ اس واقعہ کا
جلسہ پر غیر معمولی اثر ہوا اور سب سے زیادہ متاثر خود نواب صاحب مرحوم ہوئے۔ اسی طرح یونیورسٹی کے سا
ملا طاہر سیف الدین مرحوم کے ساتھ بھی ذاکر صاحب کا برتاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، الفاظ میں اس کا
نہیں ہے۔ ذاکر صاحب کے کردار میں نرمی اور صلابت کا بہت خوشگوار امتزاج تھا۔ ایک طرف ان کے اخلاق
وہ کیفیت تھی جو اوپر بیان کی گئی اور دوسری طرف یہ بھی واقعہ تھا کہ وہ کسی کو حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتے
بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کی موجودگی میں کسی کے ذہن میں حد سے تجاوز کرنے کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔
نسل کے اکثر بزرگوں کی مانند ذاکر صاحب میں بھی مروت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اور ان کی اس مروت سے
اوقات بعض لوگوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص ذاکر صاحب کو دھوکا نہیں
سکتا تھا۔ وہ ہر ایک کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے تاہم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنی مر
سے مجبور ہو کر ایسے لوگوں کی کوتاہیوں سے درگزر فرماتے تھے جس سے دوسرے لوگ یہ سمجھتے تھے (اور
خود وہ لوگ بھی سمجھتے ہوں) کہ انھوں نے ذاکر صاحب کو دھوکا دیکر فائدہ اٹھا لیا ہے۔

ذاکر صاحب کی ذہانت اور لیاقت تسلیم شدہ تھی۔ انھیں بہت سی کانفرنسوں کا افتتاح اور
اجتماعات میں تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ وہ جس موضوع پر بولتے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ ان کا خاص موضوع
اسی طرح مختلف شعبوں میں جب اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا اور ذاکر صاحب ان سے انٹرویو کرتے تھے تو ان کے مضمون
کے بارے میں غیر معمولی اور حیران کن واقفیت کا ثبوت دیتے تھے۔ مخصوص موقعوں پر مثلاً یوم آزادی اور یوم
پر جب وہ عام اجتماعات کو خطاب فرماتے تھے تو نظریاتی بحثوں میں الجھنے کے بجائے حاضرین کو ان کے فرائض
تھے اور فرماتے تھے کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کی اصلاح کرلیں، بڑے بڑے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ
فرماتے تھے کہ جو شخص جس کام میں مشغول ہے، اسے بنیادی اہمیت کا کام سمجھ کر انجام دینا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے
طرح وہ ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ان کا تقریر کرنے کا ایک خاص اسٹائل تھا جو ان کے ساتھ
تھا اس میں گھن گرج اور خطابت کے بجائے خلوص، متانت، نرمی اور شیرینی کی فراوانی ہوتی تھی۔ وہ
اور لیاقت کے اظہار سے مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنی بات دوسروں کے دلوں میں

جاتے تھے اور ان کا بے پایاں خلوص اس معاملے میں ان کا معاون ہوتا تھا۔ ان کی تقریر کی طرح ان کی تحریر بھی بڑی دلچسپ اور دل نشیں ہوتی تھی۔ بالخصوص ان کے خطبات میں ادب اور خطابت کا ایسا حسین اور دل آویز امتزاج ہوتا تھا جو کسی دوسرے کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں ذاکر صاحب سے بہتر خطبات کسی اور نے نہیں لکھے ہیں۔

۱۹۵۶ء کے آخر میں ذاکر صاحب علی گڑھ سے تشریف لے گئے۔ یہاں سے جاکر وہ ملک میں مختلف ممتاز عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ وہ جہاں گئے اور جس منصب پر بھی رہے نہ صرف نیک نام اور سربلند رہے، بلکہ اپنی شخصیت اور لیاقت سے اس منصب کو چار چاند بھی لگائے۔ ان کے کردار کے جو روشن پہلو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مسلم یونیورسٹی میں نمایاں ہوئے تھے خدمت کا وسیع تر میدان ملنے پر ان کی تابناکی میں مزید اضافہ ہوا۔ پٹنہ کا راج بھون ہو یا پارلیمنٹ کا ایوان بالا یا نئی دہلی کا راشٹرپتی بھون، ہر جگہ ان کے کردار کا نور ضو افگن اور ضیا بار رہا۔ جب ۱۹۶۷ء میں جمہوریہ ہند کی صدارت کے منصب جلیل پر ان کا انتخاب ہوا تو یہ ایک ایسی زندگی کا نقطۂ عروج تھا جو ہمیشہ اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف رہی تھی۔ اس انتخاب کی اہمیت کو اس وقت کسی نے سمجھا تھا اور کسی نے نہیں سمجھا تھا کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے ذاکر صاحب کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانی چاہی تھیں لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کا جادو اور کردار کی عظمت یہ تھی کہ جب تقریباً دو سال کے بعد انھوں نے اس دنیا کو چھوڑا تو ہر ذی شعور ہندوستانی اس بات کا معترف تھا کہ اس منصب کے لئے ہندوستان کو ذاکر صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں مل سکتا تھا۔ اگر ایک طرف مسز اندرا گاندھی نے، جو ان کے انتخاب کی سب سے زیادہ ذمہ دار تھیں، یہ کہکر بہت سی غلط فہمیاں رفع کر دیں کہ ذاکر صاحب کا عہدۂ صدارت پر انتخاب اس لئے نہیں ہوا تھا کہ وہ مسلمان تھے، بلکہ اس لئے ہوا تھا کہ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے تو دوسری طرف شری راجگوپال اچاری نے بھی، جو معمر رہنما اور حزب اختلاف کے ایک مقتدر نمائندے تھے اعتراف فرمایا کہ اس وقت ہندوستان میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے زیادہ لائق شہری کوئی اور نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کا عہدۂ صدارت پر انتخاب بلا شبہ ان کی اہلیت و لیاقت کی بنا پر ہوا تھا لیکن اس سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں کسی شہری کا مذہب اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا ہے اور اس طرح اس نے ہماری ریاست کے سیکولر کردار پر مُہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ ذاکر صاحب نے اپنے مختصر عہد صدارت میں اندرون ملک عوامی زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کئے اور بیرونِ ملک ہندوستان کے وقار اور بھرم میں اضافہ کیا۔ ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہو کر بھی ان کے انکسار اور سادگی میں کمی

نہیں آئی بلکہ شاخ ثمردار کی مانند وہ جتنے اونچے ہوتے گئے اتنے ہی جھکتے گئے ۔ جس شخص سے ان کا جو
تھا وہ آخر وقت تک اسی طرح قائم رہا۔ جب وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تو قدرتی طور پر ملک کے گوشے
سے ان کے نام ہزاروں تہنیت نامے آئے ہوں گے ۔ جن لوگوں سے وہ تھوڑے سے بھی واقف تھے انھیں
دستخط سے جواب مرحمت فرمایا اور اس میں مکتوب الیہ کے ساتھ اپنے تعلق کا پورا لحاظ رکھا ۔ کہنے کو یہ معمو
لیکن اس پر عمل جتنا دشوار ہے اس کا اندازہ ہر شخص بہ آسانی کر سکتا ہے ۔ ذاکر صاحب کو جو مناصب و
حاصل ہوئے ہمیشہ بلا طلب حاصل ہوئے ۔ وہ عہدوں کے پیچھے کبھی نہیں دوڑے ، عہدوں نے انھیں
کیا ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ساکھ اور وقار میں آخر تک اضافہ ہی ہوتا رہا ، کمی کبھی نہیں ہوئی ورنہ حصول
کی کشمکش میں ہم نے کتنی شہرتوں کو داغدار اور کتنی بلندیوں کو پستیوں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے اور برابر دیکھتے

اب جب کہ ذاکر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں ۔ ان کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں
اس نقصانِ عظیم کا اندازہ ہو رہا ہے جو ان کی وفات سے ہمیں پہنچا ہے ۔ بلاشبہ یہ ملک کا بہت بڑا نقصا
لیکن بالخصوص مسلمانوں کی صف میں تو ایسا خلا ہو گیا ہے جو نہ معلوم اب کب پُر ہو گا اور کبھی پُر ہو گا بھی
انھیں راشٹرپتی بھون میں دیکھ کر خود اپنی ذات پر اعتماد و افتخار پیدا ہوتا تھا اور اس ملک میں مسلمانو
روشن مستقبل کے امکانات واضح ہوتے تھے ۔ لیکن اب ان کے اٹھ جانے سے یہ کیفیت ہے کہ اتنی
سناٹا ، آواز نہیں آتی ۔ ایسا ہی سناٹا ۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وفات کے بعد بھی محسوس
تھا ۔ ذاکر صاحب نے مولاناؒ کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا ایک حد تک پُر کر دیا تھا ۔ اب دیکھنا ہے
قدرت ذاکر صاحب کی کمی کب اور کس طرح پوری کرتی ہے ۔

اشتیاق محمّد خاں

• **جناب اشتیاق محمد خاں :** (پ ۱۹۳۱ء، قائم گنج، فرخ آباد)، ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بی۔ اے اور بی۔ ایڈ، تقریباً پانچ سال تک منٹو سرکل علیگڑھ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد بمبئی چلے گئے، جہاں یونین بینک آف انڈیا میں کنٹریکٹ افیسر ہیں اور جعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل کے وارڈن۔

موسیقی بالخصوص FOLK SONGS میں خاصا درک حاصل ہے۔ مجاز کی نظم "نذر علیگڑھ" کی مخصوص دھن کے خالق ہیں۔ اسی دھن کی تخلیق کے بعد علیگڑھ نے اس نظم کو بطور ترانہ اپنا لیا ہے۔ گزشتہ سال "سہاگ گیت" کے نام سے بھی آپ نے ایک لمبا ریکارڈ تیار کیا تھا۔ یہ کافی مقبول ہوا۔ فلم "امراؤ جان" میں آپ نے نواب کا رول ادا کیا ہے اور آیندہ بھی کئی فلموں میں آنے والے ہیں۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی پر آپ نے ایک ڈاکومنٹری فلم تیار کرلی ہے۔ آپ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی ہیں۔

••

ذاکر صاحب سے میرا تعلق تقریباً ۲۲ سال تک رہا۔ جامعہ ملیہ کی طالب علمانہ زندگی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے بعد ذاکر صاحب بہار کے گورنر مقرر کئے گئے پھر نائب صدر اور پھر صدر جمہوریہ کے عہدوں پر فائز ہے۔ یہ مدت تقریباً ۱۰ سال کی ہوتی ہے۔ اس میں میرا اور ان کا تعلق خط و کتابت کے ذریعہ برابر قائم رہا۔

ذاکر صاحب کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول جامعہ ملیہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک، یعنی ۳۰ سالہ تعلیمی دور، دوم سرکاری عہدوں (گورنر سے صدر جمہوریہ تک) کا دور۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ ذاکر صاحب کے پہلے دور کی شخصیت کے نقوش اتنے موثر، مثبت، عملی بھرپور اور گہرے ہیں کہ دوسرا دور ماند پڑ جاتا ہے۔

جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب شیخ الجامعہ یا وائس چانسلر تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے ساتھی استادوں کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ان سے کسی لحاظ سے برتر یا بڑے ہیں۔

جامعہ کے پرائمری اسکول میں جب جاتے تو بچوں میں بچہ بن جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلتے، کہانیاں سناتے، شام کے وقت اکثر ثانوی اسکول کے بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ خود کم بولتے لیکن بچوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کے لئے اُکساتے۔

(ایک اچھے معلم یا ٹیچر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کی بجائے اپنے عمل سے بچوں کی تعلیم و تربیت کرے)۔

جامعہ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ذاکر صاحب نے کبھی کوئی تقریر نہیں کی اور نہ نصیحت۔ ان کا روز مرّہ کا ایک معمول یہ تھا کہ اسکول کے احاطے میں آتے ہی جہاں کوئی کاغذ کا ٹکڑا یا تنکا پڑا ہوا دیکھا، اُس کو اٹھا کر شیروانی کی جیب میں رکھ لیتے تھے۔ جب جیب بھر جاتی تھی تو اس کو کوڑے دان میں پھینک دیتے تھے۔ نتیجہ تمام طلبا میں ایک ایسی اسپرٹ پیدا ہو گئی تھی کہ جسے بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا نظر آیا، اُس نے دوڑ کر اسے اٹھایا اور کوڑے دان میں پھینک دیا۔

آج تک یہ خادم بھی اس کا عادی ہے کہ ہوسٹل میں کہیں بھی کوئی کا غذا کا ٹکڑا نظر آیا اور فور
اس کو کوڑے دان کی نذر کر دیا۔

عملی تربیت کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ فرمایئے:

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ کیا غلہ کیا ترکاری ہر چیز جنگ
ہو چکی تھی۔ ڈائننگ ہال میں کھانا بھی ناپ تول کر ملتا تھا۔ بچت اور کفایت کی زبانی تلقین ونصیحت
کے بجائے قرآن کی یہ آیت ترجمہ کے ساتھ ایک خوبصورت فریم میں جلی حروف میں لکھ کر ڈائننگ ہال
ایک دیوار پر آویزاں کر دی گئی تھی: 'کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا' کھاؤ پیو لیکن اسراف

ایک دوپہر کے کھانے کے وقت ذاکر صاحب ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ سب طلبا کھانا کھانے
معروف تھے۔ ذاکر صاحب ہر ٹیبل پر جاتے اور سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے۔ ساتھ ساتھ کھانے
کی کوالٹی کے متعلق بھی پوچھتے۔ اچانک دیکھا کہ ایک ٹیبل کے پاس ذاکر صاحب رُک گئے اور ہڈی پلیٹ
کو بغور دیکھنے لگے۔ ان کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، وہ ذرا جھکے اور ہڈی پلیٹ میں پڑے ہوئے ایک
آلو کو اُٹھا لیا۔ وہیں پانی سے دھویا اور کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیا۔ سب لڑکے حیرت سے ذاکر صاحب
کو دیکھ رہے تھے۔ ذاکر صاحب طلبا کے حیرت کے احساس کو بھانپ گئے۔ کہنے لگے "میاں! میرا منہ
کیوں تک رہے ہو؟ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ دانہ دانہ پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔
ہمارے ملک میں لاکھوں آدمیوں کو ایک وقت کی روٹی میسر نہیں" پھر مسکرا کر کہنے لگے "یہ ادھ کچا
آپ ہی میں سے کسی نے ہڈی پلیٹ میں پھینک دیا تھا، میں نے جب غور سے دیکھا تو اپنا نام لکھا
اس لئے اُٹھا کر کھا لیا"۔ تمام طلبا، کو جو اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے، ایسا محسوس
ہوا کہ گویا کسی نے ان سب کے چہرے پر بھرپور تھپڑ مارا ہو۔ اس دن کے بعد سے کھانے کی ٹیبل پر روٹی کے
ٹکڑے یا ادھ کچے آلو پھر کبھی ہڈی پلیٹ میں نہ دیکھے گئے۔

تو یہ تھا جناب ذاکر صاحب کا طرزِ تربیت۔ ان کی تربیت کا ایک ایک عمل ہزار وعظ ونصیحت
پر بھاری تھا۔

جامعہ ملیہ کے دَور کا ایک اور ناقابلِ فراموش واقعہ میرے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہے:
نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی سلور جُبلی منائی گئی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کا دور

کی تاریخ میں بڑا ہی ہنگامہ خیز دور تھا مسلم لیگ اپنے شباب پر تھی۔ ہر طرف قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ پاکستان بنانے کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ کانگریس ملک کی تقسیم کے خلاف تھی۔ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے موقف کے لئے زیادہ سے زیادہ تائید اور حمایت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔ یوں سمجھیے کہ دو زبردست پہلوانوں کے درمیان ٹکراؤ تھا۔ مصالحت کی تمام راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں جماعتوں کے قائدین کا کسی ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کا کمال کہیے کہ اسی ہنگامہ خیز دور میں جامعہ کی سلور جبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو یکجا کر دیا۔

میں اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے جب جامعہ کے جشنِ سیمیں کے موقع پر ایک ہی پنڈال میں ایک اسٹیج پر قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں تھے اور ان کے مقابل دوسری طرف صوفوں پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو رونق افروز تھے۔

اسی موقع پر ذاکر صاحب نے جامعہ کی ۲۵ سالہ روداد پیش کرتے ہوئے جو تاریخی خطبہ نذرِ سامعین کیا تھا وہ طلائی حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔ اس خطبہ کا وہ حصہ جس میں سیاست و تعلیم کا موازنہ کیا گیا تھا، آج تک میری ڈائری میں محفوظ ہے:

> "سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیرے دھیرے بہنے والا میدانی دریا ہے، جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے سیاست ان کی تنظیم اور حفاظت کرتی ہے۔ اس لئے وہ مخدوم اور یہ خادم۔ سیاست شہرت چاہتی ہے اور تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ تعلیم کا پہلا منصوبہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے، رہرو کا رُخ متعین کرتی ہے۔"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ۱۹۴۶ء کا دور بڑا ہی ہنگامہ و قیامت خیز تھا۔ ملک میں بالخصوص شمالی حصہ میں فسادات کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ اسی خطبے میں آخر میں ذاکر صاحب نے بڑے بیباکانہ انداز میں قومی رہنماؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا: "آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں

آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں :

"آج ہمارے ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، آج ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ آج نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنواریں گے؟ بربریت کے اس دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچائیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی نرم ہوتے ہم جو اپنے کاموں کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بربریت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی پوری طرح محفوظ نہیں۔

"شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہوچکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے۔

"خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھے اور آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اُسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجئے۔"

ذاکر صاحب کو شاید ہی کسی نے کبھی غصہ میں دیکھا ہو، بجز ایک موقع کے جب وہ علی گڑھ میں وائس چانسلر تھے۔ قصہ یوں ہے کہ: پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے انتقال پر کچھ فرقہ پرست اخباروں نے یہ خبر اخبار میں اُڑا دی کہ لیاقت علی خاں کی موت پر یونیورسٹی میں سائرن بجائے گئے اور دو دن یونیورسٹی کو بند رکھا گیا۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔ سارے ملک کے اخباروں میں چرچے ہونے لگے۔ طلبا جا کر ذاکر صاحب سے ملے اور اس جھوٹے پروپگنڈے کے خلاف اخبارات میں تردیدی بیان کی سفارش کی۔ لیکن ذاکر صاحب نے ہنس کر ٹال دیا کہ "کتے بھونکتے ہیں تو بھونکنے دو۔ ہم کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔" لیکن طلبا اور اساتذہ ذاکر صاحب کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے اور سمجھنے لگے کہ ذاکر صاحب تو حکومت کے آدمی ہیں حکومت سے ڈرتے ہیں اور فرقہ پرستوں سے بھی۔

بہرحال اتفاق سے اسی عرصہ میں علی گڑھ کے آس پاس فسادات ہو گئے۔ امن وامان قائم کرنے کے لئے ونوبا بھاوے جی کو علی گڑھ آنا پڑا۔ ذاکر صاحب نے بالخصوص ونوبا بھاوے جی کو یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ اسٹریچی ہال میں ونوبا بھاوے جی کا استقبال کیا گیا۔ اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جو فرقہ پرستوں کو لتاڑا ہے بس نہ پوچھئے۔

اُنھوں نے کہا "... ونوبا بھاوے جی، تنگ نظر، گندہ ذہن اخبار والوں نے ہمارے خلاف کچھ عرصہ سے ایک مہم شروع کر رکھی ہے ـــــ" پھر غصّہ سے بھرپور بلند آواز میں کہا:

"کون بھڑوا کہتا ہے کہ ہم ملک کے وفادار نہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری وفاداری کا ثبوت ہم سے مانگے۔"

غرض کہ اس تقریر سے طلبا کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ذاکر صاحب کی محبت میں بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

ذاکر صاحب کو دین سے بھی لگاؤ تھا۔ جامعہ کی زندگی میں جب کبھی وقت ملتا وہ نظام الدین ضرور جاتے اور مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے جلسوں میں شرکت کرتے۔ مذہبی ہونے کے باوجود ان میں کٹّر ملائیت کبھی نہیں آئی۔ ان کو فنون لطیفہ، بالخصوص پینٹنگ، شعر و شاعری اور موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ تعلیم کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ طلبا کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔

ذاکر صاحب سے پہلے مسلم یونیورسٹی میں کوئی کلچرل شام کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان ہی کے زمانہ میں طلبا نے یوتھ فیسٹول کے مقابلوں (دہلی) میں حصّہ لینا شروع کیا۔ ڈرامے اور موسیقی کے مقابلوں میں طلبا نے انعامات بھی حاصل کئے۔

ہمارے ملک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہے جس کا اپنا ایک ترانہ ہے۔ یہ ترانہ مجازؔ کی نظم "نذر علی گڑھ" ہے، جس کو مجازؔ نے اپنے زمانۂ طالب علمی ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔ ذاکر صاحب نہ ہوتے تو یہ نظم ترانہ نہ بن سکتی۔

یہ بات ۱۹۵۴ء کی ہے، جب میں بی۔ ایڈ کا طالب علم تھا۔ یونین کا الیکشن ہو چکا تھا۔ مسند نشینی کی رسم باقی تھی۔ میں ذاکر صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ میں نے مجازؔ کی نظم (نذر علی گڑھ) کی دُھن تیار کی ہے اور اس کو یونین کے جلسۂ مسند نشینی کے موقع پر کورس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا "آپ یونین کے صدر کے پاس جائیے۔ اس لئے کہ جلسہ یونین کا ہے۔ یونیورسٹی کا نہیں۔

میں یونین کے صدر کے پاس پہنچا۔ وہ حضرت اپنے کٹر سیاسی پن اور ملائیت کے لئے مشہور تھے۔ مجاز کا نام سنتے ہی چراغ پا ہو گئے۔ فرمانے لگے "مجاز ترقی پسند ہے اور دہریہ بھی۔ جب تک میں اس کرسی پر ہوں، کسی دہریہ کو یونین کے پلیٹ فارم پر نہیں آنے دیا جائے گا۔

میں خاموشی سے اُٹھا اور دوبارہ ذاکر صاحب کے پاس آیا اور یونین کے صدر کے انکار سے آگاہ کیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا "خیر کوئی بات نہیں، یونین والے آپ کو وہاں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو آپ سرسید ڈے میں پیش کیجیے۔ یہ یونیورسٹی کا فنکشن ہے۔"

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کا وہ "سرسید ڈے" تاریخی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہے گا جب میں نے چار ساتھیوں کے ساتھ کورس کی شکل میں مجاز کی نظم "نذرِ علی گڑھ" کو پہلی مرتبہ علی گڑھ کا ترانہ کہ کر اسٹریچی ہال میں پیش کیا، تو اُس کی دُھن اور موسیقی سے ہزاروں کی تعداد میں طلبا اور اساتذہ سب اتنے متاثر اور محظوظ ہوئے کہ "برسے گا، برسے گا، برسے گا" کے اختتام پر صدائے تحسین اور تالیوں سے دیر تک اسٹریچی ہال گونجتا رہا۔

ذاکر صاحب نے اُٹھ کر میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: "آپ نے ترانہ کی صورت میں مادرِ درسگاہ کو یہ بہت بڑا اور اچھا تحفہ دیا ہے، جو ناقابلِ فراموش ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ تندرست اور خوش وخرم رکھے۔"

●●

امانُ اللہ خاں شیروانی

• **امان اللہ خاں شیروانی صاحب:** پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور برمنگھم یونیورسٹی (برطانیا) سے تعلیم یافتہ، معاشیات اور سیاسیات میں ایم۔ اے اور بی۔ ایڈ۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۹ء اسلامیہ کالج سہارنپور میں معاشیات کے لکچرر رہے۔ ۱۹۵۹ء سے اسلامیہ کالج اٹاوا کے پرنسپل ہیں۔ آپ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی ایگزیکٹیو کاؤنسل کے ممبر بھی ہیں۔ اسلامیہ کالج میں ایک تعلیمی پروجکٹ کے لیے حکومت اتر پردیش کی طرف سے انعام یافتہ۔ اتر پردیش کے اقلیتی اداروں میں ایک بہترین پرنسپل کی حیثیت سے بھی۔ آپ بھارت سیوا ٹرسٹ دہلی کی طرف سے انعام یافتہ ہیں۔ اردو اور ہندی رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں "ہندوستان میں ملٹی پرپز اسکول" اور ہندی میں جنرل نالج پر ایک کتاب آپ کی قابل قدر تحریریں ہیں۔ پرائمری کلاسوں کے لیے بھی آپ نے انگریزی کی ایک کتاب ترتیب دی ہے۔

••

کہا کس نے مسلمانوں کا ملجا ہے نہ ماوی ہے

خدا رکھے ہمارا ابھی علی گڑھ ہے اٹاوا ہے   (اکبر الہ آبادی)

اسلامیہ کالج اٹاوا جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے شمالی ہندوستان کا ایک یم اور معروف ادارہ ہے۔ علیگڑھ ام، او کالج کے ساتھ ہی اس کی بھی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کے بانی خان بہادر ڈاکٹر لوی بشیر الدین صاحب مرحوم و مغفور سر سید کے رفیق کاروں میں سے ایک تھے۔ مرحوم نے اٹاوا میں ان ہی مقاصد سامنے رکھ کر اس کالج کی بنیاد رکھی تھی جو سر سید کے سامنے علیگڑھ ایم۔ او کالج کے لیے تھے۔ اسکول کی ترقی اور شہرت اس عظیم شخصیت کا سب سے بڑا ہاتھ تھا وہ تھے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم۔ اگر خان بہادر صاحب کو کالج کا م کہا جا سکتا ہے تو سید الطاف حسین اس جسم کی روح تھے۔ وہ پھول بن کے مہکے اور ادارہ کی شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا شمار اُن گنے چنے لوگوں میں ہے جن پر قدرت نے سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور بانت، دوستی اور قیادت کی غیر صفات ارزاں فرمائی تھیں۔ یوں تو مرحوم ہزار ہا خوبیوں کے انسان تھے۔ لیکن ان شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا جذبۂ ایثار تھا۔ ہم بس اتنا کہ جس شخص نے ایک معمولی اور مقررہ تنخواہ پر کالج خدمت کی اور اس تنخواہ کا بھی زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے شاگردوں پر خرچ کیا، اس کے جذبۂ ایثار کا کیا کہنا۔ مرحوم یہی جذبۂ ایثار اپنے ہونہار شاگردوں کو بھی عطا کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم، ڈاکٹر سید محمود مرحوم اور ان بہت سے دوسرے شاگرد اس کی ایسی تابندہ مثالیں ہیں جو ہندوستان کی قومی اور تعلیمی تحریکوں کی تاریخ میں یاں حیثیت رکھتی ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مجسم اخلاق تھے۔ شرافت کا معیار تھے۔ انہوں نے اپنا عیش و آرام اور اپنا کل اثاثہ سروں کی بھلائی اور مستحق لوگوں کی امداد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھیں کالج اور طالب علموں سے اتنا گہرا لگاؤ تھا ان کی ذات ان دونوں میں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ، اپنی زندگی، اپنا روپیہ اسکول اور اس کے لب علموں پر قربان کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب وہ ریٹائر ہوئے تو کچھ رقم جمع کر کے ان کی خدمات عالیہ کے اعتراف

میں ایک تھیلی کی شکل میں ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اوّل تو انہوں نے لینے سے انکار کیا لیکن بعد میں اس پر راضی ہوئے کہ یہ رقم کالج میں جمع کر دی جائے۔ بڑی مشکل سے یہ رقم ان کے نام سے ڈاکخانہ میں جمع کی گئی اور چونکہ اس کا خدشہ تھا کہ وہ اس رقم کو دوسروں پر خرچ کر دیں گے اس لیے پاس بک کالج کے ایک اولڈ بوائے شیخ نفیس الحسن مرحوم سابق اسپیکر یو پی اسمبلی اور سابق چیرمین یو پی پبلک سروس کمیشن کے پاس رکھ دی گئی اور یہ اسی وقت انھیں دکھائی جاتی جب اس کا یقین ہو جاتا تھا کہ رقم ان کے ذاتی خرچ کے لیے نکلوائی جا رہی ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی ان کے جذبۂ ایثار، ان کی شرافت اور طلبا سے محبت اور ہمدردی کا مشہور ہے۔ کالج میں کم خرچ ہاسٹل بھی تھا جس کے طالب علموں کو مفت کپڑا بھی ملتا تھا۔ یہ کپڑا اکثر ہاسٹل کے طلبا کے لیے ایک ہی طرح کا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے ان طلبا میں احساس کمتری پیدا ہونا یقینی تھا۔ ایک نمائش میں طلبا کو ان کپڑوں میں جانے میں تامّل ہوا۔ جب ہیڈ ماسٹر کو اس کا علم ہوا تو مرحوم نے اسی کپڑے کی شیروانی بنوائی اور اسے پہن کر نمائش جانے لگے اور اس طرح طلبا کے سامنے انکسار، ایثار، محبت اور مساوات کا نمونہ پیش کر دیا۔

سید الطاف حسین صاحب مرحوم ایک دردمند شفیق استاد، دیدہ ور ماہر تعلیم اور صاحب علم شخصیت کے مالک تھے اور ہر موضوع پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ علمی مشاغل میں ان کو سب سے زیادہ پڑھنا اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب تھا۔ کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا اور سچا شوق تھا کہ انتہائی مصروفیت و پریشانی بلکہ علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ انھوں نے درس تدریس کو اپنا پیشہ بنایا لیکن ان کا مطالعہ اس کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر حاوی تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا بھی بیحد شوق تھا۔ آج کالج میں انگریزی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ ان ہی کے شوق کا نتیجہ ہے۔ بحیثیت استاد ان کو باقاعدہ درس سے زیادہ اس کی لگن تھی کہ طلبا کے دل میں عام مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ شاعری سے بھی شوق فرماتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اشعار چند مخصوص احباب کے علاوہ کسی کو نہیں سناتے تھے۔ البتہ ان کے احباب اور مخصوص شاگردوں کا کہنا تھا کہ وہ بہت اچھے شعر کہتے تھے اور موصوف اس طرف زیادہ توجہ فرماتے تو ان کا مقام بحیثیت شاعر بھی اردو ادب میں بہت بلند ہوتا۔ وہ انگریزی تحریر پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں بیساختہ پن، جوش اور خلوص ہوتا تھا لیکن افسوس کہ انھوں نے کوئی مستقل تحریر نہیں چھوڑی۔ ان کی انگریزی لکھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ سننے میں آیا ہے۔ جب سر مالکم ہیلی گورنر یو پی اٹاوہ تشریف لائے تو ان کو میونسپل بورڈ کی طرف سے جو ایڈریس پیش کیا گیا وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا

صاحب کو ڈیڈیکیٹ کیا تھا۔ اس ایڈریس کو سُن کر گورنر ملکور نے فرمایا تھا کہ یہ ایڈریس انگریزی زبان وادب کا ایک شاہکار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم نے کالج کی بنیاد رکھی اور اس کی عالی شان عمارت بنوائی لیکن اس کالج کو ملک میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ الطاف حسین مرحوم کی ذاتی کوششوں اور طریقۂ تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی۔ مرحوم ایک جید عالم، بہترین منتظم اور عظیم استاد تو تھے ہی ان کے خلوص، ان کے ایثار اور ان کی محنت نے ان کو منفرد بنا دیا تھا اور ان کی اسی شخصیت میں ہی کالج کی شہرت اور مقبولیت کا راز پنہاں تھا۔ وہ ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بنا لیتے تھے۔ یہ طالب علم اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پر صرف کرتے تھے اور مرحوم مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ان طالب علموں کے ساتھ ایسے دلچسپ انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان میں ان مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے علم و واقفیت میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی ان مجلسوں اور بحثوں کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ بہت سے طلبا کی عام واقفیت ان مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہو جاتی تھی کہ وہ مستقبل میں ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔

مرحوم کس طرح اپنے شاگردوں پر نظر رکھتے تھے اور کس کس طرح ان کی مدد فرماتے تھے، اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ میں ۱۹۵۹ء میں اس کالج کا پرنسپل ہو کر آیا تو کچھ ہی روز کے بعد ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے انھوں نے اپنا نام رمیش گپتا بتایا اور کہا کہ وہ آگرہ ضلع میں ایک غریب کسان کے بیٹے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مڈل پاس کر کے اس کالج میں نویں کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خود ان کا ٹسٹ لے کر انھیں کم خرچ والے ہاسٹل میں داخل دیا تھا۔ ہائی اسکول کے دوران ہیڈ ماسٹر صاحب گشت کرتے ہوئے اس کمرہ میں آئے جہاں وہ آرٹ کا امتحان دے رہے تھے۔ ایک نظر ان کی آرٹ کی کاپی پر ڈال کر مرحوم نے گپتا جی سے کہا کہ وہ امتحان کے بعد ان سے ملیں۔ گپتا صاحب بہت پریشان ہوئے، وہ سمجھے کہ ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ بہرحال ڈرتے ڈرتے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے تو مرحوم نے ان سے دریافت کیا کہ وہ ہائی اسکول پاس کر کے کیا کریں گے۔ گپتا صاحب نے بتلایا کہ آئندہ تعلیم جاری رکھنا تو ان کے لیے مشکل ہے، اس لیے وہ ملازمت کی کوشش کریں گے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے نتیجہ برآمد ہونے کے بعد انھیں پھر بلایا۔ گپتا صاحب نے ہائی اسکول میں فرسٹ ڈویژن اور آرٹ میں امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انھیں ایک خط دیا اور دس روپیہ بھی اپنے پاس سے دیے اور فرمایا کہ یہ خط لے کر وہ اس پر لکھے پتے پر ہی چلے جائیں، ان کی تعلیم یا ملازمت کا انتظام ہو جائے گا۔ گپتا صاحب کا کہنا تھا کہ اس خط اور مرحوم کی سفارش کی وجہ سے انھیں فرانس جا کر وہاں کے آرٹ اسکول میں آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا اور وہ

۱۹۳۷ء میں فرانس چلے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے بڑی ترقی کی اور فرانس میں ہی ملازمت کرلی، وہیں شادی
اور بس بھی گئے۔ اب ۲۰، ۲۲ سال بعد وہ ہندستان آئے تھے اور سیدھے ممبئی سے امباوٹہ آئے، تاکہ سب سے پہلے
عظیم ہستی کے چرن چھو سکیں جس کی وجہ سے انھوں نے سب کچھ حاصل کیا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا
ہو چکا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر کی تصویر کا جو دفتر میں آویزاں ہے ایک فوٹو
اپنے پرانے ہاسٹل میں جاکر اپنے پرانے کمرہ سے کچھ مٹی جمع کی اور اپنے گاؤں چلے گئے۔

اس واقعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ مرحوم اپنے شاگردوں کے کس کس طرح کام آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ
کا ہر طالب علم انھیں اپنا محسن اور اپنا باپ سمجھتا تھا اور بیحد احترام کرتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم پر ان کی شخصیت اور ان کی تعلیم و تربیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ایک
میں جب موصوف کو ایک کتاب "نذر ذاکر" پیش کی گئی تھی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھ پر سب سے بڑا
میری والدہ کا ہے اور اس کے بعد میرے استاد سید الطاف حسین صاحب کا۔ اگر ان دونوں کی تعلیم و تربیت مجھے
نہ ہوتی تو نہ جانے میں کیا ہوتا۔" اسی وجہ سے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب بھی ان
آتا تھا آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سید الطاف حسین صاحب نے ذاکر صاحب کے پاس جب
مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اپنے ایک قدیم طالب علم کو سفارشی خط دے کر بھیجا۔ جب وہ خط لے کر
صاحب کے دفتر میں پہنچے تو ذاکر صاحب نے استاد کے احترام میں دفتر سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ ہیڈ ماسٹر
مرحوم کی سیرت و شخصیت کا ہی اثر تھا کہ خود ذاکر صاحب کی شخصیت اتنی عظیم بنی۔ یہ ضرور ہے کہ استاد کا
محدود تھا اور شاگرد کا بہت وسیع، اس لیے استاد کی تعلیم و تربیت کو زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آنے کا
شاگرد نے استاد کا نام روشن کیا اور اپنی انفرادی صلاحیت سے اپنے کردار کو منفرد بنایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کا کام اور اثر اسکول تک ہی محدود نہ تھا۔ اس کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا
ملک کے ادیب و شاعر، سیاسی رہنما، مذہبی علما ہر قسم کے لوگوں سے ان کے مراسم تھے۔ سب ہی ان کا احترام کرتے
تھے۔ اس دور کے مشہور شعرا، ادیب اور رہنمایان قوم اکثر ان کے مہمان رہا کرتے تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی،
بدایونی، سیماب اکبرآبادی اور یگانہ چنگیزی تو ان کے جگری دوستوں میں سے تھے۔ ان کی نشست کا کمرہ
دربار بنا رہتا تھا۔ آدھی رات تک شہر کے معززین، اساتذہ اور کبھی کبھی مخصوص طلبا وہاں جمع رہتے تھے۔
صاحب جان محفل ہوتے تھے۔ مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتی تھیں، لطیفے ہوتے تھے۔ شعر و شاعری ہوتی

ہیڈ ماسٹر صاحب کی معلومات اور علمی مباحثوں سے سب مستفید ہوتے تھے۔ ان کے باغ و بہار جلسوں کا لطف اٹھاتے اور ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کی ظرافت اور ان کے ہیرا تراش فقرے آج بھی ضرب المثل ہیں۔

یوں تو ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کا علم، ان کا خلوص اور ان کا ایثار وہ اعلیٰ صفات تھیں جنھوں نے نہ صرف طلبا بلکہ عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا لیکن ان کی سب سے بڑی صفت ان کی شرافتِ نفسی تھی۔ بحیثیت مرشد و معلم بھی ان کی توجہ کا مرکز انسان کی شرافت رہی۔ مرحوم اپنے ارشاد و ہدایات اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ طلبا کی ان قدروں کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جو انھیں انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں اور اس طرح تعلیم و ہدایت سے ان کی روح کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اچھے طلبا بناؤ، اچھا سماج پیدا ہوگا، اچھی قوم بنے گی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے اسلامیہ کالج اٹاوہ کی ۳۰ برس تک بے لوث خدمت کی اور ۱۹۴۴ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۵۶ء میں اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ وفات سے ایک سال قبل چند شعر کہے تھے، جن کے آخری مصرع سے تاریخ وفات کا مادہ نکلتا ہے:

خادمِ جملہ خاص و عام الطاف ۔۔۔ تھا کبھی مرجعِ انام الطاف
ملک الموت کے پیام تجھے ۔۔۔ ملتے رہتے ہیں صبح و شام الطاف
نزع کے وقت دوستوں نے کہا ۔۔۔ بسترِ مرگ پر سلام الطاف
۱۳۷۶ھ

زندگی بھر انھیں ایک دھن رہی، کالج کی خدمت، اور وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ وہ ان پکے معلموں میں تھے جو بقول ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتش
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

●●

②

ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کی بیشتر خوبیاں سید الطاف حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول اٹاوا کی رہین منت ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت نے ہی ذاکر صاحب کی شخصیت میں وہ رنگ بھرے انھوں نے بعد میں اپنی صلاحیت سے اتنے تابناک بنا ڈالے کہ ان کی شخصیت منفرد ہو گئی۔ ذاکر صاحب ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک اسلامیہ اسکول اٹاوا (آج کل حافظ محمد صدیق اسلامیہ کالج) کے طالب علم رہے تھے ان دنوں اسکول اٹاوا شمالی ہندوستان کا ایک ایسا منفرد اسکول تھا، جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ مخصوص تربیت دی جاتی تھی اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب کا نام اس سلسلہ میں بہت ہی مشہور تھا۔

کالج کے ریکارڈ میں ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں موجود ہیں۔ مثلاً داخلہ فارم کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۸ نومبر ۱۸۹۷ء ہے جو بعد میں انسپکٹر آف اسکول کے دستخطوں سے ان کی عمر میں ۹ ماہ کا اضافہ کر کے ان کی تاریخ پیدائش ۸ فروری ۱۸۹۷ء کر دی گئی ہے اور یہی عمر ان کے ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ میں درج ہے۔ ریکارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی برسوں میں وہ بہت اچھے طالب علم نہیں تھے۔ ان کی حاضریاں بھی کم رہتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ نہ صرف اچھے بلکہ اسکول کے سب سے ہونہار طالب علم بن گئے۔ ان کے زمانہ کے کچھ اساتذہ جو ابھی دس بیس سال پہلے تک حیات تھے، ذاکر صاحب کی ذہانت، مطالعہ سے دلچسپی، خطابت، مضمون نگاری اور شائستگی کی تعریف کرتے تھے۔ مولوی فیاض خاں صاحب سرجن (علی گڈھ) جو اتفاق سے میرے بھی استاد رہے ہیں، ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب ہوسٹل وارڈن بھی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذاکر صاحب ہوسٹل کے نظم و ضبط کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کے بہت سے طالب علم ہوسٹل میں مقیم تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر

وہاں کے پٹھان زمینداروں کے لڑکے تھے، ہر وقت لڑتے تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب جو خود بھی قائم گنج کے پٹھان تھے، ہمیشہ اس ٹولی سے الگ رہے۔ اس لیے اکثر وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ "ذاکر! تم پٹھان نہیں، طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے سید ہو۔"

ذاکر صاحب نہ صرف ایک ذہین اور ہونہار طالب علم تھے بلکہ وہ اپنے اساتذہ اور طالب علموں دونوں میں ہر دلعزیز بھی تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ایک واقعہ ان کے ساتھی طلبا اور اس زمانہ کے اساتذہ سے سننے میں آتا رہا ہے: ایک مرتبہ ہوسٹل کے کچھ لڑکوں نے یہ مطالبہ کیا کہ "پلیٹ بند کرنے کی سزا" موقوف کی جائے اور اس بات پر اسٹرائک بھی کر دی۔ ان دنوں ہوسٹل کے قواعد میں یہ بھی تھا کہ سزا کے طور پر کسی طالب علم کے کھانے سے ایک پلیٹ کم کر دی جاتی تھی۔ گویا اسے دوسروں کے مقابلہ میں ایک پلیٹ سالن کم ملتا تھا۔ اس اسٹرائک کی پشت پناہی ذاکر صاحب ہی کر رہے تھے۔ حالانکہ ظاہراً وہ اسٹرائک میں شریک نہیں تھے۔ جب یہ اسٹرائک باوجود کوشش ختم نہ ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کی گئی اور اسٹرائک کرنے والے لڑکوں کو اسکول سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔ جب ذاکر صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے وارڈن کے پاس جا کر اصرار کیا کہ یہ حکم ناجائز ہے اسے واپس لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علم کی سزا میں پلیٹ بند کرنے کا طریقہ نہ صرف ظلم ہے، بلکہ غیر اخلاقی عمل ہے۔ جب یہ لوگ کھانے کا پورا پیسہ دیتے ہیں تو ان کی پلیٹ کیوں بند کی جائے۔ آخر کار ان کی سفارش اور زور دینے پر وارڈن اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور پلیٹ بند کرنے کا طریقہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دینا پڑا۔

ذاکر صاحب میں جذبۂ ایثار اور قومی ہمدردی اسی زمانے سے پیدا ہو چکی تھی۔ ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دنوں میں انھوں نے اسلامیہ اسکول کے ہوسٹل میں یہ تحریک چلائی تھی کہ طلبا گوشت کھانا بند کریں اور اس طرح جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھجوایا جائے۔ یہی نہیں وہ جمعہ کے روز نماز کے بعد مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مظلوم ترکوں کے لیے اپنی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرتے تھے۔ اکثر مسجدوں میں اس کے لیے تقریریں کرتے تھے۔ خطابت انھوں نے اسی طرح سیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریروں میں گھن گرج کے بجائے نرمی اور شیرینی پائی جاتی تھی۔

انسانی ہمدردی اور شرافت بھی ان میں اسکول کے زمانے سے ہی بہت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ ہوسٹل سے اٹاوہ اسٹیشن جو قریب ایک کلو میٹر ہے، صرف اخبار خریدنے جایا کرتے تھے جب وہ اسے لے کر واپس آتے تھے، تو بہت سے طالب علم ان کے چاروں طرف اکٹھا ہو جایا کرتے تھے اور وہ سب کو

اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور اکثر خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان باتوں سے بھی وہ اپنے ر... میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ان کے ساتھی ان کو "مرشد" کے نام سے پکارتے تھے۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر وہ ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم کی توجہ کا مرکز بنے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ذہین اور ہونہار طالب علموں... اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ ایسے طالب علم اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر گزارتے... ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف مسائل پر اُن سے گفتگو کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی مخصوص توجہ کا اثر ذاکر صاحب پر بڑا گہرا پڑا۔ ان میں اس زمانے کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہوئی۔ اسی بصیرت کا... یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں ان معاملات کو سمجھنے کے لیے صحیح جذبات اور احساسات پیدا ہوئے اور ان کے اندر... قومی ہمدردی بلکہ انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔

جب مرحوم ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ ک...
...اشادہ تشریف لائے اور ہوسٹل میں اپنا کمرہ دیکھنے گئے تو میں نے اسلامیہ اسکول کے ایک پرانے خادم "بندے حسن" سے جو بفضل خدا اب بھی حیات ہیں اور کالج سے ریٹائر ہو گئے ہیں، انھیں متعارف کرایا۔ بندے حسن... ذاکر صاحب کے طالب علمی کے زمانے میں ہوسٹل میں بیرا تھے۔ ذاکر صاحب نے بندے حسن کو گلے لگایا اور... تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ انسان دوستی کا یہی جذبہ انھیں جامعہ ملیہ میں باوجود حالات ناسازگار... کے کام پر لگاتار رہا۔ یقیناً ایک انسان دوست شخص ہی ان حالات میں جامعہ ملیہ جیسے عظیم ادارے کو چلا سکتا ہے جب وسائل کا فقدان ہو، اپنوں کی مخالفت اور حکومت کے عتاب کا سامنا ہو۔ ایسا وہی کر سکتا... جسے انسانوں پر اور خود اپنی ذات پر پورا بھروسہ ہو اور جسے انسانوں سے محبت ہو۔

انسان دوستی کے ساتھ بلند اخلاق اور اعلیٰ شرافت بھی ذاکر صاحب کی عظمت کی خصوصیات... سے تھیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی جس طرح ملتے تھے اس کی مثال بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب... ان کے چھوٹے ان سے ملنے جاتے تھے تو وہ انھیں رخصت کرنے کے لیے کمرہ سے باہر تشریف لاتے... انھیں حفظِ مراتب کا بڑا خیال تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب وہ پٹنہ میں گورنر تھے میں نے ایک خط اسلامیہ کالج... بارے میں انھیں لکھا تھا۔ اس کے جواب میں موصوف نے "مجھے مکرمی و معظمی جناب پرنسپل صاحب" لکھ کر... کیا تھا اور لکھا تھا "آپ حیران نہ ہوں میں یہ خط عزیزی امان اللہ خاں شیروانی کو نہیں لکھ رہا ہوں، بلکہ... سابق طالب علم اپنے اسکول کے پرنسپل کو لکھ رہا ہوں۔"

اس عظیم شخصیت کا ایک اور وصف انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ میں نمایاں ہوتا تھا۔ وصف بھی مرحوم نے اپنی مادر درس گاہ اسلامیہ اسکول سے ہی حاصل کیا تھا۔ اسکول کے بانی ڈاکٹر ڈی بشیر الدین صاحب مرحوم میں بھی مردم شناسی کا یہ جوہر نمایاں تھا۔ انھوں نے اسکول میں قابل مستعد اور مخلص اساتذہ کی ایک ایسی جماعت یکجا کر لی تھی جنھوں نے خلوص اور لگن سے اس اسکول میں بچّوں کو ایسی تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ آیندہ زندگی میں اندھیروں کو دُور کرنے کے لیے شمعیں فروزاں کرتے ہیں۔ اس اسکول نے ذاکر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر سیّد محمود، ڈاکٹر محمد حسین، یٰسین نوری، عظیم بیگ چغتائی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، شیخ نفیس الحسن، کے۔ آصف۔ (فلم ساز) اور بہت سی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں جنھوں نے سیاست، درس و تدریس، ادب اور آرٹ میں اپنی عظمت کا سکّہ جما دیا۔ ذاکر صاحب میں بھی مردم شناسی کا وصف نمایاں تھا۔ وہ ہمیشہ کاموں اور مقاصد کی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ اسی پرکھ کی بدولت انھوں نے جامعہ ملّیہ میں ایسے ایسے یادگار زمانہ نادر جواہر اکٹھا کر رکھے تھے جن کو نہ صرف ان کے مقاصد سے دلچسپی تھی، بلکہ ذاکر صاحب کی ذات سے بھی عقیدت تھی۔ جامعہ میں ایک مدت تک ایسے معلّم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے اور نجی زندگی میں اور زیادہ عیش و آرام میسّر آسکتا تھا، لیکن بقول شخصے "ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا، جو ذاکر صاحب کے سینہ میں فروزاں تھا۔"

ذاکر صاحب کو اپنی مادر درس گاہ اسلامیہ اسکول سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی کی سپاس نامہ میں انکی توجہ ان کی مادر درس گاہ کی طرف دلائی گئی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا: "میں اس اسکول کو کیسے بھول سکتا ہوں! مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں یہاں چھٹے کلاس کا طالب علم تھا۔ میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا، والد پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے، جب والدہ محترمہ کی وفات کی خبر مجھے دی گئی تو یہاں کے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے گلے لگا کر کہا تھا کہ تمھاری ایک ماں نہیں رہیں لیکن یہ اسکول تمہاری ماں موجود ہے۔ اور پھر مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں یتیم و یسیر ہوں۔" یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئی تھیں۔ ان کی یہ تقریر اتنی مؤثر تھی کہ مجمع میں بہت سے لوگوں اور طلبا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس

[ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی : پیدائش ۱۸۹۰ء علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے، لندن سے پی۔ایچ۔ڈی۔ شعبۂ جغرافیہ، پٹنہ کالج پٹنہ کے صدر شعبہ اور کالج آف کامرس پٹنہ کے پرنسپل رہے۔ اپالچین یونیورسٹی اور کنٹکی یونیورسٹی (امریکا) کے وزیٹنگ پروفیسر کے فرائض انجام دیے۔ "مثنوی حیات و کائنات"، مثنوی جلوۂ صد رنگ، اور "یاد وطن" آپ کے کلام کے مجموعے ہیں۔ فروری ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔]

ان کے اصولوں کے سلسلے میں ایک بات جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا، اس کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک بار میں نے کالج کے ایک ٹیچر کی کچھ ناروا باتوں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس سے مجھے کالج کے کاموں میں رکاوٹ ہونے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ایسے معاملات میں ان کا یہ اصول رہا ہے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کسی نے کوئی غلط کام کیا، اس کو اچھا آدمی سمجھنا چاہیے اور اس سے کام میں مدد لینے کو جاری رکھنا چاہیے۔ ایسا نہیں کرنے سے اس کی دشمنی جو غلط فہمیوں پر مبنی ہو شاید زیادہ بڑھ جائے اور ادارے کی ترقی میں زیادہ دشواریاں پیدا ہو جائیں۔ میں اس کے بعد اسی اصول پر چلتا رہا اور اسے بہت مفید پایا۔

میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو ایک بڑا انسان، ایک عظیم علم پرور اور سچا قوم پرست مسلمان سمجھتا ہوں اور ان کے اخلاق و خلوص سے ان سے جب ملا، بہت متاثر ہوا۔ میں نے ایسی عظیم شخصیتیں اپنی زندگی میں کم ہی دیکھی ہیں۔

سید بہاء الدین احمد

[سید بہار الدین احمد : پیدائش ۱۹۱۱ء بمقام نیانواں (گیا)، ۱۹۳۸ء میں حکومت بہار کے تحت منصف، پھر ۱۹۶۰ء میں ڈسٹرکٹ و سیشن جج کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہوگئے۔ تصانیف میں "گلستان ہزار رنگ" (جس پر ابوالکلام آزاد کا مقدمہ ہے)، "گلستان مجاز"، گلگشت معارف اور گلستان تغزل (زیر طبع) قابل ذکر ہیں۔ موج نسیم اور صاعقہ کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔]

ذاکر صاحب سے ملاقات: اس ملاقات کے بعد تھوڑے عرصہ پر ذاکر صاحب کے دو خطوط میرے خطوں کے جواب میں آئے۔ دونوں ان کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے تھے۔ پتہ بھی دونوں پر اپنے ہی ہاتھ سے تحریر فرمایا تھا۔ لطیفہ یہ کہ ایک لفافے پر ۱۵ عدد ایک ایک پیسے کے ٹکٹ لگے ہیں۔ اس زمانے میں لفافے پر ۱۵ پیسے کے ٹکٹ لگتے تھے۔

سعید انصاری

● **جناب سعید انصاری :** پیدائش، جولائی ۱۹۰۴ء - مقام پیدائش، اعظم گڈھ (اُترپردیش) - ابتدائی تعلیم، مدرسۃ الاصلاح اعظم گڈھ - انگریزی تعلیم، شبلی ہائی اسکول اعظم گڈھ - ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات و عدم تعاون میں شرکت - یونیورسٹی کی تعلیم ابتداءً کاشی ودیا پیٹھ، بنارس - بعد میں ۱۹۲۱ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ - ذاکر صاحب سے ملاقات و رفاقت بحیثیت طالبعلم یہیں سے - ۱۹۲۶ء سے بحیثیت رفیق اُردو اکیڈیمی و استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ -

مزید اعلیٰ تعلیم :- دوران قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک سال کے لئے (۳۰-۳۱ء) وشوابھارتی شانتی نکیتن میں بحیثیت ریسرچ اسکالر - ۱۹۳۴ء میں ذاکر صاحب کی ہدایت پر تعلیمات کی تعلیم کے لئے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک - ۱۹۳۸ء میں امریکہ سے واپسی پر، بنیادی تعلیم کے استادوں کی تربیت کے لئے ایک ادارے کا قیام - موجودہ ٹیچرز کالج انہی کوششوں کا نتیجہ ہے -

تالیف و تصنیف :- ۲۵ء میں اُردو کے عناصر اربعہ کے عنوان سے ایک انعامی مقابلہ میں شرکت - آپ کا مقالہ (۱) "مولانا شبلی بحیثیت انشا اردو" اوّل انعام کا مستحق قرار پایا - اگلے دو سال میں جامعہ کی اُردو اکیڈیمی میں بحیثیت رفیق جان اسٹورٹ مِل کی کتاب "لبرٹی" کا اُردو ترجمہ "آزادی" کے نام سے - پہلا اڈیشن مکتبہ جامعہ سے ۱۹۲۸ء میں - دوسرا اڈیشن ترقی اردو بورڈ کی طرف سے ۵۸ء میں - تعلیم پر کتابیں : (۳) "ہندوستان کے تعلیمی مسائل" - ۴۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے - (۴) "تعلیم اور سماج" ۴۸ء میں اسی پبلشنگ ہاؤس سے (۵) زندگی کا رخ" مکتبہ جامعہ سے (۶) "اکابر تعلیم" مکتبہ جامعہ سے (۷) تعلیم ہندوستان کے اسلامی عہد میں، ترقی اردو بورڈ سے (۸) "عصری تعلیم" ترقی اردو بورڈ سے - (زیر اشاعت) -

●●

یادیں کس کی آتی ہیں ؟ ایک محبوب کی، ایک عزیز کی، اور پھر وہ یادیں جو ایسی لذیذ اور دل آویز ہوں کہ ان کی مٹھاس اور شیرینی سے کام و دہن اب بھی محظوظ ہو رہے ہوں ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اُنہی چند محبوب اور ہر دلعزیز شخصیتوں میں سے تھے کہ جن کی ہر ایک بات ہر عمر اور ہر حیثیت کے شخص کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی ۔

اسی کے ساتھ ان کی وہ باتیں ان کے حسنِ ذوق، ذہانت طبع اور اعلیٰ کردار کا پتہ بھی دیتی ہیں ۔

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے گیا ۔ وہ مجھے سب سے پہلے علی گڑھ کی ایک مشہور عمارت "بنگالی کوٹھی" میں ملے ۔ جو اس زمانہ میں جامعہ کا ایک دارالاقامہ تھا ۔ پہلی رات کے بعد صبح ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے کمرے میں ایک گھنی، سیاہ ڈاڑھی والے ایک بزرگ مع پانچ ساتھیوں کے مقیم ہیں ۔ ساتھ ہی بازو کے کمرے میں تین ندویوں کے ساتھ مجھے بھی جگہ ملی تھی ۔ جب صبح میرا ان سے تعارف ہوا کہ یہ اعظم گڑھ سے تشریف لائے ہیں، تو پھر انھیں اعظم گڑھ کے دوست، احباب، دارالمصنفین کے رفقا اور مصنفین اور وہاں کی ہر چیز، جو انھوں نے کبھی دیکھی یا سُنی تھی، ایک ایک کر کے یاد آنے لگی اور پھر انھوں نے ہر ایک کی خیر و عافیت، حال چال اور ان سب چیزوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ آیا وہ اب بھی ملتی ہیں یا نہیں ؟

سب سے پہلے انھوں نے سہیل صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا کہ "وہ اب بھی پان منہ میں دبائے گھر گھر جاتے ہوں گے ۔" میں نے کہا، جی ہاں، اب بھی ان کا وہی حال ہے اور پھر وہ ان کی ذہانت، علمی قابلیت اور علی گڑھ کے زمانہ میں ان کی شعر و شاعری کے قصے سُنانے لگے ۔

ان کی جزئیات سے دلچسپی کا حال یہ ہے کہ سہیل صاحب کے سلسلے میں کہنے لگے کہ بھئی، ان کے ہاں ارہر کی دال خوب پکتی ہے ۔ کھانے تو انھوں نے ایک سے ایک لذیذ ان کے ہاں کھائے ہوں گے اس لئے کہ سہیل صاحب

کا دسترخوان اور پھر ان کی بیگم صاحبہ کی خوش سلیقگی اور پکوان بہت کم گھروں کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے لیکن سب کھانوں میں ان کا ارہر کی دال کا انتخاب اور وہ بھی ان کے حافظہ میں محفوظ رہنا یہ ان کے حسن ذوق لطافت اور اس صفائے ذہن پر موقوف ہے، جس کو ہر چیز میں حسن و جمال نظر آتا ہے۔

دار المصنفین کا ذکر آیا، تو مولانا سید سلیمان ندوی، لیکن اس سے زیادہ مولانا مسعود علی ندوی جن سے وہ زیادہ بے تکلف تھے اور دوسرے رفقا کا حال دریافت کرنے لگے، اور یہ کہ ان میں سے کون کیا کام کرتا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو صاحب ادارہ کا حال پوچھ کر ختم کر دیتا، لیکن ان کی تلاش قدر بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہیں جانتی تھی۔ بلکہ وہ ہر ایک میں اپنی اپنی حیثیت کی قدر و قیمت دیکھتی، اور سب کو یکساں برابر تسلیم کرتی۔

اعظم گڈھ کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ آپ کے یہاں ریشمی کپڑے بھی تو بنتے ہیں، اور طرح طرح کے اور نام بھی عجیب عجیب قسم کے؛ لیکن ہر ایک کی اپنی اپنی خوبی الگ اور اسی اعتبار سے ان کے نام بھی ہیں۔ ایک کپڑا ہوتا ہے جسے 'غلط' کہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اتنا چکنا ہوتا ہے کہ اس کو چھونے پر چٹکی پھسل جاتی ہے۔ پھر اسی طرح سنگی اور بوت کے تھان کا ذکر کرنے لگے۔ اس قدر تفصیل و تحقیق کے ساتھ علم تو شاید ان کپڑا بنانے والوں کو بھی نہ ہو۔

لیکن ایک کپڑے کے شوق اور اس کی تحقیق کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا، جو ان کے نہ صرف شوق جمال کی دلیل ہے، بلکہ ان کی حقیقت شناس طبیعت کی بھی مظہر ہے۔ کہنے لگے کہ اور وہ ایک 'مُشرو' بھی تو ہوتا ہے میرا ذہن اس سے فوراً 'مشرو' والا کی طرف دوڑا، جو گاندھی جی کے حلقہ میں ان کے بڑے معتقد اور اچھے لکھنے والے گذرے ہیں اور ان کے بعض رسائل اور پرچوں کے ایڈیٹر بھی تھے۔

بات 'مشرو' کی نکلی تھی، وہ فرمانے لگے کہ یہ لفظ 'مشرو' نہیں بلکہ 'مشروع' عین کے ساتھ ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ کپڑا جو شرعاً جائز ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ مردوں کے لیے ریشم پہننا شرعاً جائز نہیں لیکن اس کے بنانے والوں نے اس میں تانے کا تار سوت کا رکھا ہے جس سے اس کا پہننا جائز ہو گیا اور اسی لیے اس کا نام 'مشروع' رکھا گیا۔

ان کا یہ شوق اور قدر دانی دیکھ کر جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ایک ایک تھان ہر ایک کا اپنے ساتھ لے آیا جو اس وقت اتنا گراں بھی نہ تھا اور وہ اس سے بہت خوش ہوئے۔

ایک بار فرمانے لگے کہ آپ کے شہر سے قریب ایک اور شہر ہوتا ہے: مرزاپور۔ آپ جانتے ہیں کہ وہاں کی کیا چیز مشہور ہے؟ میں نے بہت سوچا، حافظے پر زور دیا لیکن کوئی چیز یاد نہ آئی۔ پھر خود ہی بولے، وہاں کی لاٹھیاں اور ڈنڈے مشہور ہیں۔ وہاں کے بانس خاص قسم کے ہوتے ہیں، بہت لمبے اور سبک، اور ان میں مناسب فاصلوں پر گرہیں ہوتی ہیں۔ لوگ انہی گرہوں پر اگر بانس میں کچھ ٹیڑھا پن ہو تو چراغ کی لَو سے گرم کر کے اسے سیدھا کر لیتے ہیں۔ جب وہ سیدھے ہو جاتے ہیں تو ان میں سے مناسب لمبائی کی لاٹھیاں اور ڈنڈے کاٹ لئے جاتے ہیں اور پھر وہ استعمال ہوتے ہیں۔

بہرحال میرے لئے مرزاپور جانا، ان بانسوں کا لے آنا اور ساتھ میں لے کر اتنی لمبی مسافت طے کرنا بہت دشوار تھا۔ ایک خاں صاحب جو اپنے بچّے کو جامعہ میں داخل کرنے کے لئے بہت بے چین تھے، میں نے ان سے ذاکر صاحب کے اس شوق کا ذکر کیا۔ ایک دن جولائی میں کیا دیکھتا ہوں کہ خاں صاحب بن چھیلے اور سیدھے بانسوں کا ایک بوجھ لے کر چلے آرہے ہیں۔ میں نے انھیں اسی حالت میں ذاکر صاحب کے پاس بھیجا۔ وہ یہ نایاب تحفہ پاکر بھلے خوش ہوئے۔ پھر نہ جانے کس کس طرح سے ان سے لاٹھیاں اور ڈنڈے نکالے ہوں گے۔

اسی قسم کی ایک دو اور باتیں یاد آتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوقِ جمال اور تلاشِ حسن کسی ذاتی تشفی اور شخصی منفعت کے خیال سے نہ تھا، بلکہ یہ ان کے ذہنِ رسا کا ایک قدرتی فعل تھا، اور اس سے وہ صرف ان چیزوں کو اپنے ارد گرد دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے گرد و پیش کے ماحول پر چھا جانا چاہتے تھے۔ بوگین ویلیا کا لفظ میں نے پہلی بار ان ہی کی زبان سے سُنا۔ ایکبار وہ چند پودے اس پھول کے لائے اور کہا کہ اسے مدرسے کے احاطے میں چہار دیواری کے سہارے لگا دیجئے۔ میں نے کہا کہ انھیں لگائیں تو بکریاں کب چھوڑیں گی جو ہم اس کے پھولوں کی بہاریں دیکھ سکیں گے۔ انھوں نے پھر بہ اصرار فرمایا کہ آپ لگائیے تو، قدرت نے اس کا انتظام بھی کیا ہے؛ چنانچہ میں نے ان کے حکم کے مطابق لگوا دیئے اور کچھ ہی دنوں بعد جب وہ پودے بڑے ہوئے اور ان میں سرخ سرخ رنگ کے پھول آنے لگے تو میں نے کیا دیکھا کہ ان پھولوں کے ساتھ ٹہنیوں میں نہایت تیز نکیلے کانٹے بھی ہیں، کسی نے ٹھیک کہا ہے: 'ہر جا کہ گل است خار است'۔ ان بکریوں اور گایوں کی ان کے کھانے کی کیا ہمت پڑ سکتی تھی۔ پھر تو ساری جامعہ نگر کی بستی جہاں گرمی کے دنوں میں کوئی پیڑ پودے نظر آتے تھے ان پھولوں کی بدولت لالہ زار بن گئی۔

جناب صدر، یعنی اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی اگر اجازت دیں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں

کہ آج میں اس 'راج بھون' میں جہاں اس سے پہلے بھی رہ چکا ہوں، جبکہ ذاکر صاحب یہاں کے گورنر تھے، اس وقت خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں، اس تمام حصہ میں خاک اڑتی تھی۔ لیکن آج کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تو اسی کی بدولت اور پھر اس پر آپ کا بھی ذوقِ جمال، اس لئے کہ آپ نے بھی انھیں کے سایہ میں پرورش پائی ہے دونوں نے مل کر اب اسے ایک چمن زار اور 'گلستاں' بنا دیا ہے۔

ذاکر صاحب کی رفاقت کا فخر جامعہ ملیہ کی خدمت کے سلسلہ میں کم و بیش کوئی پچاس سال رہا لیکن اس مدت میں انھوں نے کبھی مجھے کیا کسی اور کو بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ جامعہ کے شیخ الجامعہ ہیں اور دوسرے لوگ ان کے ماتحت کارکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جامعہ کی خدمت میں سب آپس میں برابر تھے اور اس کی ترقی میں سب کا یکساں حصہ تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے عہدے کے اظہار میں کہا کرتے تھے کہ First among the equals ہوں اور اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں۔

ان کا ایک اور فلسفۂ زندگی بھی تھا۔ وہ اکثر فرماتے کہ ہر شخص کو اپنی ترقی جماعت کی ترقی میں تلاش کرنی چاہیئے۔ وہ جماعت ہی کی خدمت میں اپنی ذاتی ترقی کی نشو و نما پا سکتا ہے۔ فرد اور جماعت کا یہی تعلق جس کی بنا پر یہاں مدرسہ کا افسرِ اعلیٰ 'نگراں' کہا جاتا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر، صدر مدرس یا پرنسپل کے نام سے نہیں یاد کیا جاتا تھا۔

جامعہ میں مساوات قائم رکھنے کا ایک دوسرا اصول انھوں نے یہ رائج کر رکھا تھا کہ ایک مدت کے بعد یہ عہدیدار اپنے عہدے سے بدل کر کسی دوسرے منصب یا عہدے پر چلا جاتا تھا جس کا وہ اہل اس طرح جامعہ میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے آزمانے اور اسے بروئے کار لانے کا موقع ملتا تھا اور کوئی کسی عہدے یا مرتبے کو اپنا پیدائشی حق نہ سمجھتا۔

ذاکر صاحب نہ صرف اصولاً اپنے رفقا میں سب کو یکساں اور اپنا ہم مرتبہ سمجھتے تھے، بلکہ عملاً روزانہ کی زندگی میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک بار ایک چھوٹا سا واقعہ لیکن نہایت ناگوار صورت میں پیش آیا وہاں ذاکر صاحب نے اپنے اس اصول اور طریقہ میں ذرہ برابر بھی فرق آنے نہ دیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری جو نہ صرف ایک بہت بڑے معالج اور ڈاکٹر تھے، بلکہ ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ کے چانسلر یا امیر جامعہ بھی تھے، ایکبار وہ ایک بچہ کو جامعہ کے بورڈنگ میں دیکھنے کے لئے آئے، جو اتفاق سے ان کا عزیز بھی ہو تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو دیکھا کہ بچہ کی چارپائی کمرے میں اس طرح بچھی تھی کہ ایک دروازے سے دوسرے

دروازے میں ہوا کا رخ پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہ دیکھتے ہی اندر اندر بہت برہم ہوئے اور مریض کی تو کچھ ایسی فکر نہ کی، اس لئے کہ اس کا علاج ٹھیک ہو رہا تھا لیکن ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا اور اس میں شاید بورڈنگ کے اتالیقوں کی غفلت اور لاپروائی کی سخت شکایت کی جو ان کے استاد اور تیماردار بھی ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب کا خط پانا تھا کہ وہ آگ بگولہ ہو گئے اور بولے کہ میرے ساتھیوں پر غفلت اور بے توجہی کا الزام! فوراً پیڈ منگایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے نام ایسا سخت خط لکھا کہ ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بند رہا۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن یہ ضرور دیکھا کہ مدت تک امیر جامعہ اور شیخ الجامعہ میں کھنچاؤ رہا اور وہ بھی آپس کی کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے ایک اتالیق اور استاد پر غفلت اور بے توجہی کا الزام وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

ایک سال جامعہ کے کچھ پرانے ساتھیوں نے ایک ساتھ حج کے لئے جانے کا ارادہ کیا۔ یہ تعداد میاں بیوی کو ملا کر کوئی چھ کے قریب ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے اتنے امیدواروں کا ایک ساتھ قرعہ میں نام آنا مشکل کیا، ناممکن تھا۔ ہم سب نے مل کر آپ سے ذکر کیا۔ آپ اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اپنے اختیار خاص سے آپ نے ہم چھوں کے نام اجازت نامہ دلوا دیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں تک ختم نہ تھا۔ اس زمانہ میں حکومت سعودیہ کی طرف سے ڈاکٹری معائنہ کے لئے بڑی سختی تھی۔ آپ نے اپنے پی۔ اے سے کہا کہ بھئی ان چھوں آدمیوں کا ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر معائنہ کرا دو، ورنہ یہ لوگ حج کو نہ جا سکیں گے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ہمارے معائنہ کی رپورٹ آگئی اور ہم لوگ حج کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

لیکن روانگی حج سے پہلے خیال آیا کہ ایک دن چل کر شکریہ تو ادا کر دیا جائے۔ پی۔ اے سے وقت مقرر کر کے ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، فرمانے لگے کہیے سب انتظامات ہو گئے۔ پھر بولے کہ اس ارض پاک میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ بندے کی ہر دعا قبول کر لیتا ہے۔ آپ کے لئے ہم دعا میں کیا مانگیں گے؟ بولے کچھ نہیں، اس نے سب کچھ دے رکھا ہے، بس اگر دعا کیجئے گا تو یہ کہ 'انجام بخیر' ہو۔ ہم میں سے ایک صاحب جو بظاہر دینی مزاج اور مذہبی صورت رکھتے تھے، ان سے خصوصیت کے ساتھ بولے کہ آپ کا تو اللہ میاں سے رشتہ ہے، آپ خصوصیت سے میرے لئے یہ دعا کیجئے گا۔ یوں تو رسماً ہر ایک 'انجام بخیر' کی دعا کرتا ہے، لیکن جب ذاکر صاحب کی پوری زندگی پر نظر جاتی ہے، تو خیال ہوتا ہے کہ یہ بندۂ مومن، ان کا ایک مقبول اور نیک بندہ تھا، اور اس نے کس کی اور کیا خدمت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیوی جاہ و حشمت کے ساتھ اپنے تقرب اور

رضائے الٰہی سے بھی نوازا اور اس سے زیادہ 'انجام بخیر' اور کیا ہو سکتا تھا !

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ یاد آتا ہے' جو ہے تو ذاتی اور معمولی حیثیت سے تعلق رکھتا ہے کہ اس سے ان کے کردار' ان کی انسان دوستی اور ان کی ذرّہ نوازی کا اندازہ ہوتا ہے :

حج میں جب تمام مناسک اور ارکان سے فراغت پائی تو ایک دن یہ خیال آیا کہ یہاں سے لوگ خاکِ شفا یا حرم پاک سے کنکریاں چن کر لے جاتے ہیں۔ میں اگر یہاں سے سنگ مرمر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر ساتھ رکھ لوں اور اس پر مدینہ منورہ کے کسی اچھے کاتب سے اپنے مکان کا نام اور سن تعمیر لکھوا کر لے جاؤں ا اسے اپنے زیر تعمیر مکان کے دروازے پر لگوا دوں تو کیسا رہے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سنگ مرمر کا ایک چھ سا ٹکڑا جو ۴ × ۶ سے زیادہ کا نہیں ہوگا' لیا جو باہر حرم کی تعمیر میں آدھے روڑے کی شکل میں لگے رہتے ہیں' اور جب ہندوستان پہنچا تو اس پر وہی مدینہ منورہ کے کاتب کا لکھا ہوا نام اور سن تعمیر کھدوا لیا اور ذاکر صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ میرا وہ مکان جس کا سنگ بنیاد آپ نے رکھا تھا' اب بن کر تیار ہو گیا ہے چاہتا ہوں کہ اس کی رسم اختتام بھی آپ ہی کے ہاتھوں انجام پائے۔ وہ بولے کہ اس رسم کی کیا شکل ہوگی پھر انھیں وہ تمام تفصیل بتائی ' فرمایا کہ اچھا' کسی دن آجاؤں گا۔

اتفاق سے وہ اپنی اور مصروفیتوں میں اسے بھول گئے۔ میں نے چند دن بعد انھیں پھر ٹیلیفون کیا اور ان پی اے سے کہا کہ بھئی صاحب نے چند دنوں بعد جواب دینے کے لئے فرمایا تھا لیکن اب تک کوئی پیغام نہیں ملا۔ ذاکر صاحب اپنے سے فارغ ہوئے تو انھوں نے یاد دلایا۔ بولے' ہاں بھئی یہ بات حافظے سے نکل گئی تھی۔ اچھا ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں سعید انصاری صاحب کو آج ہی بھجوا دیجئے۔ رقعہ میں تاخیر کی معذرت کے بعد یہ لکھا تھا کہ پرسوں حاضر ہو رہا ہوں اور حکم جو ارشاد ہوگا' بجا لاؤں گا۔ اس جواب پر میں پانی پانی ہو گیا۔ اور اس عجلت میں دعوت نامہ وغیرہ چھپوانا تو درکنار' جامعہ مل گیا اس سے زبانی تذکرہ کر دیا۔ شام کے قریب تاج منزل پر کیا دیکھتا ہوں کہ صدر جمہوریہ کی ایک بڑی گاڑی آئی' بغیر کسی قیود کے' اور اترتے ہی پہلے تو مکان دیکھ کر بہت خوش ہوئے' پھر اس کے بعد رسم اختتام کی وہ نوعیت میں نے بتائی۔ سنگ مرمر اسی ٹکڑے کو دیکھ کر پہلے تو اسے بوسہ دیا اور پھر مدینہ منورہ کے اس خطاط کا خط دیکھ کر بہت تعریف کرنے لگے۔ بعد میں سامنے مکان کا ایک چکر لگا کر اسے اپنی جگہ پر نصب کر دیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر تھوڑے سے اکل و شرب کے بعد لوگوں سے کرنے لگے کہ آتے ہیں ان کے لے۔ ڈی سی نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اب تو آپ کا کام ہو گیا؟ اتنے میں انھوں نے بات کو دیکھ لیا۔ بولے' ابھی تو میں اور بیٹھوں گا۔ ایک دن تو ذرا سکون اور اطمینان کا ملا۔ اور ان سرکاری پابندیوں سے وہ بھی نصیب نہیں !

حکیم عبدالاحد

• حکیم عبدالاحد صاحب، پیدائش ۱۹ فروری ۱۹۱۲ء بمقام گھگول (پٹنہ)، ۱۹۳۳ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے عالم، ۱۹۳۷ء میں طبیہ کالج دہلی سے فاضل طب وجراحت کے سند یافتہ۔ گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے پرنسپل، حکومت بہار کے شعبۂ صحت عامہ کی طبی شاخ کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر۔ طب وصحت عامہ سے متعلق ہندوستان کی متعدد کمیٹیوں اور انجمنوں کے ممبر یا صدر رہ چکے ہیں، یا ہیں۔ ان دنوں ملازمت سے ریٹائر ہو کر پرائیوٹ پریکٹس کر رہے ہیں

••

۱۹۲۳ء تک میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں زیرِ تعلیم رہا۔ اس کے بعد طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دلّی قرول باغ پہنچا تو مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کا اثر میرے پر تھا۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہانہ آرگن رسالہ جامعہ پابندی سے پٹنہ میں پڑھا کرتا تھا، اس لیے جامعہ کے ساتھ شیخ الجامعہ کا تصور مجھے یاد تھا۔ نہ معلوم کیوں دلّی پہنچنے کے بعد ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کالج اور جامعہ ملیہ یہ دونوں ادارے ایک ہی محلہ قرول باغ میں واقع تھے۔ کالج پانچ منٹ کا راستہ تھا، میں اکثر جامعہ کی لائبریری میں کتابیں، رسائل اور اخبارات پڑھنے جاتا۔ دہلی کا بورڈ ایک کمرہ پر آویزاں دیکھتا، تو شوق ملاقات میں نئی لہر پیدا ہوتی۔ کئی دنوں کے بعد ایک روز صبح تقریباً ۹ بجے جامعہ پہنچا تو دیکھا دروازہ پر پردہ لٹک رہا ہے اور چپراسی ٹوپی، شیروانی میں ملبوس باہر موجود ہے۔ پتہ چلا کہ وہ تنہا ہیں۔ میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یہ لکھ کر بھیج دیا "طبّی کالج کا ایک طالب شرف ملاقات کے لیے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عبدالاحد بہاری" چند منٹ بعد ہی چپراسی نے پردہ اٹھایا اور میں کمرہ میں داخل ہوا۔ فرش پر سفید کھدّر کی ٹوپی، شیروانی، علیگڑھ کٹ پاجامہ پہنے خوبصورت گورا چٹا جوان، بھر کر سیاہ داڑھی کے چار زانو بیٹھا ہے، سامنے ڈسک پڑی ہے، جس پر لکھنے کا سامان ہے۔ سلام عرض کیا، مصافحہ کیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ انہوں نے مزاج پرسی کی، تعارف کے سوالات کیے، میں جواب دیتا گیا۔ طب پڑھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا یہ ان کا ایک اہم سوال تھا، کیسے آئے؟ یہ دوسرا اہم سوال تھا۔ کوئی کام ہے؟ میں نے جوابات دیے۔ نے شوق اور محنت سے پڑھنے کی تلقین کی ــــــ میں اٹھ کھڑا ہوا، اجازت چاہی، فرمایا پھر آئیے گا۔ ایک گہرا نقش لے کر میں وہاں سے واپس اپنے کالج آیا۔ اُن کی باتیں بار بار یاد آتی رہیں اور میں سوچتا ۱۹۳۸ء تک ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا سلسلہ برابر دلّی میں جاری رہا۔ ایک دن شام کے وقت میں جامعہ ہوسٹل چلا گیا۔ انچارج لیڈی مس فلپس بورن وہاں موجود تھیں۔ میں ہندوستان میں جرمنی سے کا قصہ اور محبت کے ساتھ بچوں کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ بچے انہیں آپا

کے پیارے لفظ سے پکار رہے تھے، وہ بچوں کی خدمت ہنسی خوشی کرنے میں مصروف تھیں، ماں سے زیادہ شفقت بچوں کے ساتھ برت رہی تھیں ـــ ایک روز میں وہاں موجود تھا کہ ذاکر صاحب ٹہلتے ہوئے شام کے وقت وہاں بچوں کے ہوسٹل تشریف لائے، بچے ان سے لپٹ گئے۔ آپا بھی بچوں کے ساتھ تھیں، مجھ سے صاحب سلامت ہوئی۔ بچوں کی دیکھ بھال پر نظر کی، ان کے حالات معلوم کیے۔ ایک بچہ بیمار تھا، اسے دیکھا، مزاج پرسی کی، دوا، علاج کے متعلق دریافت کیا اور واپس چلے گئے۔

• ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں اس وقت گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کا پرنسپل تھا، ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جامعہ کے بعد مسلم یونیورسٹی ان کی تعلیمی دلچسپی کا مرکز تھا۔ یونیورسٹی کے متعلقہ کالجوں کی اصلاح اور ترقی کے منصوبے تیار کرنے میں وہ مصروف تھے۔ یونیورسٹی کے شعبوں سے متعلق ملک کے ماہرین کو اکٹھا کر کے مشورے اور اسکیم حاصل کر رہے تھے۔ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کا مسئلہ جب سامنے آیا تو سب سے پہلے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے ایک پانچ رکنی کمیٹی ترتیب دی جس کے صدر خود رہے، ماہرین فن کی صف میں نہ معلوم کیوں انھوں نے مجھ کو بھی لا کھڑا کیا اور ممبر نامزد کیا۔ اس کی میٹنگ مسلسل تین دنوں علیگڑھ یونیورسٹی میں جاری رہی۔ پہلے دن کی بیٹھک میں انھوں نے کمیٹی بنانے کا مقصد اور ممبروں کو زحمت دینے کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ فن کی تعلیم و ترقی، طلبہ کی زندگی، مریضوں سے ان کا تعلق اور معاشیات کے مسائل وغیرہ بھی کو وہ زیر بحث لائے ـــ روزانہ ۶، ۷ گھنٹے غور، ذکر کے بعد نوٹ تیار کیا جاتا، ڈاکٹر صاحب اکثر اوقات میٹنگ میں شریک رہتے۔ کبھی کبھار یونیورسٹی کے کسی ضروری کام سے معذرت کے ساتھ تشریف لے جاتے اور پھر وقت پر لوٹ آتے، ممبران کام جاری رکھتے اور واپسی پر وہ کاموں کا محاسبہ کرتے ـــ ان تینوں دنوں میں نصاب کا کام تو ہوا ہی، دعوتیں بھی ہوئیں اور آزادانہ گفتگو کا موقع بھی خوب نصیب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے طب یونانی سے بہت دلچسپی لی اور انھوں نے شعبۂ جراحت کی جدید ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آج بھی طب یونانی کی دھاک اپنی جگہ موجود ہے، البتہ مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ شعبۂ معالجات میں طب یونانی کے اثرات کو لوگوں کے لیے بہت مفید بتایا۔ اس سلسلہ میں گھریلو علاج و معالجہ کے واقعات بھی بہت شوق سے سنائے، جس میں بڑی بوڑھیوں کا ذکر بھی آیا جو عام طور پر گاؤں میں اپنے اپنے گھروں میں یونانی دواؤں کی پٹاری رکھتی تھیں اور گھریلو تجربے کی بنا پر روزانہ بیسیوں بچوں کا گھر پر ہی علاج کرتی تھیں۔ اس طرح بچوں کی مائیں علاج کے سلسلہ میں بہت سی پریشانیوں سے گھر بیٹھے نجات حاصل کر لیتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہوتا، وہاں کھانے پر بھی نصاب ہی زیر بحث ہوتا۔ علامہ حکیم محمد کبیر الدین
صاحب بھی اہم ممبر تھے، میں علامہ کے ساتھ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی
کے دولت خانہ پر مقیم تھا، صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ہم لوگ وہیں کھاتے۔ ایک دن ڈاکٹر ذاکر صاحب
ہم لوگوں کی قیامگاہ پر تشریف لے آئے، کچھ دیر ٹھہرے باتیں کیں، آرام تکلیف کا حال پوچھا اور رخصت ہو

● یہ ۱۹۵۷ء ہے، گورنر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب بہار تشریف لائے۔ ۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو انھوں
نے گورنر کے عہدہ کا حلف لیا۔ میں نے ان کو مسرت کے اظہار کے ساتھ مبارک باد کا خط لکھا۔ رانچی سے انھوں
نے ۱۶ جولائی کو میرے خط کا جواب دیا۔

۱۳ جولائی ۱۹۵۷ء کو میری ان سے بہار میں پہلی دفعہ گورنمنٹ ہاؤس میں تقریباً نصف گھنٹہ ملاقات
رہی۔ بہار کے حالات پر مختلف حیثیت سے گفتگو ہوتی رہی، چائے کا دور بھی چلتا رہا اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔
یہ خاص طور پر نوٹ کرنے کی بات ہے کہ انھوں نے جو خطوط اپنے قلم سے خود مجھے لکھے ہیں، لفافہ پر پتہ بھی خود
لکھا ہے، ایسے لفافہ پر ذاتی ٹکٹ استعمال کیا ہے، سرکاری ٹکٹ استعمال نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط
مورخہ ۶ ستمبر ۱۹۵۷ء ہے جو انھوں نے گورنمنٹ ہاؤس پٹنہ سے مجھے بھیجا۔ اس لفافہ پر بھی ذاتی ٹکٹ چسپاں ہے۔
اس طرح کے پانچ خطوط جو دستیاب ہیں، گورنر، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہندوستان کی حیثیت سے انھوں
نے مجھے لکھے ہیں جن پر پرائیوٹ ٹکٹ لگے ہیں۔

۱۹۵۷ء کے ماہ اگست میں مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب ایڈیٹر صدق جدید، پٹنہ میں گورنر ڈاکٹر
ذاکر حسین صاحب کے مہمان خصوصی تھے۔ ۴ تاریخ تھی، یکشنبہ کا دن تھا، ڈاکٹر صاحب نے نہایت محبت سے مجھے
فرمایا کہ حکیم صاحب آج شب کے وقت آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ظاہر ہے انکار کا
کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں مولانا عبدالماجد صاحب کے ساتھ ہی نالندہ، راجگیر اور بہار شریف کے سفر سے شب
میں واپس آیا تھا۔ ملاقات کے بڑے کمرہ میں ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اصل بات اور چھیڑ چھاڑ تو مولانا
سے ہو رہی تھی، میں تو صرف سننے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ کھانا لگ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو اور مجھے
کھانا کھانے کی طرف متوجہ کیا اور معذرت کی کہ مجھے افسوس ہے کہ میں کھانے میں آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا،
آج میرے صرف پھلوں پر گذارہ کرنے کا دن ہے۔ پاس ہی صوفہ پر بیٹھ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے گفتگو اور کھانے
کی نذر ہو گئے۔ خدا بخش خاں لائبریری، دلیپ لائبریری کا ذکر بھی تفصیل سے آیا، دلّی کے ہنگامہ خیز فسادات

انسانیت کا خونی ڈرامہ اور ریفوجیوں کی بے پناہیوں کا ذکر بھی آیا ـــ انسان پر انسان کا ظلم کس کس طریقے سے ہوا، اس کا بھی ذکر بہت افسوس کے ساتھ ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی پرانا قلعہ ریفوجی کیمپ میں تشریف لے گئے تھے، اس کا بھی ذکر حسرت و افسوس کے ساتھ انہوں نے کیا ـــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت رو رو کر انسانوں سے پناہ مانگ رہی ہے۔

اسی زمانے میں کسی سرکاری جماعت نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے اسٹرائیک کر دی تھی۔ بات چھڑ گئی، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، اسٹرائیک کے طریقے اور زبردستی کسی مطالبے کو منوانے کے لیے کسی جماعت کا سرکاری کاموں کو چھوڑ کر جد و جہد کرنا اپنی حکومت میں مناسب نہیں معلوم ہوتا ـــ دوسرے حکومت کو بھی چاہیے کہ ان کے مطالبات پر غور کرے، اگر صحیح اور جائز ہیں تو ان کے مانگنے سے قبل ان کو ملنا چاہیئے اور اگر ناقابل قبول ہیں تو کسی قیمت پر جھکنا نہیں چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب مخدوم شاہ شرف الدین یحییٰ منیری اور دوسرے بہار کے بزرگوں کے حالات جاننا چاہتے تھے۔ میں نے ان کو اس سلسلہ کی کئی کتابیں بھیجی تھیں۔ ان کا تذکرہ بھی ڈاکٹر صاحب کے ایک خط میں موجود ہے۔

۵ اگست ۱۹۵۷ء کو مولانا عبد الماجد دریابادی صاحب کا دسنہ لائبریری دیکھنے اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی قبر پر حاضری کا پروگرام تھا۔ مولانا کی خواہش کے مطابق ہمسفری کے لیے میں صبح ۸ بجے گورنمنٹ ہاؤس پہنچ چکا تھا، مولانا تیار ہو کر۔ روانگی کے لیے اوپر قیام گاہ سے نیچے آئے، ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ ہی نیچے تشریف لائے، میں بھی ساتھ تھا، موٹر میں بڑا سا توشہ دان رکھا گیا، گورنر صاحب نے فرمایا کہ یہ اتفاقیہ ضرورت کے لئے ہے۔ تاکہ وقت پر کام آئے۔ کوٹھی کی دہلیز تک تشریف لائے اور رکتے ہوئے خدا حافظ کہا اور بولے "یہ میری آخری حد ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتا"۔ ڈاکٹر صاحب دہلیز پر کھڑے رہے اور ہم لوگ سلام بجا لاتے ہوئے کار پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ یہ تھی ذاکر صاحب کی عظمت ـــ اور مولانا کے ساتھ ان کا مخلصانہ برتاؤ ـــ اور ان کے دل میں مولانا کا وقار!

۲ فروری ۱۹۵۹ء کو حکیم اجمل خاں ڈے، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے وسیع میدان میں انجمن اطباء صوبہ بہار کی جانب سے بہت ہی شاندار طریقہ پر منایا گیا۔ کئی وزراء، شاہ عزیز منعمی، بیرچند پٹیل، افسران، وکلاء، معززین شہر، اخبارات کے ایڈیٹر، نامہ نگار حضرات کے علاوہ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ عظیم پنڈال کافی۔ حکیم اجمل خاں کے علاوہ یہ اُن کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جلسہ کا افتتاح فرمایا۔ اس افتتاح

کے سلسلہ میں جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے بخوشی رضامندی ظاہر کی اور فرمایا: "حکیم اجمل خاں غیر معمولی انسان تھے، ان کی یاد، ان کی شایانِ شان منانا چاہیے"۔ بعد کی ملاقات میں انھوں نے جلسہ کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ایک گھنٹہ پُراثر تقریر کی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے احسانات ان کے کارنامے، قومی خدمات، جامعہ ملیہ میں ان کا خصوصی تعاون، شریف منزل میں بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے جلسے اور وقت کے ملکی مسائل کا حل، طب یونانی کے مسائل اور طبی علاج کی کامیابی پر روشنی ڈالتے ہوئے گورنمنٹ طبی کالج کی ضروریات پر بھی انھوں نے ایک نظر ڈالی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک موقعہ پہ فرمایا کہ زندگی' وقت کی پابندی کے ساتھ جدوجہد کا دوسرا نام ہے وہ بجا طور پر فرماتے تھے کہ گھڑی اگر وقت کی پابندی چھوڑ دے، تو آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں یا نہیں!۔ اگر آپ وقت کی پابندی نہیں کر سکتے ـــ تو وقت آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا، اس لیے پوری مستعدی کے ساتھ وقت کی پابندی کیجیے۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں تو بہت بار ہوئیں، مگر ایک اور ملاقات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۶۴ء، فروری کی ۲۰ تاریخ ہے۔ وہ نائب صدر جمہوریہ ہیں، دلی میں مولانا آزاد روڈ پر سرکاری قیامگاہ پر مقیم ہیں، ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ½۱۲ بجے دن کے وقت حاضری ہوئی۔ فوراً ہی بلایا، کھڑے ہو گئے ملے، بولے میں انتظار کر رہا تھا۔ ایک گھنٹہ اطمینان سے باتیں ہوتی رہیں، بہار کے خاص خاص لوگوں کا فرداً فرداً خیریت پوچھی، خدا بخش لائبریری کا حال پوچھا، طبیہ کالج کی ترقیوں میں پیش رفت پر بھی گفتگو ہوئی۔ ناشتہ اور چائے بھی پینی پڑی، تب کہیں چھٹکارا ہوا۔ اور واپسی کی اجازت ملی، کھڑے ہو کر رخصت کیا۔

اونل ڈے

• جناب اونل ڈے : پیدائش ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء بمقام پٹنہ۔ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما کے اسوسیٹ سکریٹری رہے۔ آپ تعلیمی اور ثقافتی میدان کے سرگرم کارکن اور ریڈیکل ہیومنسٹ رہے۔ ایم این رائے کے شیدائی اور عزیز چیلے ہیں اور جنگ آزادی کے مجاہد رہے ہیں۔ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور تھیٹر کے ماہر ہیں۔

••

میرے فاضل دوست ڈاکٹر بیدار، ڈائرکٹر خدابخش لائبریری نے مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے
میں اپنی یادوں کو ریکارڈ کروانے کی فرمائش کی ہے۔ میں نے پہلو تہی کی کوشش کی۔ کیونکہ واحد متکلم کا بکثرت
استعمال جو ایسی یادوں میں ناگزیر ہو جاتا ہے، میری نظر میں مناسب نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین
اور میرے درمیان کافی عرصہ پہلے جو بھی معاملات ہوئے اس کا نہ کوئی شاہد ہے نہ ثبوت۔ تاہم، چونکہ ڈاکٹر
بیدار میری طرف سے منفی جواب سننے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اس لئے ان کی دوستی کی قدر کرتے ہوئے انکا
۵۷ - ۱۹۶۱ء کا درمیانی عرصہ میری زندگی میں بہت ہی سبق آموز، معلوماتی اور پُر لطف گزرا ہے
اس دوران مجھے سابق گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اسکالر اور انسان دوست سے قربت کا موقع ملا۔
اس موضوع کی وضاحت کے لئے میں اس پس منظر کو بیان کردوں جس میں مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین سے
متعارف ہونے، ان کے قریب جانے اور ان کی شفقت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ادب، موسیقی، رقص، ڈراما اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدان میں ثقافتی سرگرمیوں میں میں
۱۹۴۲ء سے ہی سرگرم رہا ہوں۔ "آرٹس اینڈ آرٹسٹ" نام کی ایک ثقافتی سوسائٹی ہم لوگوں نے قائم کی تھی
۱۹۵۱ء میں "بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما" صوبائی حکومت کی سرپرستی میں معرض وجود میں آئی
اور اس کے اگزکیوٹیو بورڈ کی رکنیت کے لئے مجھے بھی منتخب کیا گیا۔ اس کے دستور کے مطابق گورنر بہار اس
اکاڈمی کے صدر ہوئے۔ ۵۷-۱۹۵۶ء میں میری تقرری ایسوسی ایٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہوئی۔ ڈپٹی ڈائرکٹر
آف ایجوکیشن بہار، سکریٹری تھے۔ اگزکیوٹیو بورڈ کے نائب صدر اور چیرمین پٹنہ ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس
مسٹر جسٹس ایس۔ کے داس تھے۔ ۱۹۵۷ء میں سپریم کورٹ میں بحیثیت جج اپنی تقرری ہونے کی بنا پر جب انھوں نے
استعفیٰ دیا تو سلطان احمد نے کرسئ صدارت کو زینت بخشی۔ اسوسیئیٹ سکریٹری ہونے کے ناتے معمول کے مطابق
آفس کا نظام چلانے کے علاوہ تمام سرگرمیوں کی ذمہ داری جس میں منصوبہ بندی سے لے کر اس کی تعمیل کا کام بھی
شامل تھا میرے ہی سپرد تھی۔ سارے مشوروں اور تجاویز کے ساتھ فائلوں کی تیاری مجھے ہی کرنی پڑتی تھی اور ان

فائلوں کو چیرمین مسٹر سلطان احمد کے سامنے ان کی رائے کے لئے پیش کرنا پڑتا تھا۔ مسٹر سلطان احمد نے بارہا ان فائلوں کو اپنی رائے کے ساتھ دے کر مجھے صدر کے پاس بھیجا تاکہ وضاحت طلب باتوں کی وضاحت اور صدر کے سوالوں کا جواب دے سکوں اور اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ میرے تعلقات باضابطہ طور پر قائم ہوئے۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو کئی بار اس ڈرامے اور رقص کو دیکھنے کی دعوت دی جو میری ہدایت میں پیش کئے گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت سے ڈراموں کو اسٹیج پر دیکھا، انہیں سراہا اور میری ہدایت کاری کی تعریف بھی کی۔

اگرچہ پہلی ملاقات سے ہی انھوں نے کوئی امتیاز نہیں برتا اور برابری کا ہی سلوک کیا، لیکن ایک دو ملاقات کے بعد تو مجھ سے کھُل کر ملنے لگے اور منصبی کام کے بعد بے تکلفانہ گفتگو کے لئے مجھے روک لیتے۔ ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتیں ایسی ہوئیں جو یاد رکھنے کے قابل تھیں اور ان کی روشن خیالی کا بیّن ثبوت بھی انھیں ٹیپ کرنے کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے ذاکر حسین کی بہت سی عالمانہ گفتگوئیں میرے ذہن سے نکل گئی ہیں۔ جو چند باتیں یاد رہ گئی ہیں، انھیں دہرا رہا ہوں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق قابلِ ذکر جو پہلی چیز ہے، وہ یہ ہے کہ ان پانچ برسوں کی طویل مدت کے دوران میں نے انھیں کبھی تاخیر سے آتے نہیں دیکھا، چاہے وہ راج بھون ہو یا راج بھون سے باہر کوئی جگہ۔ اسٹیج پر ڈراما پیش کرتے وقت ہم لوگوں کو ہردم چوکس رہنا پڑتا تھا کہ کھیل وقت پر شروع ہو جائے اور راجیہ پال کو آڈیٹوریم میں انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جب کبھی بھی انھیں کسی ڈرامے کے افتتاح کے لئے بلایا گیا تو وہ کبھی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بولے۔ جب میں نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کرنے کی جرأت کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ناظرین یہاں فن کارانہ کھیل دیکھنے کی امید لے کر آتے ہیں، ہم جیسے بوڑھے آدمی کی بھونڈی تقریر سننے کے لئے نہیں۔ لیکن جب کبھی بھی ناظرین کے علم میں کوئی بات لانے کی ضرورت انھوں نے محسوس کی تو انھوں نے اس موضوع پر بصیرت افروز تقریر کی۔

ایک دفعہ جب میں ان سے ملنے راج بھون گیا تو انھیں بہت ہی افسردہ اور مغموم پایا۔ جب انھوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا تو کسی قدر پس و پیش کے بعد میں نے ان کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ جسمانی طور پر بہت ٹھیک ہوں لیکن ذہنی طور پر افسردہ ہوں۔ ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ کیا کہنا یا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد گویا ہوئے اور کہا، جانتے ہو آج؟ آج مجھے اپنی زندگی کا ایک عظیم صدمہ پہنچا ہے۔ میں ایک مقامی بنیادی ٹریننگ اسکول دیکھنے گیا۔ پرنسپل

مجھے سب جگہ لے گئے اور وہ تمام چیزیں دکھائیں، جو دیکھنے کے لائق تھیں۔ جب معائنہ ختم ہوا، تو میں گاڑی پر سو
ہونے لگا تو ایک شخص ٹوکری بھر تازہ سبزی لے کر آیا اور پرنسپل نے جو مجھے رخصت کرنے آئے تھے مسکراتے ہو
ڈرائیور کو کار کا بوٹ کھولنے کو کہا۔ میں نے متحیر ہو کر پوچھا کہ سبزیاں کہاں سے آئی ہیں۔ پرنسپل نے بڑے فخریہ اند
میں کہا کہ یہ سبزیاں زراعت میں تربیت پانے والے طلبا کی محنت کا پھل ہیں اور میرے لئے ہیں۔ میں ششد
رہ گیا اور یقین مانو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں صرف اُن سے اتنا کہہ سکا کہ سبزیوں کو واپس لے
اور فروخت کے لئے بازار بھیج دیں۔ یہ کہکر میں گاڑی میں بیٹھا اور بھاگم بھاگ کر واپس آگیا۔" وہ تھوڑی
خاموش رہے اور پھر کہا " مہاتما کے ایما پر میں نے اپنے بچوں کے لئے ملک کی غربت کے شایان شان ایسی تعل
منصوبہ پیش کیا تھا جس کا بنیادی تصور ہی یہ تھا کہ تعلیمی اخراجات کا بوجھ ملک یا والدین کے بجائے خود طالب علم
شانے پر ہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب طالب علموں کو اسکول میں ہی دستکاری، زراعت وغیرہ کے ذ
قابل فروخت اشیاء پیدا کرنے کی اور انھیں بازاروں میں فروخت کرنے کی تعلیم دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جا
ایسی تربیت طالب علموں کو نوکری کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور معاشی طور پر خود کفیل
بننے میں مدد دے گی۔ یہ پیداوار اپنے سے اوپر والوں کو محض خوش کرنے کے لئے تحفتاً دینے کی نہیں تھیں۔ یہ حرک
بنیادی تعلیم کے تصور کی ہی ضد اور ہماری قدیم زمیندارانہ ذہنیت کی پرانی عادت ہیں۔ اور تو اور خود پرنسپل
صاحب جو بنیادی ٹریننگ اسکول کے سربراہ ہیں اس سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔"

ایک دوسرے موقع پر جب ہماری گفتگو کا موضوع ملک کے فرقہ وارانہ تناؤ کی طرف مڑا تو ڈاکٹر ذاکر
حسین نے فرمایا کہ " اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے مفسرین اپنے صحیفوں سے پوری طرح واقف نہیں
ہیں اور انھوں نے خود اپنے مذہب کی اصل اسباب اصل، ارتقا اور بنیادی اصولوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ دوسرے کے
نظریے، خیالات اور عقاید کا احترام، پرستش کے طریقے، امن اور اتحاد صرف ہندو مذہب کے نہیں بلکہ اسلام
کے بھی بنیادی اصول ہیں اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ بعید میں ہندو مذہب "آرچ بھٹ" اور اسلام الغ بیگ
جیسے لوگ پیدا کر سکا اور یہ سبق انھوں نے نام نہاد مذہبی رہنماؤں سے نہیں سیکھے تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا وجہ ہے بہت دنوں سے "آرٹس اور آرٹسٹ" نے کوئی ڈراما یا
رقص نہیں پیش کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ چونکہ سبھی ایسے ادارے خسارے میں چلتے ہیں اس لئے "آرٹس اینڈ
آرٹسٹ" مالی مشکلات سے دوچار ہے اور اس لئے خاموش رہنے پر مجبور ہے۔ ایک یا دو مہینوں کے بعد آرٹس

...ینڈ آرٹسٹ' کو صوبائی حکومت کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے پانچ ہزار روپے ایڈہاک گرانٹ کی شکل میں ملے۔ جب ... ہم لوگوں نے محکمۂ تعلیم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ راجیہ پال نے وزیر تعلیم سے اس بارے میں گفتگو کی تھی ... یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کو یہ رقم دی جائے۔

۱۹۶۱ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی برسی کے موقع پر ٹیگور کا ڈانس ڈراما "چترا کمار سبھا" ریاستی محکمۂ تعلیم ... کے ذریعہ پیش کردہ ٹیگور ڈراما، بھاؤ سنگر پداولی میں شرکت کے علاوہ 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' نے میری ہدایت کاری ... میں خود پیش کیا، جو ہندوستان کی چند بہترین کامیڈیوں میں ہے۔ اس ڈرامے میں میں نے بھی ایک اہم کردار ادا ... کیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ڈرامے کے افتتاح کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچے، ایک جملہ کے ... ساتھ افتتاح کیا اور ان کے بیٹھتے ہی ہم لوگوں نے ڈراما فوراً شروع کر دیا۔ ان کے ملٹری سکریٹری، شاید میجر ... سند اور گر نے (ان دنوں گورنر کا ملٹری سکریٹری ہوا کرتا تھا) علٰحدہ سے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق گورنر ... ہر روز ٹھیک ۸ بجے کھانا کھا لینا چاہیے، اس لئے ہمیں ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ ٹھیک ۷ بجکر ۴۵ منٹ پر گورنر ... رخصت ہو سکیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور کہا کہ ٹھیک پونے آٹھ بجے پردہ گر جائے گا، چاہے اس وقت کسی سین کا درمیان ... کیوں نہ ہو اور ہال کی بتیاں روشن کر دی جائیں گی تاکہ گورنر ہال سے باہر نکل سکیں۔ ساڑھے سات بجے میں نے ... ایک اہم رکن کو ہال میں ملٹری سکریٹری کو یہ خبر دینے کے لئے بھیجا کہ ٹھیک پونے آٹھ بجے پردہ گرا دینے کے لئے ... تیار ہیں لیکن مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ ڈراما دیکھنے میں گورنر اس طرح مستغرق ہیں کہ کھیل کے آخر تک وہاں ٹھہرنے ... کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں۔ گورنر وہاں مستقل موجود رہے اور اس وقت گئے جب کھیل ساڑھے نو بجے ختم ہوا۔

ہال میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ گزرا۔ ڈراما بنگالی زبان میں تھا۔ سامنے کی صف میں 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کے ... سابق صدر شری مہابیر پرشاد، ایڈووکیٹ جنرل آف بہار، گورنر کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف ... حکومت بہار کے ایک بنگالی افسر اعلیٰ کی بیوی بیٹھ گئیں۔ جیسے ہی کھیل شروع ہوا۔ وہ خاتون موصوف خود سے مترجم ... بن بیٹھیں اور بنگالی مکالموں کا انگریزی ترجمہ سرگوشیوں میں کرتی گئیں۔ اس غیر ضروری مداخلت کو کچھ دیر برداشت ... کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاتون کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے بہت نرمی کے ساتھ کہا کہ وہ یہ تکلیف نہ ... فرمائیں کیونکہ وہ خود اس ڈرامے کو متعدد بار پڑھ چکے ہیں اور مکالموں کو سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت ... محسوس نہیں کر رہے ہیں (یہ بات مجھے 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کے صدر نے بتائی)۔

۱۹۶۱ء کے آخری نصف سے محکمۂ تعلیم میں صوبائی حکومت کے انتظامیہ کا دیہ بہار اکیڈمی آف میوزک'

ڈانس اینڈ ڈراما" کے تئیں کچھ عجیب سا ہو گیا۔ اگرچہ ایجوکیشن سکریٹری اور ڈی پی آئی دونوں اگزیکیوٹیو
رکن (بلحاظ عہدہ) تھے اور ڈی۔ ڈی۔ پی۔ آئی سکریٹری (بہ لحاظ منصب) ہونے کے ناتے بورڈ کی ساری
کرتا تھا۔ سکریٹری اور ڈی۔ پی۔ آئی نے میٹنگ میں شریک ہونا بند کر دیا۔ ساری اہم فائلیں جو محکمہ میں بھی
وہیں روک لی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ چیرمین، سلطان احمد کے خطوط بھی بغیر جواب دیئے اور بغیر
لے جاتے تھے۔

ایسے حالات میں میں نے ایک مرتبہ اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کے سامنے اس معاملہ کو اٹھا
جرأت کی —— یہ کہتے ہوئے کہ جب انھوں نے اتنی مہربانی اپنی طرف سے کی کہ بغیر مانگے ہوئے وزیر
اکیڈمی کے بارے میں بات کی اور اسے ایک قابل قدر رقم بطور گرانٹ دلوائی تو کیا وہ وزیر تعلیم سے اکیڈمی
معاملوں میں ذاتی طور پر زیادہ دلچسپی لینے کی سفارش نہیں کر سکتے اور خصوصاً سلطان کی طرف محکمہ تعلیم
سلوک کو ختم نہیں کرا سکتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت ہی رقت انگیز طور پر مسکراتے ہوئے کہا "کیا تم
نے ایسا نہیں کیا ہے" اور پھر بولے "میں نے وزیر تعلیم کو اکیڈمی کی عمدہ اور مفید سرگرمیوں کی طرف توجہ
اور ان سے اس معاملے میں ذاتی طور سے مداخلت کرنے کی گذارش کی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ایک بوڑھے
جب وہ ریٹائر ہونے والا ہے، کے مشورے کے بہ نسبت انہیں اپنے محکمے کے افسروں کے مشوروں پر زیادہ اعتماد
دیر کے بعد انھوں نے مزید کہا "اگر میں اور زیادہ زور دیتا تو صوبہ میں سیاسی بحران پیدا کرنا پڑتا۔ کیا تمہارے
میں وہ انتہائی بدقسمتی نہ ہوتی؟" میں فوراً ان سے متفق ہو گیا۔

اگرچہ موضوع سے مناسبت نہیں ہے لیکن میں یہاں عرض کر دوں کہ کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین
منصب گورنری کے اختتام کے ساتھ ہی شائد صوبائی حکومت نے 'بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما'
معتدر ادارے کو بند کر دیا، جسے خود تو حکومت نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا اور اس کی جگہ بورڈ آف کلچرل
کا ایک شاخ کے طور پر ۱۹۶۱ء کے آخر میں یا ۱۹۶۲ء کے شروع قائم کر دیا۔ یہ بورڈ اپنے چند سالہ وجود کے دوران
میں کوئی ایسا مفید کام نہ کر سکا اور بالآخر اپنی موت آپ مر گیا۔ اس سے جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے
ڈراما اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدان میں سرگرمیاں، ثقافت کو دوبارہ زندگی بخشنے میں صرف اسی وقت
ہو سکتی ہیں جب انھیں سرکاری افسروں کے ہاتھوں سے بچا کر رکھا جائے۔

حکیم ظلّ الرحمٰن

• حکیم ظلّ الرحمٰن صاحب: پیدائش یکم جولائی ۱۹۴۰ء بمقام بھوپال۔ دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ اور اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ۔ جامعہ طبیہ دہلی کے سابق لکچرر اور لٹریری طبی ریسرچ یونٹ علی گڑھ کے سابق ریسرچ آفیسر، جنوری ۱۹۷۳ء میں اجمل خاں طبیہ کالج علیگڈھ کے شعبۂ علم الادویہ میں بحیثیت ریڈر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۸ء سے صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مجلّہ 'الحکمت' دہلی کے سابق ایڈیٹر اور طبیہ کالج میگزین شیخ الرئیس نمبر ۱۹۵۸ء کے مرتب ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں 'دورِ جدید اور طب' ' تاریخ علم تشریح'، 'علم الامراض'، 'تجدید طب'، 'رسالہ جودیہ'، 'بیاض وحیدی'، 'مکتوب معتش'، 'تذکرہ خاندان عزیزی'، 'کتاب المرکبات'، 'حیات کرم حسین'، 'صفوی عہد میں علم تشریح کا مطالعہ (زیر طبع)' اور 'قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین' (زیر طبع) قابل ذکر ہیں۔ مزید برآں ۴۵ سے اوپر تحقیقی مضامین ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

••

شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی بھوائی ٹولہ لکھنؤ (علیگڑھ طبیہ کالج کے پرنسپل) اپنے علم و فضل، باغ و بہار شخصیت اور حسن معالجہ کی وجہ سے جلدی ہی یونیورسٹی کے حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ علی گڑھ میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ذاکر صاحب، سلیمان اشرف، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید قریشی، حمید الدین خاں، حاذق صاحب، اکرام اللہ خاں، عزالدین صاحب، حفیظ الرحمٰن صاحب ان کے مخصوص دوستوں میں تھے۔ ذاکر صاحب کے خطوط سے ان کے بے تکلفانہ تعلقات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں دل کی باتیں ہیں، سرگوشیاں ہیں اور شخصیت کے بعض وہ پہلو ہیں جو شاید دوسر ذریعہ سے سامنے نہ آسکیں۔

جامعہ طبیہ کے کتب خانہ میں شیخ الرئیس کی کتاب الادویۃ القلبیہ کا ایک اہم نسخہ تھا۔ ذاکر صاحب حکیم صاحب سے اس کے ترجمہ و اشاعت کی خواہش کی۔ حکیم صاحب نے رام پور اور پٹنہ کے نسخوں کے علاوہ استنبول کے مطبوعہ نسخہ سے موازنہ و تصحیح کے بعد اس کے ترجمہ کا کام انجام دیا اور ایک بیش قدر مقدمہ تحریر کیا۔ یہ کتاب ایران سوسائٹی کلکتہ سے طبع ہوئی ہے۔

۱۹۶۲ء میں شملہ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اجلاس میں ذاکر صاحب کی شرکت اور ان کے ہاتھوں کانفرنس کا افتتاح، حکیم صاحب سے ذاتی تعلق کے علاوہ طب یونانی سے ان کے شغف کا آئینہ دار ہے۔

ذاکر صاحب کے زمانہ صدارت میں تکمیل الطب کالج کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ تحریک ہوئی کہ اسے حکومت اپنی تحویل میں لے لے۔ اس وقت یو پی میں گورنر راج تھا۔ حکیم صاحب، ذاکر صاحب سے ملنے گئے، تکمیل الطب کے سلسلہ میں ان سے کہنا چاہتے تھے، مگر آخر وقت تک نہیں کہہ سکے۔ جب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے تو حکیم صاحب نے روئداد بیان کی اور کہا ذات کا نہیں ادارہ کا مسئلہ ہے اگر آپ کچھ کر سکیں تو شاید نتیجہ خیز ہو۔ ذاکر صاحب نے کاغذات مانگے، حکیم صاحب نے کہا وہ باہر موٹر میں ہیں۔ میں تذبذب میں تھا اس لئے یہاں نہیں لایا۔ ذاکر صاحب نے کہا اسحٰق آپ کو موٹر تک چھوڑنے جائے گا، اسے یہ کاغذات دے دیجئے اور پھر ذاکر صاحب کی کوشش سے اسوقت کالج کا یہ مسئلہ ختم ہو گیا۔

ذاکر صاحب نے شاہ سعود کی دعوت پر اگرچہ سعودی عرب کا دورہ کیا تھا اور انہیں عمرہ کی سعادت ملی بھی لیکن حج کا شوق دامنگیر تھا۔ حکیم صاحب نے قلبی دورہ کے بعد ایک روز ان سے کہا کہ سفر حج میں اب آپ کا ساتھ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ عارضہ قلب کی وجہ سے جو احتیاطیں آپ اختیار کریں گے میں بھی ان میں شریک ہو سکوں گا۔

حکیم صاحب نے شخصیات پر نہیں لکھا ہے۔ وہ ذاکر صاحب پر بھی نہیں لکھتے۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب صدق میں ان کے انتقال کے بعد بھی معترضانہ مضمون لکھا تو حکیم صاحب نے مدیر صدق کا حوالہ دیے بغیر ذاکر صاحب کی شخصیت اور ان کی خوبیوں پر اس انداز میں روشنی ڈالی کہ مولانا کے محاسبہ کا جواب اس میں آگیا۔

• ذاکر صاحب مشرقی تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت، مروت، حسن اخلاق، ایفائے عہد اور استقامت ان کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ ذاکر صاحب کو حکیم اجمل خاں کی سرپرستی اور تربیت حاصل رہی۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے انسانیت اجمل خاں سے سیکھی ہے۔ اجمل خاں انسانیت کی بلند ترین منزل پر فائز تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ سے ایک مرتبہ میں اپنے دوست ڈاکٹر اختشام احمد ندوی سے ملنے جامعہ ملیہ گیا۔ رات کو ۸ بجے کے قریب ہم لوگ کالج ہوسٹل سے ثانوی درس گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک کار قریب آکر رکی۔ دیکھا تو ذاکر صاحب تھے۔ کہنے لگے اگر آپ علی گڑھ جا رہے ہوں تو بیٹھ جائیے۔ میں نے عرض کیا آج ہی علیگڑھ سے آیا ہوں۔ فرمایا کیا مولانا اسلم جیراجپوری کو دیکھنے جا رہے ہیں، وہاں نہ جائیے گا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اور پھر اسی شب مولانا جیراجپوری کی وفات کی اطلاع ملی۔

• علی گڑھ میں نئے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ جتنی دوستیاں کرنی ہوں اب کر لیجئے یہی دوستیاں بڑھاپے تک باقی رہیں گی۔ اس وقت آپ جس سے ملتے ہیں بے غرض ملتے ہیں اور جو آپ کے پاس آتا ہے وہ محض دوستی کی خاطر آتا ہے۔ طالب علمی کے بعد آپ جس کے پاس جائیں گے کسی کام سے جائیں گے اور آپ کے پاس جو آئے گا وہ کسی مقصد سے آئے گا۔ آپ کو زحمت کا سبب اور اپنے لائق خدمت معلوم کرنی ہوگی اور اگر آپ دریافت نہیں کریں گے تو وہ محسوس کرے گا کہ میں گیا اور مجھ سے کام کا معلوم نہیں کیا۔ اگر وہ پہلی مرتبہ کام نہیں بتائے گا تو یہ آمد آئندہ کام کی تمہید ہوگی۔ لیکن اگر یہاں کسی کمرہ میں آنے والے ساتھی سے آمد کی وجہ اور اپنے لائق کوئی خدمت دریافت کرلی تو وہ خفا ہو جائے گا۔ یہ ہے بڑا بنیادی فرق جو اس وقت کے تعلقات اور بعد کے تعلقات میں ہوتا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ علی گڑھ میں مختلف علاقوں اور مختلف تہذیب و معاشرت کے طلبا کی موجودگی سے جہاں ہندوستان کے مختلف رسوم و رواج کو سمجھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے وہاں ان مختلف عادات خصائل کے لوگوں کے درمیان زندگی گزارنے کا سلیقہ اور ان سے نباہ کا ڈھنگ بھی پیدا ہوتا ہے، اسی لیے ایک کمرہ میں ایک ہی جگہ کے طلبا کو نہیں رہنا چاہیے۔

● مجھے ان کی خدمت میں نائب صدر کے زمانہ میں دو مرتبہ اور صدارت کے زمانہ میں ایک مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور ہر مرتبہ ان کی کریم النفسی اور علو مرتبہ کا گہرا نقش لے کر واپس ہوا۔ حکیم صاحب کو اطلاع ملی کہ انھیں اس سال خطاب ملنے والا ہے۔ پدم شری کا خطاب وہ نہیں چاہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انھیں حکومت برطانیہ کی طرف سے شفاء الملک کا جو خطاب ملا تھا وہ ان کے خیال میں اس سے زیادہ حیثیت کا تھا۔ پدم شری کا خطاب رشید صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کو مل چکا تھا اور اسی سال نرگس بھی اسی خطاب سے نوازی گئی تھیں۔ حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ منع کرنے سے ذاکر صاحب کا ذہن رشید صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اس لئے بہت خوبصورت انداز میں انھیں لکھا کہ "نرگسی خطاب سے باز رکھا جاؤں" اور یہ خط انھوں نے مجھے دہلی بھجوایا کہ میں خود ذاکر صاحب تک پہنچاؤں۔ ذاکر صاحب ان دنوں نائب صدر تھے۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا، پہلے سے کوئی وقت مقرر کرائے بغیر اسحق کے ذریعہ فوراً ملاقات ہو گئی۔ خط پڑھا، مسکرائے اور [illegible]

حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ رشید صاحب کو پدم شری کے خطاب کی وجہ سے ذاکر صاحب سے شکایت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا تھا اور وہ صرف پدم شری ٹھہرائے گئے تھے۔ رشید صاحب کو اس سے قبل ایک قریب ترین عزیز کی سفارش کے سلسلے میں بھی شکایت ہو گئی تھی۔

● ذاکر صاحب علیگڑھ سے بہار کے گورنر ہو کر گئے۔ وہ علی گڑھ سے خوش نہیں گئے تھے۔ لیکن اس کے فوراً بعد یونین کی جبلی تقریبات منائی گئیں۔ ذاکر صاحب کو دعوت دی گئی۔ خوشدلی سے تشریف لائے اور [illegible] کی۔ جگر صاحب بھی مشاعرہ میں آئے تھے۔ یونین کے سامنے کے دروازہ سے نکل کر جب کار کی طرف چلے تو اس وقت [illegible] یونین اور طلبا کے علاوہ وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی بھی تھے۔ لیکن جیسے ہی کار کے قریب پہنچے ذاکر صاحب نے جو اس وقت علی گڑھ میں خود بطور مہمان تھے، فوراً آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور جگر صاحب سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ ہم لوگوں کے لئے یہ حیرت و استعجاب کا منظر تھا!

سیّد نقی احمد ارشادؔ

سید نقی احمد ارشاد ، والد کا نام سید حسین
ن شاد عظیم آبادی، والدہ کا نام حُسن آرا بیگم بنت میر
رحسین نبیرۂ میر جان صاحب جن کے نام سے بھاگل پور
یر جان ہاٹ ہے۔ سالِ پیدائش ۵ جولائی ۱۹۲۰ء۔
۱۹ء میں بی اے آنرس درجۂ اوّل کے بعد تاریخ میں
اے کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۸ء تک صوبائی سول سروس
رہے۔ ۱۹۷۰ء میں اے۔ ڈی۔ ام اور ۱۹۷۷ء میں
ٹنٹ سکریٹری ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں پنشن پائی۔ کئی
بوں کے مصنّف، مؤلف یا مترجم ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور کچھ
مطبوعہ ہیں۔ مطبوعات میں سے چند کے نام یہ ہیں:
اد عظیم آبادی: کلام اور شرح کلام، شاد عظیم آبادی
مثنویاں، شاد کا عہد اور فن۔

●●

۵۹-۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی مرحوم "شاد کی کہانی" مرتب کر
مرحوم کے اکثر خطوط موضع کاکو سے مدھوبنی میرے نام کے آتے تھے۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ڈاکٹر
مرحوم سے وہ مل چکے ہیں اور ان کی کوشش سے یہ کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کرے گی۔ بہار میں آنے
مجھے معلوم تھا کہ ذاکر حسین صاحب مرحوم عرصہ دراز تک جامعہ ملیہ دہلی سے وابستہ تھے۔ شاید ایک یاد
ان کے قدیم پرچوں میں بھی میری نظر سے گذرے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصہ تک پروفیسر محمد
جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، یہ ۲۲-۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ شاید ان سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
ذاتی ملاقات ہو۔

مسلم صاحب مرحوم نے اثبات میں جواب دیا کہ سید محمد محسنی بیدی جو
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لائبریرین تھے ان سے مسلم صاحب کی ذاتی ملاقات تھی اور سید محمد صاحب سے ذاکر حسین
کافی ارتباط تھے۔ چنانچہ سید محمد صاحب کی سعی سے ذاکر حسین صاحب نے مسلم صاحب کو جامعہ ملیہ میں
پھر جب تعلقات بڑھے تو مسلم صاحب نے ذاکر حسین صاحب کی ہی مدد سے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۱۲
ام، اے اور ام، او کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان خطوں سے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ذاتی خوبیوں
میں ملازمت پیشہ شخص تھا، وہ بھی ڈپٹی کلکٹر جس کو ہمیشہ پابہ رکاب رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں
صاحب سے ملنے کا ارادہ ہی کرتا رہا کہ میرا تبادلہ دمکا ضلع سنتھال پرگنہ کو ہوگیا۔ خوش قسمتی سے ضلع
افسر ہونے کے علاوہ نظارت کا محکمہ بھی میرے ہی چارج میں تھا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کی بات ہے کہ عزت مآب گورنر
کی ضلع میں آمد کی اطلاع آئی۔ چنانچہ میں نے جی جان سے نظارت کے تمام انتظامات کو مکمل کرایا۔ ایسا کر
ڈپٹی کمشنر جو اس زمانہ میں شری رام دت پانڈے تھے، نہایت خوش ہوئے۔

میں نے ان سے استدعا کی کہ حضور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب میرے دادا کی کتاب شائع کرا رہے ہیں
سے ان سے کوئی ذاتی ملاقات نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ سربراہ آورددہ اور ضلع کے اعلیٰ حکام کو

ے۔ آپ اس میں موجود رہیں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ ایسی ملاقاتیں تو وہ ہر ضلع میں کرتے رہتے ۔ ڈپٹی کمشنر نے میرے دادا کا نام پوچھ کر اپنی ڈائری میں لکھ لیا اور کہا کہ جب آپ کا انٹرویو کراؤں گا تو آپ کے دادا کے حوالے سے۔

الغرض روز موعودہ اور وقت مقررہ پر حکام اور ضلع کے سربرآوردہ لوگوں کی قطار سرکٹ ہاؤس کے ں اور کشادہ برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ اس قطار میں، میں بھی شامل تھا۔ دس بجے کا وقت تھا۔ چنانچہ جب ری ہاتھ ملانے کی باری آئی تو ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس اُن کی ذاتی ڈائری موجود تھی۔ گھبرا کے انہوں نے میری ت دیکھا اور کہا "احمد صاحب! آپ کے دادا کا کیا نام تھا؟" سہارا مل کر ہاتھ ملاتے وقت میں نے خود عزت مآب ر صاحب کہا "حضور! میرے جدامجد کا نام علی محمد اور تخلص شاد تھا، جن کو اردو داں 'شاد عظیم آبادی' تے ہیں۔" انھوں نے فرمایا "آج چار بجے کچھ پریس والوں کو بیان دینا ہے۔ آپ اس وقت ملیں تو کچھ اطمینان ے باتیں ہوں گی!" ——— میں اس قطار کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

شام کو حاضر ہوا تو چند نامہ نگار اور اخبار نویس موجود تھے۔ انتظام میں حقیر ہی تھا۔ وہ خورد و نوش مصروف تھے اور میں ذاکر صاحب کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کتنے حسین، دراز قد، سرخ و سفید بزرگ ہیں۔ گورنر سنا پر بھی اخلاق قدیمانہ ہے۔ اتنے میں خود ذاکر صاحب اپنے کمرے سے برآمد ہوئے اور ہم لوگ اٹھ کر ڈپٹی کمشنر ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ابتدا کچھ تفریح اور کچھ چٹکلوں سے ہوئی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا۔ ایک نگار نہایت بیباک شخص تھے، انھوں نے ایک ایسا سوال کیا کہ سب چونک پڑے۔ وہ سوال تھا: "جناب پ کا رنگ سرخ و سپید اور دراز قد تو یہ کہتا ہے کہ آپ کسی نواب فیملی سے ہیں۔" اس سوال پر ذاکر حسین صاحب سکرائے اور بولے: "نہیں بھائی نہیں، میرے اجداد ڈاکو اور راہزن تھے۔" میں قدرے ذاکر صاحب کے پس منظر ے واقف تھا۔ میں نے ہمت کر کے سوال کیا "حضور! اس سلسلہ میں صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا۔" وہ بولے کرو۔" میرا سوال تھا: "حضور روہیلہ افغانوں میں نجیب الدولہ ضابطہ خاں، حافظ رحمت اللہ خاں، دونڈے ان کو سبھی تاریخ داں جانتے ہیں، اس زمانے میں نواب رام پور کو کون نہیں جانتا!" انھوں نے مسکرا کر دیکھا ر پوچھا "کیا آپ تاریخ کے طالب علم تھے؟" میں نے جواب دیا "جی حضور!" پھر انھوں نے دو چار جملے میرے دادا کی تعریف میں کہے اور فرمایا کہ افسوس اب تک ان کی کُل کتابیں نہیں شائع ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے شاد کی ہانی' کا بھی حوالہ دیا۔ پھر دوسرے دوسرے نامہ نگاروں کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔

میری عزت افزائی اس سے بڑھ کے اور کیا ہوتی کہ خود گورنر بہار نے حاضرین اور سامعین سے میرا تعارف ک
چنانچہ ان کے پریس کانفرنس کے بیانات بھی کچھ اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔

یہ میری اور اُن مرحوم کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ وائس پریسیڈنٹ ہو کر دہلی
گئے مگر میں نے موقع کے ساتھ خط و کتابت جاری رکھی۔ چنانچہ دو کتابیں اُنکی خدمت میں دہلی بھیجیں، ایک تو یادگار شاد
دسمبر ۱۹۶۲ء، دوسرے زبور عرفاں جو کچھ اس کے پہلے بھیجی گئی تھی وہ بڑے پابند وضع، سچے، منکسر، خلیق اور
بزرگ تھے۔ خطوں کے جواب نہایت پابندی سے دیتے تھے۔ غالباً جتنے خطوط ملتے تھے، ایک ایک کا جواب لکھوا دیتے
اور ٹائپ کے بعد اپنا دستخط کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے تین چار خطوط ٹائپ میں ہیں، جن پر ان کے دستخط ہیں۔ جو وعدہ
کرتے تھے پورا کرتے تھے، نہیں تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ دو کتابوں کے بھیجنے کے بعد میں نے درخواست کی تھی ایک
کہ کچھ اپنی رائے میری کتابوں کے متعلق فرما دیں اور دوسرے مقبرۂ شاد کی تعمیر کے سلسلے میں حکومت کو رجوع کریں۔

دونوں باتوں کا مختصر مگر صاف جواب دیا۔ کتابوں کے متعلق تو صاف تحریر فرمایا کہ پڑھ جاؤں گا
لکھنے کا وقت نہ نکال سکوں گا، اور مقبرۂ شاد کے متعلق تحریر فرمایا کہ آپ کے صوبہ کے وزیر اعلیٰ سے ضرور کہہ د
چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس زمانے میں دیوگھر کے رہنے والے بابو بنودھا نند جھا بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔
جب وہ دمکا تشریف لائے تو کار بھیج کر انھوں نے مجھے سرکٹ ہاؤس میں بلوایا۔ کہنے لگے کہ ذاکر صاحب
دلّی میں مجھے آپکے دادا کے مقبروں کے بارے میں کہا ہے۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے تفصیل سے حال بیان ک
بنودھا بابو نے مجھ سے درخواست طلب کی اور انڈین نیشن کے خصوصی نامہ نگار کو 'شاد منزل' میں بھیجا۔ جس
تفصیل سے وہاں کے حالات انڈین نیشن مورخہ ۱۹۶۳ء میں شائع کئے۔ اس کا تراشا اب تک میرے پاس محفوظ
میں ذاکر صاحب اور بنودھا بابو کے حق میں دعائیں کر ہی رہا تھا کہ ع "من درچہ خیال و فلک درچہ خیال" کا مصداق
پیدا ہو گیا۔ اِدھر بنودھا بابو کی وزارت جاتی رہی اور اُدھر ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اِس کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض وارثانِ شاہ نے یہ سمجھ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو حکومت اس مکان
کو لے لے اور وہ منہ دیکھتے رہ جائیں، مکان ہی کا وارا نیارا کر دیا۔

بیتاب صدیقی

• جناب عبدالحی بیتاب صدیقی : پیدائش ۱۹۲۷ء
موضع ڈمری ضلع سیتامڑھی (یہ ضلع تحریک آزادی کر سلسلے
میں نامور ہے۔ بیتاب صاحب کے دادا عبداللطیف صاحب کو بھی
اسکی پاداش میں ملک چھوڑ کر امریکا جانا پڑا اور وہیں وفات
پائی۔ بیتاب صاحب بھی جنگ آزادی کے رضاکار رہے ہیں)
فاضل (شمس الہدیٰ)، ۱۹۳۶ء سے پٹنہ میں ہیں۔ پہلے جرنلسٹ
تھے۔ ۱۹۴۹ء سے رام موہن رائے سیمنری میں اردو فارسی
کے استاد ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ عمیر، شاہ مشتاق احمد،
ڈاکٹر محمود، ایڈووکیٹ محمد ایوب، غلام سرور، عزیزہ بتول امام،
اختر اورینوی، حافظ شمس الدین، سر سلطان احمد وغیرہ ۲۱
ممبروں کے ساتھ ریاستی انجمن ترقی اُردو کی بنا ڈالی۔
۱۹۵۴ء میں اس کے جنرل سکریٹری ہوئے۔

••

آزادی کے چند سال پہلے اور چند سال بعد کا دَور بہت ہی پُر آشوب دَور گزرا ہے۔ بہار میں جناب ایوب ایڈووکیٹ، جناب غلام سرور، جناب شاہ مشتاق احمد، ڈاکٹر اختر اُرینوی اور میں۔ ریاستی انجمن ترقی اُردو کے توسط سے اُردو کے تحفظ و بقا کی جد و جہد میں سرگرم تھا اور خصوصاً عزیزم غلام سرور، شاہ مشتاق احمد ایم۔ ایل۔ اے اور میرا ہر وقت ساتھ رہتا تھا، یہ بات ہندوستان بھر کے اُردو دوست جانتے تھے جو بہار کی اُردو تحریک سے متاثر تھے۔ غلام سرور صاحب کی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے مراسلت بھی رہتی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں ہم تینوں افراد علی گڑھ انجمن کی ایک نشست میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ہم لوگ جس ٹرین سے لوٹ رہے تھے، ذاکر حسین صاحب اسی ٹرین سے گورنر بہار کی حیثیت سے بہار آ رہے تھے۔ ٹرین میں کافی دلچسپی رہی۔ پھر اُردو کے کسی اہم مسئلے پر ہم تینوں آدمی ذاکر حسین سے ملنے راج بھون پہنچے۔ بڑے پُرخلوص ماحول میں ہم لوگوں سے کئی گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اُردو کے تحفظ و بقا کے مسئلے پر وہ بھی حساس ہیں۔ ان دنوں بہار کے ہر کس و ناکس مسلمانوں کی گورنر صاحب سے ملاقات کے لیے بھیڑ لگی رہتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ بہار میں پہلے مُسلم گورنر تھے۔ اس لئے اس کسمپرسی کے دور میں ہر شخص راج بھون کا رخ کر لیتا تھا۔ دوران گفتگو میں جناب شاہ مشتاق صاحب نے کہا کہ ہم لوگ بہت پہلے ملنے آتے، مگر آپ کے یہاں تو ملنے والے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، اس پر وہ ہنسے۔ اور پھر فرمایا کہ "فراست مومن" ہمارے یہاں ترجمہ الفضل رہی ہے، لیکن بہار میں برعکس تجربہ ہو رہا ہے۔ جا و بیجا ضرورت مندوں اور حاشیہ برداری کرنے والوں کا جو ملنے کے لیے تانتا بندھا رہتا تھا، اسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ بہار جب وہ آ رہے تھے اور ہم لوگ بھی اسی ٹرین سے واپس ہو رہے تھے تو پٹنہ کے پاس ٹرین کا واقعہ پیش آیا تھا، اُسے یاد دلانے پر خوب ہنسے۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام مختلف مسئلے پر ہم لوگ جناب ایوب ایڈووکیٹ صدر انجمن کی قیادت میں اکثر ملتے رہے جس میں ہم لوگوں کے علاوہ سید جعفر امام مرحوم، کامریڈ علی اشرف، شری سیتل مکرجی، عزیزہ نقی امام صاحبہ، شاد احمد خاں ایڈووکیٹ وغیرہ ساتھ ہوتے۔ ایکبار تند و ترش گفتگو بھی ہو گئی۔

کسی مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس گرتی ہوئی تہذیب کی دیوار پر کب تک پشتہ لگاتے رہیں گے۔ جناب ایوب صاحب مرحوم، جناب کامریڈ علی اشرف اور شری ستیل مکرجی نے اس کا بُرا مانا اور مرحوم ایوب صاحب نے فرمایا کہ حکومت ہم لوگوں کو ایک فہرست دیدے، تاکہ ہم لوگ اسے ترک کردیں، مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب بڑے ہی متحمل اور بردبار شریف النفس شخص تھے، صرف یہ کہکر گفتگو ختم کردی کہ آپ لوگ جذبات میں آگئے، میرا منشا وہ نہ تھا جو آپ لوگوں نے سمجھا، بہرکیف اب تو میں چند ہی مہینے میں بہار سے لوٹ رہا ہوں ممکن ہے آپ کے مطالبات تو ابھی پورے ہوجائیں گے لیکن آیندہ کیا ہوگا وہ میں نہیں کہہ سکتا۔

حضرت مولانا آزاد علیہ الرحمہ کی یادگار بہار میں بنانے کے منصوبے کے تحت 'مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی' کی تشکیل ہوئی جس کے سرگرم اور روح رواں لوگوں میں جناب شاہ مشتاق احمد، جناب عبدالاحد محمد نور، وزیر مملکت بہار، جناب عبدالقیوم انصاری، سید عقیل صاحب بہار شریف وغیرہ تھے، میں بھی اس کا ایک اساسی ممبر اور مجلس عاملہ کا ایک رکن تھا۔ چنانچہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر شری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ بہار نے صدارت فرمائی اور جناب ذاکر حسین نے افتتاح فرمایا۔ اپنے افتتاحیہ خطبے کے دوران آپ نے فرمایا کہ:

"زندہ قومیں اپنے مُردوں کو بھی زندہ رکھتی ہیں اور مُردہ قومیں اپنے زندوں کو بھی مُردہ کردیتی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقولہ مسلم معاشرہ پر پورے طور پر صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب کی گورنری کے دور میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے خلاف ایک سازشی حلقے نے حکومت بہار کا ایک نوٹیفکیشن شائع کرانے میں کامیابی حاصل کرلی جس میں بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو اور اس کے ساتھ آٹھ، دس دیگر مسلم جماعتوں کو فرقہ وارانہ انجمن قرار دیا تھا اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس فہرست میں جمعیۃ العلما بہار اور رانچی کی ایک مسلم پنچایت کا بھی نام تھا۔ اس کے خلاف جناب غلام سرور اور ہیں نے بڑے ہنگامے کئے اور غالباً لیڈی امام صاحبہ کی قیادت میں ہم لوگوں کا وفد گیا تھا جس میں رامانند سنگھ وغیرہ سبھی لوگ تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو جب میمورنڈم پیش کیا گیا، صورت حال بتائی گئی کہ ریاستی انجمن اس مرکزی انجمن کی شاخ ہے جس کے آپ حال تک صدر رہ چکے ہیں۔ حکومت کے اس اقدام سے وہ بیحد برافروختہ ہوئے اور چیف سکریٹری سے بازپرس کی۔ جناب ایوب صاحب کو مشورہ دیا کہ بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے مل کر

معلوم کریں کہ شاید یونیورسٹی کا یہ اقدام ہو، مگر اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی لکھن رام نے بھی اس اقدام پر رنج و افسوس کا اظہار کیا اور بتایا کہ یونیورسٹی کے پاس کوئی ایسی ایجنسی نہیں ہے کہ وہ معلوم کرے کہ کون فرزندِ اردو ہے اور کون نہیں ہے اور پھر اس یونیورسٹی کو ضرورت بھی کیا ہے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور چند ماہ کے بعد رانچی گورنر کیمپ سے ایک پوسٹ کارڈ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا جس میں تحریر تھا کہ

"متعلقہ معاملے میں کافی تفتیش کی گئی۔ حکومت کا کوئی شعبہ اس سرکلر کے بھیجے جانے کا اقرار نہیں کرتا اور لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ اب آپ اسے "نسیا منسیا" سمجھیں اور انجمن کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔"

اس سلسلہ میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انجمن سے وابستہ ۵۰ فیصد پروفیسر اس سرکلر کی اشاعت کے بعد انجمن سے الگ ہو گئے اور پھر جب ایمرجنسی زدہ انجمن ترقی اردو بنی ہے تو وہ مذکورہ پروفیسر صاحبان سرکاری انجمن میں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے بیحد خوش رہتے تھے۔ اردو کے تحفظ و بقا کے مسئلے پر انجمن کی جد و جہد سے وہ بیحد متاثر تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں گورنر کیمپ رانچی سے جناب غلام ربانی تاباں کی معرفت ایک دستی خط میرے نام بھیجا تھا جس میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی خدمات کا اعتراف اور جناب تاباں صاحب کے ساتھ تعاون کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین شرافتِ نفسی اور تحمل و بردباری میں بےمثال شخصیت کے مالک تھے۔

۱۹۵۱ء میں مرکزی انجمن ترقی اردو کے نمائندہ خصوصی جناب خیر بھوروی بہار میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ پرانے ملاقاتی کی حیثیت سے وہ میرے پاس آئے اور مطلب کی بات بیان کی۔ میں انہیں پروفیسر اختر اورینوی مرحوم کے پاس لے گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے صاحب کے پاس بھیج دیا، جو ایک انجمن ترقی اردو کے مالک تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے جو منی میں ساتھی یا ملاقاتی بھی رہ چکے تھے، ان کے پاس بھی لے گیا۔ انھوں نے خیر بھوروی صاحب اور مجھے دوسرے دن عصرانہ پر طلب کیا اور پُرتکلف عصرانہ کھلایا۔ کھلا پلا کر بابائے اردو عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا آزاد، قاضی عبدالغفار مرحوم وغیرہ جملہ حضرات کو اتنی سنائیں کہ ہم لوگ سکتے میں رہ گئے اور پھر یہ کہکر خیر صاحب کو چلتا کیا کہ میں اپنی انجمن کو ایسے لوگوں سے وابستہ انجمن کے ساتھ ملحق نہ کروں گا۔ آپ میں ہمت ہے تو دوسری انجمن بنا لیں۔ چنانچہ بہار ریاستی انجمن قائم ہوئی۔ جناب خیر بھوروی صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنی رپورٹ دی مگر وہ کچھ نہ بولے۔

سیّد محمد احمد

• سیّد محمد احمد صاحب: پیدائش ۱۹۳۵ء بمقام
پٹنہ۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، رانچی
سے زراعت و کاشتکاری میں ڈگری اور ٹوکلائی (آسام)
سے چائے کا اعلیٰ ڈپلوما لیا۔ محکمۂ زراعت حکومت بہار سے
منسلک ہو جانے کے بعد قانون کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۸ء
سے ملازمت سے مستعفی ہو کر پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس
کر رہے ہیں۔

••

میں آئی۔ ایس۔ سی کا ایک طالب علم تھا اور وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ مگر جب ہم نے ان کو دیکھا تو خوب دیکھا اور جیسا سُنا تھا، ویسا ہی پایا، بلکہ بڑھ کر پایا۔

بھی طالب علموں کی طرح میرے لیے بھی انہیں دیکھنے اور سُننے کے موقع، یونیورسٹی کی مختلف تقریبات میں ملتے تھے۔ میں نے ان کو یونیورسٹی یونین میں دیکھا، اسٹریچی ہال میں دیکھا، دنیا کے عظیم رہنماؤں کے ساتھ جو علیگڑھ مہمان ہو کر آتے تھے، ان کے ساتھ دیکھا۔ پھر ہم نے انھیں طالب علموں کے درمیان میں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ایک سے ہی نظر آئے۔

اُونچا قد، قدرے بھاری جسم، بہت بڑا چہرہ اور اس پر سیاہ چشمہ، کھِلتا ہوا گورا رنگ، کھری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا۔ چال آہستہ اور بھاری قدموں میں۔ لباس میں ٹخنوں سے نیچی شیروانی، پورے سر کی ٹوپی، ذرا اونچا پاجامہ اور عموماً پمپ شو جوتہ۔ بیٹھنے میں دونوں ہاتھ برابر سے گھٹنوں پر رکھ

اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ پر بھی خصوصی توجہ دی ــــ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ کچھ ہی دن قبل عرب کے شاہ ابن سعود ہندوستان آئے تھے اور مسلم یونیورسٹی بھی دیکھ کر گئے۔ شاہ نے ڈاکٹر صاحب کو ایک زربفت عربی کپڑوں کا جوڑا تحفتہً دیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد وی۔ ام ہال میں ایک فینسی ڈریس شو تھا۔ تقریباً سبھی لڑکے کچھ نہ کچھ لباس تبدیل کیے ہوئے تھے۔ شام کے وقت ڈاکٹر صاحب جوبلی ہوسٹل کے کامن روم کے سامنے اپنی کار سے آئے اور پورے عربی لباس میں اپنی کار سے نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس لباس میں جاہ وجلال ابھی تک میری نظروں میں ہے۔ میں نے اس فینسی ڈریس میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور عام لباس میں لوگوں سے کچھ دور پر کھڑا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب اپنی کار سے باہر نکلے، اساتذہ اور لڑکوں نے ان کو گھیر لیا۔ پھر فنکشن اور لباس پر گفتگو اور ہنسی کا ایک سلسلہ چل گیا۔ مشکل سے کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے دور کھڑے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس وقت شبہ ہوا کہ یہ میرا شک ہے مگر پھر فوراً ہی ڈاکٹر صاحب لڑکوں

…ان میں سے نکل کر میری طرف آرہے تھے۔ میں کچھ گھبراسا گیا اور جب وہ بالکل قریب آہی گئے تو میں نے …ے بڑھ کر السلام علیکم کہا۔ انھوں نے سلام کا جواب دے کر مجھ سے پوچھا "آپ نے کوئی لباس …نہیں کیا" میں نے کہا کہ جی ہاں۔ بس ایسے ہی' اس پر وہ بولے "کچھ لباس بھی تبدیل کیا ہوتا' تو اچھا …ہوتا" پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر سبھوں میں واپس آئے' اور مجھے بھی سبھوں میں شامل کر لیا۔

ذاکر صاحب کی یوں تو بے شمار تقریریں اور جملے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ مگر اُن کی ایک نصیحت …انھوں نے ہم طالب علموں کو کی تھی وہ یاد رہ گئی۔ انھوں نے کہا تھا کہ "لوگوں کی یہ عادت ہو جاتی …کہ دوسروں کی شکایتیں کریں یا ان کی کمزوریاں ظاہر کریں' تم یہ عادت بنالو کہ دوسروں کی تعریف کیا کرو۔"

پھر ذاکر صاحب کو پٹنہ میں دیکھا' جب وہ بہار کے گورنر ہو کر آئے۔ ہم علیگڑھ اسٹوڈنٹس نے ان کو …پر کلب میں مدعو کیا تھا۔ گورنر کی حیثیت میں اگرچہ ان کی کار سے گورنر کا جھنڈا اُترا ہوا تھا)' ان کو …اشخاص' جنھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی تھی اور سرکاری افسران نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب …تمام اس حلقے سے نکلے اور ہم لوگوں تک' جو ایک طرح سے الگ چھٹ گئے تھے' آئے اور ہم لوگوں کو …کر کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے WELCOME ADDRESS میں سبھی لوگ انگریزی میں بولے …۔ جب ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ ہمارے بچے ہیں۔ ان سے میں ہمیشہ اُردو میں باتیں …ہا ہوں۔ آج بھی اُردو ہی میں باتیں کروں گا اور اُردو ہی میں اپنی تقریر کی۔

●●

سید شاہ ریاض الرحمٰن

[سید شاہ ریاض الرحمٰن صاحب ۵ کشمیری کوٹھی، پٹنہ) پیدائش ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء بمقام پٹنہ سیٹی۔ رام موہن رائے سیمنری اور بی۔ این کالج سے تعلیم یافتہ، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء، پٹنہ میونسپل کارپوریشن اور پٹنہ واٹر بورڈ کے ممبر رہے۔ انجمن ترقی اُردو پٹنہ سیٹی کے اعزازی شریک معتمد بھی رہ چکے ہیں۔ یتیم خانہ انجمن خادم الاسلام پٹنہ سیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر ہیں]

یہ ۲۲ اگست ۱۹۵۷ء کی بات ہے جب میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار سے راج بھون پٹنہ میں ملا۔ ۱۰ بجے دن میں ڈاکٹر صاحب کے چیمبر میں لے جایا گیا۔ جاتے وقت فطری طور پر کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا لیکن جب چیمبر میں پہنچا اور ڈاکٹر صاحب سے سامنا ہوا تو سلام علیک کے بعد انھوں نے کھڑے ہو کر فرمایا، تشریف لائیں اور بیٹھنے کو کہا۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے گفتگو شروع کی۔ انداز گفتگو ایسا تھا جیسا کہ ہم ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہوں۔ چنانچہ میں چند منٹ ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں گورنر سے نہیں، بلکہ ایک شفیق اور مخلص سے باتیں کر رہا ہوں۔ انھوں نے گفتگو کی ابتدا اس طور پر کیا کہ "آپ تو کارپوریشن کے ممبر ہیں اور یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں صفائی ستھرائی زیادہ ہے۔ اس لئے یہاں مچھر نہیں ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی مچھروں کی کمی نہیں ہے۔" پٹنہ شہر کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شہر تو بس لمبا سے پورب تک چلا گیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔" چند دن پہلے ۱۵ اگست کی تقریب ہوئی تھی اس کے متعلق کہا کہ "یہاں تو کوئی سجاوٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں جب علی گڈھ میں تھا وہاں تو میں نے سجاوٹ کے لئے مستقل سامان مہیا کر رکھا تھا جب بھی ضرورت پڑے شہر کی سجاوٹ ہو سکے۔" ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے قیام جرمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "جرمنی بہت صاف ستھری اور خوب صورت جگہ ہے، وہاں تمام گھروں میں پھولوں کے گملے کھڑکیوں میں لگے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر روشنی کی قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ "جب میں سڑکوں پر سے گذرتا تھا اکثر اس وقت اسکولی بچے اور بچیاں بھی آتے جاتے نظر آتے اور جب مجھ اجنبی پر ان لوگوں کی نظر پڑتی تو نہایت ادب سے سلام کرتے۔ ان لوگوں کا سلام اس ملک کے بچوں اور نوجوانوں کی طرح تمسخرانہ نہیں ہوتے۔"

انوار کریم

• انوار کریم صاحب : پیدائش ۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء
علی گڑھ سے ۱۹۳۹ء میں ریاضی میں ایم۔ ایس۔ سی کیا
۱۹۴۱ء میں بہار میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۶ء
میں آئی۔ اے۔ ایس کے سینئر اسکیل پر ترقی پائی۔ فروری
۱۹۶۵ء میں جموں و کشمیر میں ڈویژنل کمشنر، پھر ایڈیشنل
چیف سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ نومبر ۱۹۷۴ء میں
ریٹائر ہوکر بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔
اب گوشۂ عافیت میں ہیں۔

••

آج سے تقریباً ۴۵ سال کی بات ہے کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس وقت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سال شاید ۱۹۳۷ء تھا یا ۱۹۳۸ء، مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے۔ وہ یونیورسٹی یونین میں معاشیات کے کسی ادق پہلو پر تقریر کرنے آئے تھے۔ میں سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ موضوع تقریر سے میں بالکل نابلد ہوں، اپنے اور ساتھیوں کے ہمراہ یونین ہال گیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس وقت کے علیگڑھ میں ڈاکٹر صاحب کے سیاسی و معاشی نظریہ سے سبھی طالب علم متفق تھے، لڑکوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ذاکر صاحب کے خیالات کی مخالف تھی۔ لیکن اُن کی شخصیت، علمی صلاحیت اور ان کے جذبۂ ایثار کے سبھی مدّاح تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی تقریر سُنی ـ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے شباب کا عالم تھا۔ اُن کی جاذب نظر شخصیت ابھر رہی تھی۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر صاحب سے ملنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع پھر اس وقت ملا جب وہ صوبہ بہار کے گورنر مقرر کیے گئے۔ اس وقت میں سکریٹریٹ میں ایک محکمہ کے سربراہ (HEAD OF DEPTT) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

جب تک ڈاکٹر صاحب بہار کے گورنر رہے، ان کا معمول تھا کہ باری باری چند محکموں کے سکریٹری اور سربراہوں کو راج بھون میں رات کے کھانے پر مدعو فرماتے۔ اس طرح ہر دو چار ماہ میں مجھے بھی ان دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا۔ گو ذاتی طور پر مجھے اس طرح کی دعوتوں سے کچھ کوفت بھی ہوتی کیونکہ دعوت میں شرکت کے لیے سرکاری لباس میں ملبوس رہنا ضروری ہوتا تھا۔ تاہم ان دعوتوں میں میں ضرور شریک ہوتا۔

گنے چنے لوگوں کو چھوڑ کر، ہم سرکاری ملازموں کی عمومی کمزوری یہ ہے کہ جس محکمہ سے ہم لگے ہوتے ہیں اس محکمہ کے مسائل کو ہی حکومت کے اہم ترین مسئلے تصور کرتے ہیں۔ ہماری دلچسپی اور ذہنی کدو کاوش عموماً اپنے محکموں تک ہی مرکوز و محدود رہتی ہے۔ اس لیے ہماری گفتگو کے موضوع بھی زیادہ تر یہی مسئلے رہا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر

ـاحب شاید سرکاری افسروں کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ اس لیے جب کسی محکمہ کے سکریٹری یا سربراہ سے
گفتگو کرتے تو پہلے کچھ اِدھر اُدھر کی عام دلچسپی کی باتوں سے سلسلہ شروع کرتے اور رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ محکمہ کے
ـور کی طرف موڑ دیتے۔ محکمہ کے مسائل پر بات چیت کرتے ہوئے، ظاہر ہے کہ ہر افسر اپنے کو محفوظ سرزمین
ـر پاتا اور خود اعتمادی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا۔ ڈاکٹر صاحب سُنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ اس طرح
ـاکٹر صاحب براہ راست حکومت کی کارکردگیوں و دیگر مسائل کے متعلق واقفیت حاصل کرتے تھے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ جب بھی وہ ہم جیسے افسروں سے بات کرتے
ـو ہماری ذہنی اور علمی سطح پر آکر ہی باتیں کرتے۔ ہمیں کبھی اپنی کم مائگی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ دائرۂ گفتگو
ـیادہ تر ہماری محدود دلچسپی کے موضوع تک ہی رکھتے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہم میں سے جو بھی ان سے ملتا،
ـیک خوشگوار تاثر لے کر واپس لوٹتا۔

●●

ڈاکٹر مسعود الحق

[• ڈاکٹر مسعود الحق صاحب: پیدائش نومبر ۱۹۰۱ء، ۱۹۲۸ء میں پٹنہ میڈیکل کالج سے گریجویشن۔ ۱۹۳۰ء میں پٹنہ میڈیکل کے شعبۂ اناٹومی میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا اور بحیثیت صدر شعبہ ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں نالندہ میڈیکل کالج پٹنہ کی بنا ڈالی اور اناٹومی کے پروفیسر ایمریٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔]

ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ آل انڈیا سائنس کانگریس میں شرکت کے لئے نمائندہ کی حیثیت سے پٹنہ تشریف لائے۔ یہ آزادی سے قبل کی بات ہے۔ وہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے ساتھ جو اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، قیام فرما تھے۔ انڈین سائنس کانگریس کے مندوبین میں سے ایک کا قیام میرے ساتھ تھا۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ اس دعوت میں آزاد ہند فوج کے کرنل محبوب، جو بعد میں کئی ممالک میں سفیر کے عہدے پر بھی فائز رہے، اور مسٹر قرنی (آئی۔ سی۔ ایس)، جو اُن دنوں حکومت بہار میں ملازم تھے، شریک تھے۔ کھانا ختم ہوتے ہی ذاکر صاحب نے مجھ سے یہ تصدیق چاہی کہ کیا ان کے ڈرائیور نے بھی کھانا کھالیا؟ گرچہ میں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر دیا تھا لیکن اس بات سے مجھ پر ذاکر صاحب کے نظریے اور غریبوں کے لئے ان کی محبت آشکارا ہوئی۔ ••

سیّد علی عبّاس

• سیّد علی عبّاس صاحب : پیدائش ۱۹۱۱ء، بمقام کھجوا (سارن)۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں گریجویشن کے بعد جنوری ۱۹۳۶ء میں انڈین پولس سروس (آئی۔پی۔ایس) میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ڈی۔آئی۔جی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں انڈین پولس میڈل اور ۱۹۴۸ء میں کنگس پولس میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں سینئر سی۔آئی۔ڈی ٹریننگ کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ (انگلینڈ) گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔

آپ نے ۱۹۵۸ء میں پٹنہ میں 'کارواں کلب' اور ۱۹۶۰ء غالب کلب کی بنا ڈالی تھی۔ 'بزم کاف' کے بانی بھی آپ ہی ہیں جس نے ۱۹۷۴ء میں کلیم عاجز صاحب کی کتاب "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" شائع کی۔

آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے آپ کی متعدد تحریریں نشر ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ "انیس اور اس کی شاعری" آپ کی اہم تصنیف ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں مقیم ہیں۔

••

حیرت ہوئی کہ بیدآر صاحب نے مجھے کوئی سخت ہوم ٹاسک کرنے کو نہیں دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت' ان کی عظمت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کو نہیں کہا جو میرے بس کی بات نہ تھی۔ بیدآر صاحب نے صرف اپنے ذاتی تجربے' مشاہدے اور ذاکر صاحب سے ملاقات کے قصے سننے چاہے جو کام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ بیدآر صاحب مجھے تو ذاکر صاحب کے عاشقوں میں سے لگے اور کسی عاشق کا دل رکھنا باعثِ ثواب ہو کہ نہ ہو' انسانی ہمدردی کا تقاضا یقیناً ہوتا ہے۔ اس مقالے کو میری بیداری کا ثبوت سمجھا گیا تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ آئے تو اُن دنوں میں پٹنہ میں سینئر سپرنٹنڈنٹ اوف پولس ہوا کرتا تھا۔ اس حیثیت سے مرحوم کا اکثر ساتھ ہوا اور میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا۔ کیا خوب انسان تھے مجال
۱۹۵۸ء میں سائنس کالج کے بزمِ سخن کے سالانہ جلسے میں ذاکر صاحب مہمان خصوصی ہو کر تشریف لائے
اُن دنوں اُردو کو سرکاری زبان منوانے کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اپنے شکوے سنانے کے لیے اور داد مچانے کے لیے اُردو کے کچھ پاسبان اور حامیان ایسے مواقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتے۔ چنانچہ اس بڑے جلسے میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ کسی نے گورنمنٹ کی بیرخی کا گلہ کیا' تو کسی نے ہندی کے پرستاروں کی رقابت کا ذکر کیا۔ ہمیشہ چندہ مانگنے والے اور امداد طلب کرنے والے کچھ مولویوں نے اُردو دانوں کی مفلسی اور بے بسی کا رونا رویا اور ہاتھ پھیلایا۔ آخر میں جناب وفا ملکپوری نے اپنے خاص ترنم میں ذاکر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے ایک "شکوہ' نما نظم سنائی۔ یہ تو نہیں کہا "رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر"... اور نہ یہ کہا "ہم وہی سوختہ ساماں ہیں' تجھے یاد نہیں"۔ پھر بھی بہت کچھ کہہ گئے اور اُردو کے لیے سرکار کی توجہ' امداد اور پشت پناہی کی ضرورت کا ذکر کر گئے۔ نظم ختم ہوئی اس مصرع پر "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا چاہیئے" خوب تالیاں پڑیں' خوب واہ واہ ہوئی۔ اور ذاکر صاحب خاموش سر جھکائے سنتے رہے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب نے تقریر اپنی شروع کی' تو وفا صاحب کی نظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"جو کوئی بیچ منجدھار ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکا تلاش کرنا شروع کرے اور کہیں تنکا دکھائی دیا

تو اسے سہارا سمجھ کر اس پر ٹکے تو اس کا کیا حشر ہوگا' ظاہر ہے۔ ایسے کو ڈوبنے سے کون بچا سکتا۔ ظالم موجوں اور طوفانوں سے لڑنے کے لیے مضبوط ہاتھ پیر چاہیے۔ تیرنا جاننا چاہیے، ہمت چاہیے، عزم چاہیے، خود اعتمادی چاہیے۔ ورنہ پار اترنے کے خواب' خواب ہی رہیں گے۔ ایسے کمزور اور بے ہاتھ پیر والوں کے لیے بہتر ہے وہ ساحل کی آسودگی میں پڑے سسکتے رہیں اور غزلیں گنگناتے رہیں"

آگے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"اردو نے جب جنم لیا تھا تو وہ عربی فارسی کا دور تھا۔ اُس وقت کے سلاطین اور رؤسا جن کی دیوان خاص یا دیوان عام تک رسائی تھی' وہ اُردو میں کسی سے ہمکلام ہونے کو معیوب سمجھتے تھے اس لیے کہ اُردو تھی بازاری زبان۔ نیچے طبقے والوں کی زبان، سپاہیوں، بیوپاریوں کی زبان۔ شرفا کی زبان کچھ اور ہوتی تھی۔ وہ تو کچھ تو پیر و مرشد، کچھ فقیر و درویش، کچھ سنت سادھو، کچھ کبیر، تلسی داس۔ امیر خسرو اور میر ایسے چٹائی پر بیٹھنے والے تھے، جنھوں نے اُردو کو وہ توانائی اور عوام پسندی بخشی کہ اُردو لال قلعہ میں اٹھلاتی، لچکتی، اکڑتی پہنچی اور ظفر شاہ کو تو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔ پھر تو اُردو کی نورجہانی دلّی سے لے کر دکن تک اپنا لوہا منوا گئی۔ وہ غریبوں، فقیروں، محتاجوں اور پریشان حال لوگوں کی جد و جہد کا کرشمہ تھا کہ اُردو پروان چڑھی۔ نہ شاہی خزانوں سے کوئی امداد ملی نہ مغل سورماؤں نے پشت پناہی کی۔ بلکہ مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کو اردو ہی کا سہارا لینا پڑا۔ جس سے حاکم و محکوم میں رابطہ قائم ہوتا۔ اُردو کبھی حکمرانوں کی محتاج نہ ہوئی، بلکہ حکمرانوں نے اُردو کا سہارا لیا۔ تو ارتخ کے واقعوں سے سبق نہ لیا جائے تو پھر تو ارتخ اور الف لیلیٰ میں فرق ہی کیا ہوگا"؟

●●

حسن احمد قادری

[• حسن احمد قادری صاحب: پیدائش ۱۶ جنوری ۱۹۴۳ء بمقام چھوٹی بورنا، مونگیر۔ وطن پھلواری شریف۔ والد کا نام شاہ فضل احمد قادری صاحب جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے ناظم ہیں۔ ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ، اور شمس الہدیٰ پٹنہ۔ حکومت بہار کے شعبۂ صنعت و حرفت سے منسلک ہیں]

○

والد صاحب کے ساتھ راج بھون پٹنہ میں ملاقات کی روداد:

... ذاکر صاحب، والد صاحب سے مخاطب تھے اور فرما رہے تھے کہ شاہ سلیمان ندوی پھلواروی کو میں قریب سے جانتا ہوں اور ان کی عالمانہ تقریر سنی ہے۔ سیرت پر جو انھوں نے کتابیں لکھی ہیں، اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ فرما رہے تھے کہ بڑے اچھے مقرر، باصلاحیت انسان اور عظیم شخصیت تھی۔ ان کے جانشین کے متعلق دریافت حال کیا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ کے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے کتبخانہ میں تو قدیم قیمتی نسخے ہوں گے۔

والد صاحب: جی ہاں۔

ذاکر صاحب: تو آپ اسے خدابخش لائبریری میں دیدیں تاکہ عرصہ تک یہ سرمایہ محفوظ رہ سکے۔ میں اس لائبریری کی عمارت کو ایسا بنانا چاہتا ہوں جس سے کتابوں اور ان کے اوراق پر برسات کی نمی، گرمی کی تمازت وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کے لئے ایک جامع اسکیم بنا کر میں نے حکومت ہند کو لکھ بھیجا ہے۔ میں کوشاں ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ ایشیا کی یہ تاریخی لائبریری مثالی رہے۔

والد صاحب: خانقاہ مجیبیہ کی لائبریری خلوت شریف سے منسلک ہے۔ صاحب سجادہ فرصت کے اوقات میں مطالعہ فرماتے ہیں۔

ذاکر صاحب: میں ان کے لئے خدابخش لائبریری میں حجرہ بنوا دوں گا۔

والد صاحب: وہ بھی معمول کے خلاف ہوگا۔ چونکہ وہاں کے گدی نشینی کے قواعد و ضوابط کے مطابق وہ حج بیت اللہ کے علاوہ اور کسی دوسرے کام سے بستی سے باہر نہیں جا سکتے۔

ذاکر صاحب: تو پھر آپ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی لائبریری کے لئے ایک عالیشان عمارت کا نقشہ بنوائیے۔ میں ہوں، ڈاکٹر سری کرشن سنہا وزیر اعلیٰ بہار جو کہ تعلیمی ذوق رکھتے ہیں، وہاں ایک اچھی عمارت بن جائے گی، تاکہ بزرگوں کا یہ بیش بہا سرمایہ محفوظ اور اچھی حالت میں رہ سکے۔

سیّد احمد علی آزاد

سید احمد علی آزاد مرحوم : پیدائش، بنارس
۱۹۰۱ء۔ احباب نے آزاد منش ہونے پر انھیں آزاد کہنا
رع کیا جو ان کے نام کا جز ہو گیا۔ تحریک ترک موالات کے
ان خادمانِ جامعہ کی صف میں شامل ہوئے۔ جامعہ
انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب نے
معلمی کی تعلیم و تربیت کے لیے ٹریننگ اسکول موگا
ب بھیجا، جہاں سے کامیابی کے بعد تعلیمی مرکز قرول باغ
گراں مقرر کر دیے گئے۔

آپ کا نام جامعہ کے جانثاروں میں سرفہرست ہے۔
صاحب بھی آپ کی خدمات، جوش اور لگن کے
تھے۔ ۱۴ر فروری ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔

جہاں وہ بڑوں کے ذاکر صاحب تھے وہاں بچوں کے ذاکر صاحب بھی تھے۔ وہ جامعہ سے جانے کے بعد اُونچے اُونچے عہدوں پر پہنچے لیکن بچوں سے ان کی دلچسپی اور لگاؤ کسی طرح کم نہیں ہوا تھا۔ رائٹ لکھتے ہیں:

"نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ خوشی ہوئی کہ آپ چھٹی جماعت سے "ہمالہ کی جھیلیں" پروجکٹ چلوا رہے ہیں۔ بہت دلچسپ موضوع ہے اور مجھے یقین ہے کہ بچے بڑے انہماک سے اس منصوبہ کو کر رہے ہوں گے۔ اور بہت کچھ سیکھیں گے۔ کیا عجب ہے کہ کسی دن آپ کا کوئی شاگرد کسی چوٹی کو فتح کرے۔ اُس وقت اس پروجکٹ کو ضرور یاد کرے گا۔"

جب تک جامعہ میں رہے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ وہ بچوں کو نہ صرف تعلیم دیتے تھے بلکہ ان کے لئے اچھی اچھی کہانیاں اور اسباق بھی لکھتے تھے۔ مکتبہ جامعہ نے پہلی جماعت سے بچوں سے لے کر آٹھویں درجہ تک کے بچوں کے لئے جو ریڈریں شائع کی ہیں ان میں کتنے ہی اسباق ذاکر صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے بہترین حصے تو سب ہی اسباق میں ہیں۔ وہ بچوں کے لئے لکھتے تو تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ بچوں کے لئے لکھنا بڑا مشکل کام ہے مغرب کے مصنفین اس پر اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ فن ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔

انھیں بچوں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کی دلچسپی کے لئے جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں خرگوش خانہ، کبوتر خانہ، چڑیا خانہ، مرغی خانہ، باغبانی، بچوں کی دکان، بچوں کا بینک، بچوں کا خوانچہ قائم کرایا تھا۔ ان میں بچے اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ وہ LEARNING BY DOING کے قائل تھے۔ اس کی پوری جھلک بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم میں موجود ہے۔ وہ منصوبی تعلیم میں بڑے امکانات دیکھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں بڑے مزے سے لکھتے ہیں:

"مرغی خانہ کا ایک نسخہ ملا۔ خط اور نسخہ دونوں کے لئے شکریہ قبول فرمائیں۔ 'مرغی خانہ' کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ بس اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سعیدہ کی لڑکی نیساؤ فرجس نے ابھی ایک مرغی بٹھائی تھی اور پرسوں ہی اس کے نو بچے نکلے ہیں 'کتاب' اڑا لے گئی۔ آپ نے دیکھا 'کام' اور 'کتاب' کا ربط۔ اب تک وہ کتاب انھیں کے تصرف میں ہے۔"

ذاکر صاحب بچوں کے خطوط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ جب تک بہار کے گورنر رہے خود اپنے قلم سے جواب

لکھتے تھے۔ اس کے بعد بھی اپنے قلم سے ہی جواب لکھ کر سکریٹری کو دیدیتے تھے اور وہ ٹائپ کرا کر خط لکھنے والے صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے۔ خط کا جواب سکریٹری کو املا کرا دینے میں اور خود اپنے قلم سے جواب لکھنے میں جو فرق ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود اپنے قلم سے جواب لکھ کر وہ اپنے دلی تعلق کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی تحریر پاکر جواب پانے والے کو جو خوشی ہوتی تھی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو ان کے خطوط ملے ہیں۔ ان کے خطوط میں کہیں کہیں بڑے پتے کی باتیں لکھ گئے ہیں اور کہیں کہیں اپنے دلی جذبات کو ظاہر کر گئے ہیں۔ بہرحال یہ خطوط ان کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ یہ خطوط جب شائع ہوں گے تو بہت سی غلط فہمیوں کو دُور کر سکیں گے۔

وہ پُرانے فن اور پُرانی چیزوں کی قدر کرتے تھے۔ ہاتھ کی بنی ہوئی ابری کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ فن مشین کی ابری کے مقابلے میں ختم ہوتا جارہا ہے۔ ابری بنانے کے طریقوں پر انھوں نے ایک کتاب مجھ سے لکھوائی تھی جس کا مسودہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں اس وقت جالندھر اسٹیشن پر اُن کے سامان کے ساتھ گم ہوگیا جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وہ کشمیر جارہے تھے۔ جامعہ میں عرصہ تک اُن کی ہدایات کے مطابق ہاتھ کی ابری بنتی رہی اور گتّے کے ماڈلز میں ان کا استعمال ہوتا رہا۔ وہ خوشخطی کے فن کی بھی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے کمرے میں ہاتھ کے لکھے ہوئے کتبے آویزاں رہتے تھے۔ آخری عید کے موقع پر شفیع الدین نیّر صاحب کی کتاب "غالب کی کہانی" کا ذکر ہورہا تھا، فرمایا کسی اچھے کاتب سے لکھوائیے گا، پھر خود ہی فرمایا۔ اب اچھے کاتب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ محترم علی احمد مرحوم بڑے اچھے خطّاط تھے اور جامعہ کے بچّوں کو خوشخطی لکھنا سکھایا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کے فن کی قدر کرتے تھے۔ وہ پُرانے قلمی نسخوں کے بڑے قدردان تھے۔ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے، ایک صاحب کچھ قلمی کتابیں میرے کمرے میں لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ذاکر صاحب بھی تشریف لے آئے اور ہر کتاب کو بغور دیکھا۔ پھر اُن سب کو جامعہ لائبریری کے لئے خرید لیا۔ ●●

(رسالہ جامعہ سے شکریہ کے ساتھ)

ڈاکٹر رشید الوحیدی

[• ڈاکٹر رشید الوحیدی: پیدائش ۱۳ دسمبر ۱۹۴۲ء بمقام دیوبند، ۱۹۵۹ء میں دیوبند سے فاضل، ۱۹۷۱ء میں دہلی یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے اور ۱۹۷۸ء میں پی ایچ ڈی۔ ۱۹۷۳ء سے جامعہ میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں، تصانیف میں 'خلافت بنی امیہ'، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور حسن البصری: حیات اور کارنامے' (زیر طبع) قابل ذکر ہیں۔]

جامعہ ملیہ کے ایک چپراسی کی بچی کی شادی ہے۔ ایک کچے سے مکان کے سامنے چارپائیاں بچھی ہیں۔ ایک جگمگاتی ہوئی کار آکر رکی۔ ایک عظیم الجثہ بھاری بھرکم شخصیت نے مجھ پر سایہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا انھوں نے کہا اے ذاکر صاحب۔ میری گھبراہٹ بھانپ گئے۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے "میاں صاحبزادے شادی کس گھر راستہ کدھر ہے، چلو میرے ساتھ۔ لڑکی کے باپ کے گھر پہنچے۔ یہ "باپ" جامعہ میں ان کا پرانا خادم تھا (جس کو ذاکر صاحب 'میرے ساتھی' کہا کرتے تھے) باپ سے بغلگیر ہوئے۔ وہ زنان خانے میں لے گیا۔ نائب صدر جمہوریہ بلا تکلف چلے گئے۔ بچی کے سر پر ہاتھ پھرا۔ اس کے مہندی لگے ہاتھوں پر ایک گڈی نوٹ کی تھمائی۔ باپ سے اجازت لی اور کار واپس گئی۔ میں اس واقعہ پر حاضر تھا۔

ایک بڑے میاں جی' جامعہ کے پرانے سقہ کا انتقال ہوا۔ واللہ اعلم کس نے پریسیڈنٹ ہاؤس کو اطلاع کردی: "آپ کا ساتھی قرول باغ بھڑاو کھلا میں آپ کے ساتھ کام کرنے والا فلاں آج اللہ کو پیارا ہو گیا" شام کو ۶ بجے ہم سب جامعہ قبرستان میں بڑے میاں کو لٹا کر واپس آرہے تھے۔ ایک جگہ سڑک پر میں جا رہا تھا۔ پھر گاڑی رکی۔ ذاکر صاحب۔ گھبرائے ہوئے جلدی میں۔ کیا فلاں صاحب کو دفن کر دیا۔ جی ہاں وہیں سے آرہا ہوں۔ اچھا! ایک منٹ توقف کے بعد ڈرائیور سے بولے۔ چلو میاں واپس۔

سدانند منڈل

ناب سدانند منڈل : پیدائش ۱۹۲۶ء
م سبور (بھاگل پور) ، سبور اگریکلچر کالج (بھاگل پور)
زراعت میں ڈگری ، سبور اور پوسا (سمستی پور) سے
ل کیے۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں راج بھون، پٹنہ
شعبۂ باغبانی کے انچارج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور
تک اس منصب پر فائز ہیں۔

ذاکر صاحب ایک بہت بڑے پھولوں کے پریمی تھے۔ یوں تو انھیں ہر پھول اور پودے سے
پریم تھا، پرنتو گلاب سے انھیں ادھک پیار تھا۔ میں انھیں کے سمے ۱۹۵۹ء کی گارڈن سپروائزری میں
میں آیا تھا۔ پرتھم ساکچھاتکار[1] کے دن ہی مجھے ان کے آرام کچھ میں پہنچایا گیا کیونکہ اس دن ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔
میرے پہنچنے پر وہ اٹھ کر بیٹھے اور مجھ سے بھی بیٹھنے کو کہا گیا۔ اس کے بعد وہ باغبانی سمبندھی[2] انیکوں[3] سوال پوچھے
جو مجھے ٹھیک یاد نہیں آ رہے ہیں، جو یاد ہے وہ اس پرکار ہے۔ ابھی تک کتنے پرکار[4] کے گلاب نکالے گئے
ہیں؟ اور کون کون؟ میں صرف ۱۶ قسموں کے نام اور رنگ ہی بتا پایا تھا۔ گلاب کے پودے کن کن طریقوں سے
بنائے جاتے ہیں؟ اس پر میں نے کل ۱۱ طریقے بتائے اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سبھی طریقے کتابی ہیں اور کامیابی
تو ودیشوں میں ہی ہوتی ہے (ٹھنڈی جگہوں میں) بہار میں نہیں۔ یہاں کے لئے تین، چار طریقے ہی کام میں لائے
جاتے ہیں۔ اس پر وہ ہنس پڑے اور بولے تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے بھی آزما کر دیکھا ہے، تین چار طریقے ہی یہاں
کے لئے اپیکت[5] ہیں۔ اس سمے میری بحالی کا آدیش انھوں نے دیدیا۔ دوسرے دن مجھے پھر صبح آٹھ بجے بلایا
گیا اور ایک ویران جنگل دکھایا گیا جو شیشم، سپریس، جامن اور کئی پرکار کی جھاڑیوں سے بھرا تھا۔ دکھاتے
ہوئے مجھے کہا گیا کہ اس جنگل کو منگل میں بدل دو، ایسے گارڈن میں بدلو کہ جو لوگ ادھر آنے سے ڈرتے ہیں وہ
یہاں آکر بیٹھیں اور ان کے سہیوگ سے ہوا بھی ایسا کہ وہ ویران جنگل 'ذاکر کیاری' کے نام سے پرسدھ[6] ہوا۔ اسی
کی بات ہے کہ اس واٹیکا[7] کے لئے کچھ وشیش[8] گوبر کھاد کی آوشیکتا[9] تھی جس کے لئے میں سکریٹری صاحب سے
کئی بار بول چکا تھا۔ پر اپنے ویست کاریہ وش[10] وہ بھولتے رہے۔ ایک دن ذاکر صاحب اوپر سے اترتے
ہی پہلے وہیں پہنچے جہاں کھاد کی آوشیکتا تھی۔ پہنچتے ہی وہ کھاد کے بارے میں پوچھے تو میں نے کہا نہیں سر
ابھی تک وہ نہیں آیا ہے۔ سنتے ہی وہ گمبھیر ہو گئے اور چپراسی کو بلوائے اور بولے کہ آج میں آفس کا کام (ک

۱۔ انٹرویو ۲۔ متعلق ۳۔ متعدد ۴۔ طرح ۵۔ مستعمل مناسب ۶۔ مشہور ۷۔ پھلواری
۸۔ خاص۔ ۹۔ ضرورت ۱۰۔ [illegible]

گارڈن میں کروں گا۔ اس لئے میرے بیٹھنے کا انتظام اسی گارڈن میں کر دیا جائے اور ہوا بھی ویسا ہی۔ جب سکریٹری صاحب کو معلوم ہوا تو وہ ان سے ملنے آئے، پر وہ ان سے ملنے سے انکار کر دیئے۔ اس دن سے وہ نیتیہ[1] پرتی[2] دن صبح سات بجے وہ گارڈن میں آ جاتے تھے اور پورے گارڈن نرسری وغیرہ ہوتے ہوئے جنگل کی بھی سیر کرتے تھے۔ اسی بیچ جتنے بھی پیڑ پودے دیکھتے تھے سبھوں کا نام ساتھ میں رہنے والے چپراسی اور اسپیشل گارڈ کے سپاہی سے بھی پیڑ پودے کا نام پوچھتے جاتے تھے اور برابر یہی کہتے جاتے تھے کہ ویکتی[3] کو ہر چیز کی جانکاری رکھنی چاہیئے چاہے وہ مالی ہو یا مزدور یا سپاہی۔

ان کے باہر جانے یا آنے کے سمے انھیں ہمیشہ ایک گلاب کا ٹہنی دیا جاتا تھا۔ پھول لینے کے بعد وہ ہمیشہ شکریہ ادا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنا اور پریوار کا خیریت وہ اوشیہ[4] ہی پوچھتے تھے، کیسے ہیں تمھارے بچے، سب کیسے ہیں اتیادی[5]۔ ایسے تو کبھی کسی پر بگڑتے نہیں تھے۔ یدی[6] وہ کسی پر بگڑتے تھے تو سلامی دینے پر سلامی نہیں لیتے تھے۔ تبھی ہم لوگ سمجھ جاتے تھے کہ ہم لوگوں سے کچھ غلطی ہوئی ہے جس سے کہ وہ ناراض ہیں۔ گھومتے گھومتے جب ان کا کرودھ[7] شانت ہو جاتا تھا تو وہ سمجھاتے تھے کہ تم سے اس پرکار کی غلطی ہوئی ہے جو بھوشیہ[8] میں نہیں ہونا چاہئے۔

وہ ایک بہت بڑے ادھان[9] وشیشگیہ بھی تھے۔ وہ ہمیشہ ادھان کی بڑی بڑی پستکیں پڑھتے رہتے تھے۔ وہ اپنے بیڈروم کے برآمدے میں گوبر، کھاد، مٹی، بالو، آرگینیز کھاد اور سو پچاس گملے ہمیشہ رکھتے تھے اور فرصت ملنے پر خود اپنے سے بیج بونا، پودہ لگانا، کٹنگ کاٹنا، کھاد اور پانی دینا اتیادی سب کیا کرتے تھے۔ ان گملوں میں کسی بھی مالی یا انیہ ویکتیوں کو پانی یا کوئی کرنے کی سخت مناہی تھی۔ وہ اپنے سبھی بچوں کو بھی ۲۵-۲۵ گملے دیے ہوئے تھے جن کی دیکھ ریکھ بچے خود ہی کرتے تھے اور تب وہ اپنے بچوں کے اور گارڈن کے گملوں سے ملاتے تھے کہ کون سا پھول اچھا ہے اور کون سا پھول خراب ہے۔ انت میں خود کہتے تھے کہ پریکٹیکل اور تھیوری میں بہت ہی انتر ہے۔ اس کے بعد سارے گملے وہ ہم لوگوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ ●●

۱- ہمیشہ ۲- ہر دن ۳- آدمی ۴- ضرور ۵- وغیرہ ۶- اگر ۷- غصہ
۸- مستقبل ۹- باغبانی۔

حکیم محمد اشرف کریم

[• حکیم اشرف کریم : پیدائش مئی ۱۹۲۳ء - مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے فاضل، ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ سے گریجویشن، ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہوئے۔]

○

گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے مسائل کے حل کے لئے جناب ذاکر حسین صاحب سے طبی کالج کا ایک وفد ملا۔ جس میں جناب حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل جناب حکیم عبدالشکور صاحب مرحوم سینئر پروفیسر اور تیسرا یہ خادم بھی شامل تھا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے گورنر ہاؤس بہار میں ۱۹۵۸ء میں میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ ذاکر صاحب مرحوم نے ہم لوگوں کی باتیں اور مطالبات بڑی توجہ سے سُنے اور مداخلت کر کے کسی حد تک پورے کئے۔

میری دوسری ملاقات ۱۹۵۹ء کے اوائل میں گورنر ہاؤس ہی میں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی جناب حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل وفد کے قائد تھے۔ ہم لوگوں نے ۲ فروری ۵۹ء کو گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ میں "اجمل ڈے" منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس کے افتتاح کے لئے اُن سے گذارش کی گئی۔

"اجمل ڈے" کے شاندار پنڈال میں مختلف مقررین کے علاوہ خود ذاکر صاحب کی بہت مؤثر افتتاحی تقریر ہوئی جس سے ذمہ داران حکومت خصوصاً اُس وقت کے وزیر صحت شری بیر چند پٹیل بہت متاثر ہوئے۔ اس جلسہ کے بعد ہی وزیر موصوف نے طبی کالج پٹنہ کو ایک دو منزلہ پختہ عمارت الاٹ کر دی جس میں الکٹرک، واٹر پائپ اور فون کی ساری سہولتیں حاصل ہیں۔

ان سے میری تیسری ملاقات شملہ میں ہوئی تھی، جبکہ انھوں نے نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس دہلی کے سالانہ اجلاس منعقدہ شملہ کا افتتاح فرمایا تھا۔

••

شاہد رام نگری

شاہد رام نگری صاحب پ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء رام نگر، بنارس۔ تعلیم و تربیت والد مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کے زیر سایہ مکمل ہوئی۔ ادب و صحافت کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ۱۹۵۵ء میں پٹنہ آگئے اور روزانہ ساتھی کے ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ یہ رسالہ صحافتی زندگی میں مختلف روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کی ادارت کی۔ ابوالکلام اکادمی کا الکلام ان میں قابل ذکر ہے۔ ان دنوں امارت شرعیہ کے ترجمان "نقیب" کے مدیر اعلیٰ کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔

••

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملاقات یا بالمشافہ گفتگو کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ جب وہ بہار کے گورنر نامزد ہوئے تو اس وقت میں روزنامہ 'ساتھی' کی ادارت سنبھال چکا تھا۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد بہار میں عبدالقیوم انصاری، ابوالاحد محمد نور اور سید محمد عقیل وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے ابوالکلام اکادمی کا قیام عمل میں آیا، تو گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور وزیر اعلیٰ شری بابو سے اس کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور کر لی۔ ابوالکلام اکادمی کی افتتاحی تقریب شاندار پیمانے پر منعقد ہوئی۔ اس میں شری بابو اور ذاکر صاحب دونوں شریک ہوئے۔ ذاکر صاحب نے مختصر مگر بڑی موثر تقریر کی۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں یکساں یہ خصوصیت تھی کہ سادہ الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی باتیں کہ جایا کرتے تھے۔ وہ قاری یا سامع کے ذہن کو مرعوب کرنے کے لیے بھاری بھرکم الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ابوالکلام اکادمی کی افتتاحی تقریب میں ہی مجھے پہلی بار ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

ابوالکلام اکادمی نے مولانا آزاد کی یاد میں ہفت روزہ 'الکلام' جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی ادارت بھی میرے ہی سپرد ہوئی۔ میں صحافت کے میدان کا نو وارد تھا۔ بہرحال جتنی بھر صلاحیت تھی میں نے پوری محنت سے 'الکلام' کو مرتب کیا۔ دو شمارے منظر عام پر آنے کے بعد ایک دن انصاری صاحب اور نور صاحب دونوں دفتر ساتھی میں آئے۔ انصاری صاحب نے ہنستے ہوئے مبارکباد دی اور کہا کہ آپ امتحان میں پاس ہو گئے۔ ان کی بات میں سمجھ نہیں پایا، پوچھا کیسا امتحان؟ بولے کل شب ہم سر سلطان کے یہاں ایک تقریب کے سلسلے میں ہم لوگوں کی دعوت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی آئے تھے۔ انھوں نے مجھے خاص طور پر بلا کر 'الکلام' کے اجرا پر مبارکباد دی اور معیار کو سراہتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس وقت مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی کہ مجھ جیسے نا تجربہ کار کی کوشش کو ذاکر صاحب جیسے باذوق اور صاحب نظر نے پسند کیا اور سراہا۔ اس کے بعد بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھا تو انصاری صاحب نے بتایا کہ جب 'الکلام' کے اجرا کا پروگرام ہم لوگوں نے بنایا اور اس سے ذاکر صاحب کو آگاہ کیا تو انھیں بڑا تامل ہوا۔ بولے کہ اخبار کے معاملے میں مولانا آزاد بڑے باذوق تھے اور ان کا معیار بہت

بند تھا۔ اگر اخبار معیاری نہ ہوا تو اس سے مولانا کی روح کو تکلیف ہوگی۔ چونکہ یہ اخبار ان سے منسوب ہوگا اس لئے نکلے تو ہر لحاظ سے معیاری ہو، ورنہ بہتر ہے کہ نکلا ہی نہ جائے۔ انصاری صاحب نے کہا کہ اس انتباہ کے بعد ذاکر صاحب کا اظہار پسندیدگی کوئی معمولی بات نہیں۔ تب مجھے اور زیادہ خوشی ہوئی، ویسی ہی خوشی جیسی طالب علموں کو امتحان پاس کرنے پر ہوتی ہے اور واقعی اس وقت صحافت کے میدان میں میری حیثیت طالب علم ہی کی تھی۔ مولانا آزاد کے مداحوں میں غلام رسول مہر، شورش کاشمیری، حامد الانصاری غازی، مولانا فارقلیط اور عبدالرزاق ملیح آبادی جیسے صحافی موجود تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ابوالکلام اکادمی کے حوالے میں پہلے سبقت کی اور 'الکلام' کی ادارت کی سعادت میرے حصہ میں آئی۔

مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کے بارے میں میرا ایک عام تاثر یہ ہے کہ ان کے جاننے والے تو بہت ہیں لیکن پہچاننے والے کم ہی لوگ ہیں۔ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کی زبان سے یہ بات سنی ہے کہ مولانا آزاد زندگی کے آخری دنوں میں مایوسی کا شکار ہو کر مہر بلب ہو گئے تھے اور ذاکر صاحب میدان عمل چھوڑ کر راشٹرپتی بھون کے گوشہ عافیت میں جا بیٹھے تھے۔ اس کے برعکس میرا تاثر یہ ہے کہ اگر مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نہ ہوتے تو آج جیسا ہندوستان ہمارے سامنے ہے ویسا نہ ہوتا بلکہ ہم اُس ہندوستان میں رہ رہے ہوتے جس کا خاکہ سردار پٹیل اور گرو گولوالکر کے ذہن میں تھا۔ جواہر لال نہرو، گاندھی جی کے دباؤ سے وزیر اعظم کی حیثیت سے قبول کر لئے گئے تھے، لیکن نہ تو پارٹی ان کے ہاتھ میں تھی اور نہ حکومت میں ان کی بات چلتی تھی۔ ہوتا وہی تھا جو سردار پٹیل چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام میں جو مقبولیت اور محبوبیت نہرو جی کو حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور اسی لئے جب کبھی اپنی بات منوانے کے لئے نہرو جی اپنی شخصیت کو داؤں پر لگا دیتے تھے تو سردار پٹیل کو جھک جانا پڑتا تھا۔ سردار پٹیل کے ذہن میں ہندوستان کا جو نقشہ تھا اس کی عکاسی ہندو، ہندی، ہندستان کے نعرے سے ہوتی ہے۔ اس نقشے میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلمان اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے" اب جو ہندوستان بچا ہے اس کو ویسا بنانا ہوگا جیسا ہندو چاہتے ہیں۔ جبل پور کے فساد کے بعد 'نو بھارت ٹائمز' نے فسادات کی جڑ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تو مشہور صحافی وشنو لال پربھاکر نے اپنے ایک مضمون میں بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس بات کی نشان دہی کی کہ ان فسادات کے پیچھے کون سی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ پربھاکر جی نے لکھا تھا کہ بٹوارے کے بعد ہندوستان میں مسلم کشی کا جو طوفان آیا اس کی قیادت میدان میں

آر، ایس، ایس والے اور حکومت میں سردار پٹیل کر رہے تھے۔ جب سارا شمالی ہندوستان مسلمانوں کے خون سے نہا گیا اور دنیا بھر میں رسوائی ہونے لگی تو سردار پٹیل نے آر، ایس، ایس کے لوگوں کو پکار کر کہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ یہ چار کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان کو یہیں رہنا ہے۔ نہ تو ان سب کو تہ تیغ کرنا ممکن ہے اور نہ ان سب کو لاد کر سرحد پار پہنچایا جا سکتا ہے، اس لئے کرنا صرف یہ ہے کہ انھیں ہندوستان میں رہنے تو دیا جائے لیکن اس طرح جیسے زہر کا دانت نکالا ہوا سانپ رہتا ہے۔ پرجا کرجی کا خیال تھا کہ مسلم کش فسادات زہر کا دانت توڑنے کے عمل کا ہی ایک حصہ ہے۔

اس بظاہر غیر متعلق تفصیل کا مقصد اس جملے کا پس منظر پیش کرنا ہے کہ اگر مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نہ ہوتے تو آج جیسا ہندوستان ہمارے سامنے ہے، ویسا نہ ہوتا۔ یہ دونوں غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان تھے۔ ان کی خدمات اور کارہائے نمایاں کی فہرست بڑی طویل ہے، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس بازی کو پلٹ دیا جو مسلمان پوری طرح ہار چکے تھے۔ بے سروسامانی کی حالت میں بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو انھوں نے آواز دی "کھیل ختم نہیں ہوا ہے تم صرف ایک مورچہ ہارے ہو۔ تمھیں ہندوستان کی اور ہندوستان کو تمہاری ضرورت ہے۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں تمھیں اہم کردار ادا کرنا ہے۔" اس آواز پر اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔ ۱۹۴۷ء میں چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں تھے۔ آج ۱۹۸۲ء میں دس کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اصل تعداد پندرہ کروڑ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں ڈیوڑھی یا دوگنی تعداد میں رہ رہے ہیں، ان میں ہمت ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے۔ وہ شکست خوردہ قوم کی طرح نہیں، نبرد آزما گروہ کی طرح میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔

کبھی کبھی چپ رہنا بولنے سے زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب جیسے لوگوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر انتہائی ناموافق حالات میں جو کام کیا دراصل وہ خاموشی سے ہی کرنے کا کام تھا اگر وہ داد تحسین کے لئے اپنے کاموں کا پروپیگنڈا کرتے تو وہ نہ کر پاتے۔ مخالف زیادہ منظم اور طاقتور تھے، اس لئے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے انھوں نے خاموشی سے کام کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی۔ انھیں نہ داد تحسین کے پھولوں کی حاجت تھی، نہ تنقید و تنقیص کے نشتروں کا خوف۔ البتہ اسباب کا قلق ضرور رہا کہ وہ کم نظر اور بے بصیرت لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے جو وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اکمل یزدانی جامعی

جناب محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی : (پ ۱۹۲۹ء
بڑہاسی ضلع پورنیہ جہاں آپ کے آباء و اجداد ایران
سے آکر آباد ہوئے تھے)، ۱۹۴۳ء میں میٹریکولیشن،
۱۹۴۷ء میں (سی۔ ایم کالج دربھنگہ) آئی۔ اے اور
۱۹۴۹ء میں جامعہ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۰ء میں آگرہ
یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ ۵۲ تا ۱۹۵۵ء
آئینہ، عمل، انسان اور ساحل مختلف اخبارات و
رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۵ء سے
دیوار بخش ہائی اسکول بیرنگر، پورنیہ میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔
(۱۹۵۸ء میں پٹنہ ٹریننگ کالج سے ڈپ۔ ان۔ ایڈ کیا)
آپ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں
جن میں سے "پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت" بہار اردو اکادمی
کے مالی تعاون سے شائع ہو چکی ہے۔ باقی کتابیں غیر مطبوعہ
ہیں۔ انگریزی اور اردو میں آپ کے متعدد مقالات شائع
ہوئے ہیں۔

••

بیرنگر ضلع پورنیہ (بہار) کے سب ڈویژن اررِیہ کے قدیم تھانہ رانی گنج اور جدید تھانہ بھرگاما میں واقع ہے۔ ضلع پورنیہ کے صدر مقام سے اس کی دُوری ۲۰ میل اور سب ڈویژن کے صدر مقام اررِیہ سے بھی تقریباً اتنے ہی میل ہے۔ تقریباً دو سو سال تک دریائے کوسی کے غیظ و غضب کا شکار یہ دور افتادہ علاقہ اس کے چنگل سے رہائی کے بعد عرصہ تک فیل قد اور گنجان گھاس اور گھنے جنگلات سے بھرا رہا اور شیر، چیتے، جنگلی ہرن اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آماجگاہ بنا رہا اور شکاریوں کی فردوس کہلاتا رہا۔ البتہ مویشیوں کی چراگاہ ہونے کے سبب سے یہاں کا گھی مشہور تھا جو مویشی پالنے والوں کے مصرف میں برائے نام ہی آتا۔ رانی گنج سے کلکتہ وغیرہ کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اسی لیے اکثر پرانے اور کچھ نئے جغرافیہ میں رانی گنج کا گھی مشہور ہونا لکھا گیا ہے۔ دوسری چیز جس کے لیے اس طویل و عریض علاقہ رانی گنج خصوصاً علاقہ بیرنگر نے شہرت پائی تھی وہ اس کا ہمہ جہتی پچھڑا پن ہے۔ جس نے اب تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ذاکر صاحب ۱۹۵۹ء کی ۱۸ فروری کو اسی بیرنگر نامی مقام پر تشریف فرما ہوئے، وہ اس وقت بہار کے گورنر تھے۔

وائس چانسلر بناکر وہ علیگڑھ بھیجے جانے والے تھے اس لیے جامعہ میں ان کی زیارت و ملاقات کا موقع ملا مگر جتنا بھی ملا ان کی ذات گرامی سے گہری عقیدت کی بنیاد پر ان کی ایک ایک بات میرے دل میں گھر کرتی اور ان کی ایک ایک ادا بھاتی رہی، وہ علیگڑھ چلے گئے جو میرے لیے ایک بڑا سانحہ تھا۔ جامعہ بے رونق معلوم ہونے لگی، مگر یہ ناکارہ، جب بھی وہ جامعہ آتے اپنے متعلق ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ علیگڑھ چلے گئے تو وہاں جاکر بھی اپنے متعلق مشورہ کرتا اور وہ بیحد شفقت و محبت سے مجھے اپنی گراں قدر آراء سے نوازتے رہتے۔ میں نے معاشیات میں ایم۔ اے انہی کے حکم سے کیا اور تعلیمی کام کو پیشہ بنایا۔

جامعہ میں انھوں نے یہ روایت قائم کر رکھی تھی کہ طلبا اساتذہ سے بے تکلف ہوں اور کھل کر باتیں کریں۔ کلاس میں بھی، سرِراہ بھی، کھیل کے میدان میں بھی اور کوٹھی پر جاکر بھی۔ جامعہ کے اساتذہ کے دروازے ہر وقت طلبا کے لیے کھلے رہتے۔ ایسا یا موقع محل کی قید کم تھی، بے موقع بھی وہ ان سے مل سکتے تھے۔ میرے ایک

دوست ہیں مولوی زین العابدین صاحب ندوی جامعی پورنوی۔ میرا ان کا ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ پروفیسر کلاٹ صاحب پرنسپل جامعہ کالج، عابد حسین صاحب، پروفیسر عاقل صاحب، مولانا اسلم جیراج پوری، خواجہ عبدالحی فاروقی شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب، پروفیسر قیصر زیدی صاحب سب کے ہاں جانا ہوتا۔ ان کے ملنے میں وقت بے وقت کی قید نہیں تھی۔ وہ حضرات اس قدر عالی ظرف تھے کہ ۱۲ بجے، ایک بجے گرمیوں کے دنوں میں بھی جبکہ سونے کا وقت ہوتا تھا، طلبا ان کا دروازہ کھٹکھٹاتے مگر ان کے ابرو پر شکن نہ آتا۔ ہم اور زین العابدین صاحب اساتذہ کے اذنِ عام سے فائدہ اٹھا کر ان کو دق کرنے کے لیے کوٹھی پر جا دھمکتے، دستک دینے پر سب کے ہاں سے ایک ہی قسم کی آواز آتی "بہت اچھا" اور دروازہ کھل جاتا، خود ہی السلام علیکم کہہ کر دروازہ کھولتے اور بڑی خندہ پیشانی اور بڑے تپاک سے ہم بدتمیزوں اور گستاخوں کا خیر مقدم ہوتا۔ بسکٹ، چائے، پھل سے تواضع تو ہوتی ہی تھی۔ گھنٹوں متعلق، غیر متعلق، پبلک پرائیوٹ، مقامی، غیر مقامی ہر طرح کی باتیں کرتے اور ان کا مناسب اور تشفی بخش جواب ملتا۔ ان حضرات کو خواہ ہم کتنے ہی بے وقت پہنچے ہوں، یا باتوں میں کتنی ہی دیر ہو رہی ہو، یہ فرماتے نہیں سُنا کہ اب تشریف لے جائیے۔ روایت یہ تھی کہ جامعہ کے خواہ کتنے ہی بڑے عہدے دار یا استاد کے ہاں خواہ کسی درجہ کا طالب علم یا آدمی پہنچے، وہ حضرات سلام میں سبقت کی کوشش فرماتے، بیٹھے ہوں تو سروقد کھڑے ہو جاتے اور آنے والے کو بیٹھا لینے کے بعد خود تشریف رکھتے۔ جہاں تک اس ناکارہ کا گمان ہے اس روایت کے موجد ذاکر صاحب ہی تھے اور جیسا کہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، وہ ان کو برتنے میں سب سے آگے تھے۔ ان کو سلام کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ذاکر صاحب نظریں نیچی کئے ہوئے چلے آ رہے ہیں آپ ابھی دُور ہی ہیں اور سلام کرنے کی تیاری ہی کر رہے ہیں کہ اُدھر سے قرأت کے ساتھ اچانک السّلام علیکم کی آواز آ گئی اور آپ منھ دیکھتے ہی رہ گئے۔

جامعہ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ گاہے بگاہے طلبا اپنے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جن جن کی دعوت ہوتی وہ مقررہ وقت پر تشریف لاتے۔ حسبِ موسم ناشتہ، لسی، چائے وغیرہ سے ان کی تواضع ہوتی۔ طلبا کا کچھ تفریحی پروگرام ہوتا تھا۔ مثلاً گانے کا، کھیل کا۔ اساتذہ کھیل اور کھانے دونوں میں شریک ہوتے اور مل جل کر کھیلتے کھاتے۔ گھنٹے دو گھنٹے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ غفار منزل کے کالج کے طلبا نے جن میں میں بھی شامل تھا اساتذہ کی دعوت کی۔ ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور دو ایک اساتذہ تشریف لائے۔ ہم لوگوں نے مختلف پھلوں، شربت، لسی اور ملائی برف سے ان کی تواضع کی۔ تاش، لوڈو، کیرم بورڈ وغیرہ کا کھیل بھی

ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کسی جماعت میں مجیب صاحب شریک ہوئے، کسی میں اور اساتذہ۔ کچھ طلبا کے ساتھ ذاکر صاحب الگ بیٹھ گئے اور بنفس نفیس تاش کا کھیل دکھانے لگے۔ ان کو تاش کے بہت سے کھیل آتے تھے۔ گراموفون بھی بج رہا تھا، اس میں ایک گانا ایسا تھا جو فحش تو نہیں تھا، جامعہ کے لحاظ سے غیر معیاری ضرور تھا۔ ذاکر صاحب ہنسی خوشی کھیلتے کھاتے رہے، مطلق پتہ نہ چلنے دیا کہ ان کو ناگوار ہو رہا ہے۔ جب مجلس ختم ہو گئی اور ہم لوگ ان لوگوں کو پہنچانے کے لئے دُور تک ساتھ ساتھ گئے" تو کانوں کان مجلس کے سکریٹری سے کہا گیا کہ سکریٹری کو ہر چیز کا خیال رکھنا چاہیے، مجلس میں کوئی بھدی چیز پیش نہیں کرنی چاہیے۔

ذاکر صاحب فطرتاً تعلیمی آدمی تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے اُستاد کو طلبا کا ادب و احترام کرنا چاہیے اس کو وہ بنیادی اصول کہتے تھے۔ اپنی تعلیمی تقریروں میں بھی وہ اس بات پر بڑا زور دیتے تھے۔ ایک تقریر میں انہوں نے جہاں تک یاد ہے یہ فرمایا: "استادوں سے بھی میری یہی التجا ہے کہ آپ بھی اپنے شریف کام کا بنیادی اصول اسی ادب و احترام کو بنائیں۔ یہ اصول ذہن نشین ہو گیا تو تعلیم کے کام میں آپ کا سارا رویہ بدل جائے گا۔ یہ اصول غالباً انھوں نے ان حدیثوں سے لیا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ اولاد کا اکرام کیجیے۔ اَکْرِمُوا اَوْلَادَکُم اور یہ کہ جو بڑوں کا ادب نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ان کو اس اصول پر سختی سے کاربند پایا۔ وہ سلام میں سبقت کرتے۔ طلبا کی عزت فرماتے۔ ملنے والا ان سے مل کر یہ سمجھتا تھا کہ میں بھی کوئی اہمیت رکھتا ہوں۔ جب کبھی ان سے ملنے کا شرف ہوا، خواہ تخلیہ میں، خواہ مجلس میں ایسا لگا جیسے وہ اس حقیر کو اپنے سے بڑا تصور کر رہے ہوں۔ معلمی کے دور میں بھی یہ بات دیکھی اور جب وہ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے یہی بات نظر آئی۔ ملنے جائیے تو سلام کرنا اور کھڑا ہو جانا، بٹھا لینا پھر بیٹھنا۔ وہ خاص طور پر طالب علموں اور تعلیم دینے والوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کو بہت اہمیت دیتے اور چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی قدر کریں، اُن کو معزز و محترم سمجھیں۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے، ایک بار گورنر ہاؤس پٹنہ میں ان سے ملنے گیا۔ دیر تک تعلیمی مسائل پر بات کرتے رہے۔ نصیحت فرماتے رہے۔ وقت مقررہ ختم ہوا تو ان کا اے۔ ڈی۔ سی آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ مجھ پر غالباً یہ ظاہر کرنا تھا کہ تمہارا وقت ختم ہو چکا۔ ذاکر صاحب کو اس ناچیز سے باتوں میں منہمک دیکھ کر چلا گیا۔ ذاکر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت دیر کے بعد پھر اے۔ ڈی۔ سی داخل ہوا اور یہ کہا کہ سری بابو (شری کرشن سنہا، وزیر اعلیٰ بہار) آگئے ہیں، دیر سے منتظر ہیں۔ یہ انھیں کا

وقت تھا۔ ذاکر صاحب اور باتیں کرتے رہے۔ اب یہ احساس ہوا کہ ذاکر صاحب میرا دل توڑنا نہیں چاہتے مگر یہ وقت دوسرے کا ہے۔ میرا وقت بہت دیر پہلے ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا بول اٹھا کر اب اجازت ہو۔ فرمایا بہت اچھا پھر کب ملے گا؟ اور میرے کاندھے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے باہر نکل کر دو چار باتیں نصیحت اور رازداری کی کہتے رہے۔ باہران کے ے۔ ڈی۔ سی سیکریٹری اور دوسرے لوگ مجھے گھورتے رہے کہ آخر یہ حقیر فقیر جیسا آدمی ہے کون جسکی اتنی پذیرائی ہو رہی ہے۔ میں سلام کرکے چلا آیا۔ بعد میں میں نے سوچا کہ انھوں نے ایسا یہ ظاہر کرنے کیلئے کیا کہ ان کی نظر میں مجھ جیسے نالائق اور حقیر شاگرد اور گھٹیا درجہ کے استاد کی بھی اہمیت کسی بڑے سیاسی آدمی یا حکومت کے کسی سربراہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔

اسی طرح ۱۸ر فروری ۵۹ء کو جب وہ بیرنگر سے پورنیہ لوٹ گئے، تو دوسرے دن یعنی ۱۹ر فروری ۵۹ء کو ضلع بھر کے مختلف طبقہ اور پیشہ کے لوگوں کے وفود سے انھوں نے ملاقات کی۔ باری باری سے لوگ بلائے جاتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ضلع بھر کے پرائمری، سکنڈری، کالج وغیرہ کے نمائندے بھی باری باری سے ان سے ملے۔ جب وکلا کے نمائندوں کے گروپ سے وہ باتیں کر رہے تھے، اس بیچ میں پرائمری اسکول کے نمائندے بھی آ گئے اور قریب کی جگہ پُر دیکھ کر دور جا کر بیٹھ گئے۔ جب ذاکر صاحب کو بتایا گیا کہ پرائمری کے اساتذہ کا گروپ آ گیا ہے، تو انھوں نے ان اساتذہ کو اپنے قریب یہ کہکر بلایا کہ آپ حضرات ادھر تشریف لائیے۔ آپ میری برادری کے آدمی ہیں۔ ذاکر صاحب مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے بھی اپنا شمار اساتذہ کے ساتھ کرانا پسند کرتے تھے اور ان کے عزت و اکرام کا لحاظ رکھتے تھے۔ انھیں سماج میں سب سے اونچی جگہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔

ذاکر صاحب بیرنگر تشریف فرما ہوئے تو ایک پبلک جلسہ بھی رکھا گیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ سودھا منسوچیا جہانی صدر جلسہ تھے۔ جب سپاسنامہ پڑھا جا چکا اور ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں تقریر شروع کی تو اس طرح شروع کی کہ "محبوب الرحمٰن صاحب، سبھاپتی جی بزرگو اور دوستو!" میرے نام سے تخاطب کے آغاز کا مطلب شاید یہ تھا کہ اس ناکارہ کی احساس کمتری دور ہو اور لوگ مجھے جان جائیں۔ پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ "محبوب الرحمٰن میرے عزیز شاگرد ہیں اور چونکہ اس پسماندہ علاقہ میں وہ تعلیمی کام کر رہے ہیں، میں ان کو اور ان کے تعلیمی کام کو دیکھنے کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔" انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ ان کی ہمت افزائی کیجیے، ان کا دل بڑھائیے۔ ان کے کام میں ان کی مدد کیجیے تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور یہ پورے دلجمعی سے آپ کے پچھڑے ہوئے علاقہ میں کام کر سکیں۔ تعلیمی کام، وقت اور صبر چاہتا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ دیر میں نکلے گا۔ لہٰذا صبر سے کام لیجیے۔ آپ کو اس کا پھل ملے گا۔"

سپاسنامہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ "یہیں، آپ کی یہاں تشریف آوری سے اچنبھا ہوا اور یہ شعر بھی تھا :

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ٭ کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "آپ کو میرے یہاں آنے پر حیرت ہوئی۔ شاید اس لیے کہ یہ پچھڑا علاقہ ہے اور ریاست بہار کا پسماندہ خطہ ہے۔ یہاں میں کیسے آ گیا۔ پسماندہ جگہوں میں اگر گورنر نہ جائیں، منسٹر اور چیف منسٹر نہ آئیں تو آخر پسماندہ علاقے کیسے اُوپر اٹھیں گے۔" پھر انہوں نے فرمایا کہ "میں تو خاص کر ایسے ہی علاقوں میں جایا کرتا ہوں، جو پچھڑے ہوئے ہیں۔"

تعلیمی کام کرنے والے شاگردوں اور شاگرد استادوں کی ان کے دل میں کتنی قدر و منزلت تھی اور وہ ان کے کام کے لیے کس قدر فکرمند رہتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیجیے کہ ذاکر صاحب اپنی گورنری کے دوران میں تو اس ناکارہ اور اس کے منتخب کردہ علاقہ بیرنگر سے گہری دلچسپی رکھتے ہی رہے، اور جن جن سے مجھے واسطہ پڑ سکتا تھا اور میرا کام ہو سکتا تھا، ان سے میرے متعلق بڑھا چڑھا کر پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے، مگر جب وہ نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ کی کرسی پر دلی تشریف لے گئے، تو ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس علاقے سے جو لوگ ان سے ملنے دلی جاتے ان سے پوچھتے رہتے اور ان کی توجہ میرے کام کی طرف مبذول کراتے رہتے۔ موجودہ ممبر پارلیامنٹ شری ڈومر لال بیٹھا (ارارگنج) پورینہ کا بیان ہے کہ جب وہ اور ان کے ساتھی راشٹرپتی بھون میں اُن سے ملتے تو اُن سے میرا اور میرے کام کا ذکر کرتے اور ان کا اس لیے اعزاز فرماتے کہ وہ اس پچھڑے علاقہ کے نمائندہ ہیں، جہاں ان کا ایک شاگرد تعلیمی کام میں مشغول ہے۔ یہ بات مجھے بیٹھا جی نے کہی، جب وہ بہار کے منسٹر تھے اور میرے کام میں مدد فرماتے رہے۔

ذاکر صاحب نے جو بھی گرامی نامے راقم الحروف اور نالائق شاگرد کو لکھے ہیں، ان میں سے اکثر کو انہوں نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا ہے اور ان پر پتے بھی اپنے ہی ہاتھوں سے درج فرمائے ہیں۔ یہ دستور انہوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدے پر جا کر اور مشاغل کے ہجوم میں بھی قائم رکھا، حالانکہ وہ کم از کم پتے تو ٹائپ کروا سکتے تھے۔ یہ ان کی اپنے ایک ناکارہ شاگرد پر گہری عنایت و محبت کی علامت تھی۔ دیدار بخش ہائی اسکول کے معائنہ کے سلسلے میں انہوں نے اسکول کے وزیٹرس بک میں جو معائنہ نوٹ دیا ہے، وہ بھی ان کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے اس حقیر شاگرد اور اس کے رفقاء کار اور ان کے تعلیمی کام کا تذکرہ بڑے اونچے الفاظ میں فرمایا ہے:

"۱۸ فروری ۱۹۵۹ء کو دیدار بخش ہائی اسکول بیرنگر، آکر مجھے خوشی ہوئی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر محبوب الرحمٰن میرے پرانے شاگرد ہیں۔ اس لیے خاص طور پر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کتنی توجہ اور خلوص سے یہ اور ان کے رفقاء کار ریاست کے اس پس ماندہ علاقے میں ایک اچھے اسکول کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اسکول میں مل جل کر کام کرنے کا بڑا اچھا ماحول ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یہ ایک بہت اچھے اسکول کی شکل اختیار کرے گا اور تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔" (ترجمہ)

اسی طرح کے کئی واقعات ان کی پورنیہ اور بیرنگر تشریف آوری کے سلسلے میں پیش آئے۔ میں نے علاقہ بیرنگر میں تعلیمی کام شروع کیا تھا۔ جب وہ بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ تشریف لائے تو ان سے بار بار ملنا ہوا۔ وہ میرے کام سے دلچسپی رکھتے تھے اور بار بار تاکید فرماتے رہتے تھے کہ جم کر تعلیمی کام کرتے رہو۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے کام سے باخبر رہنا چاہتے تھے اور گفتگو اور خطوط کے ذریعہ ہمت افزائی بھی کرتے رہتے تھے۔ اپنی مشکلات کا حال لکھ کر بھیجتا تو بڑی شفقت اور محبت سے تسلی دیتے اور ہمت افزائی فرماتے رہتے۔ ایک بار ایک خط میں بہت ساری پریشانیوں کا ذکر کر کے ان سے دبے لفظوں میں درخواست کی کہ ایک تو یہ زمین شور ہے، دوسرے ہائی اسکول میں بڑی پابندیاں ہیں، آزادانہ تعلیمی کام کا موقع نہیں ہے، آپ مجھے کسی اور کام پر لگا دیں۔ جواباً اور باتوں کے علاوہ ارقام فرمایا: ع "آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم" میں خاموش ہو گیا۔ ایک بار ملنے پر فرمایا "آپ کام کرتے رہیے گھبرائیے نہیں۔ میں کبھی پورنیہ آیا تو آپ کے کام کو دیکھوں گا۔" میں نے اپنی حماقت سے یہ سمجھا کہ محض دلدہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔ بھلا بیرنگر بھی گورنر اور خصوصاً ذاکر صاحب کے جانے کی جگہ ہے! بات ذہن سے اتر گئی۔

۱۹۵۹ء کی فروری میں جب ان کا پورنیہ آنے کا پروگرام بن گیا، مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ میں پٹنہ اسکول کے کام سے گیا، تو ان سے بھی ملنے گیا، میرا ان سے ملنے کا مقصد، ان کی ذات بابرکات سے استفادہ اور ان سے تعلیمی مشورے لینا اور نصیحت حاصل کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی قسم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس بار اندر جاتے ہی سلام و معانقہ کے بعد انھوں نے فرمایا "آپ سکریٹری صاحب سے ملنے آئے ہیں (گورنر کے سکریٹری بھٹناگر صاحب)" میں نے عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا جاتے وقت مل لیجئے گا۔ پورنیہ کا پروگرام بن گیا ہے۔ یہ

دہاں جارہا ہوں کیا آپ وہاں ملیں گے؟" میں نے عرض کیا حضور حاضر ہوں گا۔ فرمایا "ہوائی اڈے پر آپ موجود رہیں گے؟" میں نے عرض کیا انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا اور یہ بھی فرمایا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے کام کو دیکھنے کے لئے بیر نگر بھی جاؤں۔" میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بیر نگر جانے میں ذاکر صاحب کو کیا کیا زحمتیں اٹھانی پڑیں گی اور ضلع مجسٹریٹ صاحب پہ اور خود اس ناکارہ پر کیا بیتے گی کیونکہ بحیثیت ذاکر صاحب اب گورنر بھی تو ہیں اور وہاں ہے ہی کیا ان کے شایان شان کہ میں ان کو دکھاؤں گا۔ میں تھوڑی دیر خاموش ہو گیا۔ پھر عرض کیا کہ بیر نگر پورنیہ کے صدر مقام سے ۳۰ میل پر ہے، وہاں جانے کے لئے کوئی پکی سڑک نہیں ہے اور دس بارہ میل تک تو کچی سڑک کا بھی نام و نشان نہیں۔ ہم لوگ پیدل اور کبھی کبھی بیل گاڑی سے وہاں جاتے ہیں؛ دوسرے وہ جگہ آپ کے تشریف لے جانے کی نہیں ہے، لے دے کے بس ایک چھوٹا موٹا سا اسکول ہے۔ ایک تو آپ کو وہاں جانے میں بے حد زحمت اٹھانی پڑے گی، دوسرے ضلع حکام کو بھی دقتیں ہوں گی۔ یہ کہنا تھا کہ خفا ہو گئے اور فرمایا "آپ مجھے تکلیفوں سے ڈراتے ہیں۔ میں تکلیفوں سے نہیں ڈرتا۔ میں تو کھوج کھوج کر پسماندہ علاقوں میں جاتا ہوں اور خصوصاً ایسی جگہوں پر تو ضرور جاتا ہوں جہاں تعلیمی کام ہو رہا ہو، خاص کر جہاں میرا کوئی طالب علم تعلیمی کام کر رہا ہو۔ کچھ دنوں پہلے میں بھاگل پور ضلع کے مندار ہل (Mandar Hill) گیا تھا، وہاں بالکل پسماندہ علاقے میں میرے ایک شاگرد مادھو تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ میں وہاں ان کے کام کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ پچھڑی ذات کے لوگوں میں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔" میں چپکا سنتا رہا۔ پھر انھوں نے پوچھا "آپ مادھو جی کو تو جانتے ہوں گے؟" میں نے عرض کیا "جی نہیں وہ کون ہیں؟" پھر انھوں نے ان کا ذکر کرنا شروع کیا کہ "مادھو نامی ایک بے خانماں بچہ دلی کی سڑکوں پر بھٹک رہا تھا، جامعہ انھیں اٹھا لائی، ان کی تعلیم و تربیت کی۔ وہ مدراس کے رہنے والے تھے۔ جامعہ سے فراغت کے بعد مدراس چلے گئے۔ پھر بالکل پتا نہ چلا کہ وہ کہاں ______ گئے اور کیا کرتے رہے۔ جب میں گورنر ہو کر پٹنہ پہنچا تو وہ ملنے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور آدی باسیوں میں بڑا اچھا تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ میں ان کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بڑی محنت اور سلیقہ سے کام کر رہے ہیں۔ آپ کو وہاں جانا چاہیے۔ ان سے ملنا چاہیے اور ان کے کام کو دیکھنا چاہیے۔" میں نے عرض کیا انشاء اللہ جاؤں گا۔ ہاں تو مادھو جی اور ان کے کام کے متعلق بیان کرنے کے بعد انھوں نے پھر بیر نگر جانے کا ذکر کیا۔ اور فرمایا "تکلیف تو مجھے کچھ نہیں ہوگی، البتہ ضلع مجسٹریٹ کو ہوگی، اس لئے کہ میں ان کا مہمان

وں گا۔" پھر انھوں نے سنایا کہ "ایک دفعہ کوئی ضلع مجسٹریٹ انھیں کسی سیٹھ کی دعوت پر لے گیا۔ محکمہ سراغ رسانی والوں نے اوپر رپورٹ کردی کہ ضلع مجسٹریٹ گورنر کو چور بازاری کرانے والے کے ہاں لے گیا تھا۔ پھر بیچارے کی شامت آگئی اور نوکری کے لالے پڑنے لگے۔" میں نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے کوئی بات ایسی ہی جائے کہ ذاکر صاحب وہاں نہ جائیں۔ میں نے کہا اسی لئے تو عرض کر رہا ہوں کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں ضلع مجسٹریٹ آپ کو لے جانے کے لیے شاید تیار نہ ہوں گے۔ فرمایا "اچھا" آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ پورنیہ جاکر ان سے مل لیجئے اور ان پر ظاہر کیجئے کہ آپ سے میرے کیا تعلقات ہیں اور کہیے کہ میں بیزنگر جانا چاہتا ہوں آپ وہاں کا پروگرام بنائیں۔ اگر آپ کے کہنے پر وہ مجھے وہاں نہیں لے گئے تو میں جب پورنیہ جاؤں گا ان سے پوچھوں گا کہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں، آپ مجھے وہاں کیوں نہیں لے گئے؟" میں چپ ہوگیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر خود ہی فرمایا "اچھا چھوڑ دیجیے ابھی میرا ٹرم باقی ہے، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اللہ نے بڑی مصیبت سے نجات دی۔ اسکول آگیا اور ۱۸ تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔ غالباً ۱۶، ۱۷ فروری ۱۹۵۹ء کو ان کا پورنیہ کا کلا بھون میں پروگرام تھا۔

غالباً ہفتہ عشرہ قبل اسکول کے پڑوس کے پورنیہ کے کانگریس کے ایک بااثر لیڈر اور جنگ آزادی کے سپاہی آنجہانی سری سرجو نرائن کنور (مسکونہ چکلا تھانہ ہنمنکھی) اسکول تشریف لائے۔ وہ اسکول کے بہی خواہوں میں تھے اور میرے کام سے دلچسپی رکھتے تھے اور مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ وہ چونکہ کبھی کبھار اسکول آتے رہتے تھے، مجھے مسرت ہوئی۔ آفس میں بیٹھا تھا، اطلاع ملی تو فوراً حاضر ہوا۔ آداب پرنام خیر خبر کے بعد انھوں نے فرمایا "یزدانی صاحب معلوم ہے لاٹ صاحب آپ کے یہاں آرہے ہیں؟" وہ چونکہ بذلہ سنج آدمی تھے میں نے سوچا کہ چونکہ لاٹ صاحب (گورنر ذاکر صاحب) کا یہ ناکارہ شاگرد ہے اور پورنیہ کا پروگرام ہے، مذاق کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں معلوم ہوا ہے وہ پورنیہ تشریف لائیں گے۔ انھوں نے کہا "پورنیہ تو آ ہی رہے ہیں۔ ۱۸ فروری کو بیزنگر اور دیدار بخش ہائی اسکول بیزنگر آرہے ہیں۔" میں نے پھر بھی مذاق ہی سمجھا اس لئے کہ اس کا تو اب امکان ہی نہیں تھا۔

کہنے لگے "آپ غالباً مذاق سمجھ رہے ہیں، میں آپ سے واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ کلکٹر صاحب (حکم دری صاحب) سے میں کل مل آیا کہ وہ آپ کے لئے پریشان ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا کیوں؟ فرمایا "یہاں گورنر آرہے ہیں، انتظامات کے متعلق آپ سے مشورہ کرنا ہے، ان کو پٹنہ سے گورنر کے سکریٹری نے فون کیا تھا کہ

گورنر کے وہاں کوئی شاگرد ہیں۔ کلکٹر صاحب نے ان کو بیرپور کے متعلق کہا۔ لیکن ادھر سے کہا گیا کہ گورنر آپ کے ضلع کے بیرنگر جانا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ ان کے شاگرد کا نام یہ ہے۔ وہ ان کے اسکول جائیں گے انتظامات کیجئے اور یزدانی صاحب سے مل کر ان کو گورنر کے آنے کے وقت ہوائی اڈے پر ملنے کی اطلاع کر دیجیے۔ پھر تحریری حکم آیا جس میں آپ کا نام گورنر صاحب سے آپ کے تعلقات وغیرہ کا ذکر ہے۔ آپ کو چکرورتی صاحب بہت یاد کرتے ہیں، ان سے ضرور مل لیجئے۔" میں نے کہا اگر گورنر یہاں آنا چاہتے ہیں تو ان کو جو انتظام کرنا ہے، وہ کریں گے میں اپنے طور پر یہاں جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ مگر گورنر صاحب مُصر ہوئے، وہ میرے بزرگ تھے۔ میں ان کے کہنے پر چکرورتی صاحب سے ملا، بھڑک اٹھے اور فائل دکھایا کہ گورنر کے آفس سے ہی آپ کے یہاں کا پروگرام آیا ہے، آپ انتظامات میں میری مدد کریں۔ بیرنگر میں کیا پروگرام ہوگا یہ میرے ذمہ تھا۔ چنانچہ انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ کاٹ چھیل کر کٹھیری سے بیرنگر تک ۷ میل سڑک بنائی گئی اور استاد محترم ۱۸ فروری ۵۹ء کو ہمارے اسکول تشریف لائے۔

دو گھنٹے کا پروگرام تھا۔ علاقہ بیرنگر کی پبلک نے بڑی فراخدلی سے استقبال کا سامان کیا تھا۔ پروگرام میں دیدار بخش ہائی اسکول کا معائنہ، بچوں کے میلے کا معائنہ، بچوں کے گھر کا افتتاح، مڈل اسکول اور مدرسہ امداد الغربا کا معائنہ شامل تھا۔ کھانے کا کوئی پروگرام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہیں رکھا تھا، مگر پبلک نے ناشتہ چائے وغیرہ کا بھی نظم کر لیا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ گورنر کو یہاں کچھ کھانے پینے نہیں دیا جائے گا، تو مجھ پر برہم ہو گئے۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ گورنر کو کھلانا پلانا کوئی اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں سخت الجھن میں پڑ گیا کہ پبلک کو کیسے سمجھاؤں اور کلکٹر صاحب کو کیسے آمادہ کروں۔

کار اسکول کے دکھنی گیٹ کے باہر لگی تو علاقہ کے معزز لوگوں کا ان سے تعارف کرانے کے بعد ہم لوگ ان کو اندر لے آئے۔ کار پر ان کے ساتھ ڈی۔سی مسٹر اڈلی اور کلکٹر صاحب تھے۔ پروگرام شروع ہونے سے قبل ان کو آفس کے بغل والے کمرے میں صوفہ سیٹ پر آرام کے لئے بٹھا دیا گیا۔ مسٹر اڈلی اور چکرورتی صاحب کے علاوہ اس میں کوئی نہ تھا۔

مجھ پر بار بار عوام کا اصرار ہو رہا تھا کہ گورنر صاحب کو کچھ نہ کچھ کھلانے کی سبیل نکالی جائے۔ میں خاموش ہی رہا۔ اتنے میں آنجہانی سودھانسو جی (ملک کے ہندی کے بلند پایہ نقاد اور بہار اسمبلی کے سابق اسپیکر) کا بلاوا آیا، وہ آفس میں بیٹھے تھے، حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ "یزدانی صاحب پروگرام میں کھانے کا ذکر نہیں ہے، اور

پبلک کا سخت اصرار ہو رہا ہے، میرے پاس کچھ لوگ آئے تھے، میں نے کہا کہ یہ مسئلہ آپ ہی سے حل ہو سکتا ہے، کسی طرح کلکٹر صاحب کو راضی کیجیے۔" انھوں نے کہا "پروگرام میں نہیں ہے تو وہ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا "پھر لوگوں کو سمجھا دیجیے۔" انھوں نے فرمایا "دونوں ناممکن ہیں۔ اس کی بس ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ گورنر گرداور آپ چلیے۔ وہ آپ کی وجہ سے یہاں آئے ہیں، آپ خود جا کر کہیے، تو شاید بات بن جائے۔" میں گھبرا گیا کیوں کہ ذاکر صاحب کے موڈ سے میں واقف تھا۔ وہ بے اصولے پن اور بے ڈھنگے پن سے بے حد خفا ہوتے تھے۔ بہر نوع مرتا کیا نہ کرتا، ڈرتا ڈرتا کمرے میں گیا اور ان کے قریب پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی فراست مشہور تھی اس کا ایک تجربہ مجھے اور ہوا۔ جیسے ہی میں پیچھے کھڑا ہوا، انھوں نے انگریزی میں میرا تعارف مسٹر اڈلجی اور چکرورتی صاحب سے بڑے اونچے الفاظ میں کرانا شروع کیا: "یہ چپاں ہیں، یہ چنیں ہیں۔ میرے ایسے چہیتے ہیں۔ ویسے ہیں۔ میں انھیں کی وجہ سے یہاں آیا ہوں"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "ان کا جو کچھ پروگرام ہو ان پہ چھوڑ دیجیے اور جیسا چاہیں کرنے دیجیے" Let him do what he disires چکرورتی صاحب اور اے ڈی سی سر جھکائے سنتے رہے۔ میں جلدی سے آفس آگیا اور سودھا سنوجی کو مژدہ سنایا۔ اب تو پبلک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پروگرام کے بعد شریک ہوئے ناشتہ میں چائے میں بھی۔ ڈائننگ ہال میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں جو آگے قلمبند کی جائیں گی۔

سب سے پہلے انھوں نے بچوں کے گھر کا افتتاح کیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "بچوں کا گھر ہر اسکول بنا ہونا چاہیے"۔ میں نے ایک اسکیم بنائی تھی۔ ایکبار پٹنہ گیا تو اس کی ٹائپ شدہ کاپی لیتا گیا تھا۔ اس پر اوپر ہی موٹے حروف میں ٹائپ تھا Zakir Ideal Home for Children۔ پہلے انھوں نے اس کو شروع سے آخر تک دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور فرمایا کہ "ضرور قائم کریں"۔ لیکن یہ بھی فرمایا: "مگر یہ یاد رکھیے کسی زندہ آدمی کے نام پر کوئی ادارہ ہرگز قائم نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے نام پر قائم کرنے کی میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا، کسی ایسے بڑے آدمی کے نام پر قائم کر لیجیے جو مر چکے ہوں"۔ میں نے اصرار کیا، تو کچھ اسی قسم کے جملے فرمائے، "کسے پتا کہ مرتے وقت کس کا کیا حال رہے گا" اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ضبط سے کام لیا، ورنہ وہ شاید رو پڑتے۔ مجھے بعد قلق ہوا کہ میں نے یہ کیا کیا۔ لیکن چونکہ میں نے انھیں کے نام پر قائم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا وہ اجازت نہ دیتے تو میں ہرگز کسی دوسرے کے نام پر قائم نہ کرتا۔ ہمت کر کے کہا کہ پھر مجھے اس ادارے سے کیا دلچسپی میں قائم نہیں کروں گا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

میرا چہرہ دیکھ کر فرمانے لگے "اچھا بھئی! میں جب کبھی آپ کے ہاں آؤں گا تو آپ جو چاہیں گے کریں گے۔" پھر پوچھنے لگے "ابتدا کتنے بچوں سے کریں گے؟" میں نے کہا پانچ سے۔ "استاد کتنے ہوں گے؟" میں نے کہا ایک استاد اور اتالیق، فرمایا "ٹھیک ہے۔ کام کو دھیرے دھیرے ہی آگے بڑھانا اچھا ہوتا ہے۔ مگر فی الحال پانچ اور ایک کا تناسب تو ٹھیک ہے۔ بعد میں اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔" میں سمجھ نہ سکا کہ ان کا کیا مطلب ہے، تاڑ گئے۔ سوال کیا "ایک ماں باپ پانچ بچوں کو سنبھال سکتا ہے؟ ان کی پوری نگرانی، پڑھائی لکھائی تربیت ان کو ساتھ لے کر دستر خوان پر کھانا۔" میں نے کہا نہیں۔ فرمایا "یقین کرو؟" میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی فرمایا: "فطری یونٹ تو دو بچوں کا ہونا چاہیے جس طرح ایک باپ دو بچوں کو بسہولت سنبھال سکتا ہے، ایک اتالیق دو بچوں کی تعلیم و تربیت کما حقہ کر سکتا ہے۔ یہ ہے مشکل اور خرچیلا، مگر مقصود تو یہی ہونا چاہیے۔" پھر فرمانے لگے "میں نے جامعہ میں بارہ پر ایک اتالیق رکھا تھا، بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ میں نے غلطی کی تھی۔ یونٹ اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیے۔"

بچوں کے گھر ہی کے سلسلے میں فرمانے لگے: "پڑھی لکھی بوڑھی اور بیوہ استانیاں اگر آپ کو مل جائیں تو ابتدائی درجات کے لئے مناسب رہیں گی، فی الحال جیسا ممکن ہو کر لیجیے۔ اچھا، بچوں کے گھر کا نقشہ کیا بنوائیے گا؟" میں نے عرض کیا جیسا حضور فرمائیں گے۔ مجھے تو کوئی معلومات نہیں۔ فرمایا: "دلی میں مسٹر ... ہیں۔ ان سے رجوع کیجیے۔" میں نے عرض کیا جب خاکہ بناؤں گا تو آپ سے مل لوں گا۔ اور آپ جیسا فرمائیں گے اسی کے مطابق بنے گا۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بچوں کے گھر کا افتتاح بیر نگر کے پروگرام کا پہلا آئٹم تھا۔ افتتاح کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں دو یا تین چھوٹے چھوٹے بچے ایک میرا بڑا صاحبزادہ فاران شکوہ یزدانی جو ۷۔۸ سال کا تھا اور ایک میرا سالہ جاوید جو اس سے ایک سال بڑا تھا، اپنے اپنے ہاتھوں میں خوب صورت پھولوں کے بڑے بڑے ہار لئے ہوئے کھڑے تھے اور پہنانا چاہتے تھے۔ ذاکر صاحب کے گلے تک ان کا ہار تو پہنچ نہیں سکتا تھا۔ بچوں کو دیکھ کر خود زمین پر بیٹھ گئے اور ان بچوں کو ہار پہنانے کا موقع دیا۔ جب وہ پہنا چکے تو پھر انھیں اُتار کر انہی کے گلے میں پہنا دیا اور ان کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگے۔ بعد میں بتایا گیا کہ وہ کون ہیں۔ ذاکر صاحب کے پیار کی چاشنی سے وہ بچے ان سے فوراً مانوس ہو گئے اور ذاکر صاحب جب اسٹیج پر بیٹھے تو وہ بھی وہاں پہنچ گئے اور ان کے بغل میں بیٹھ گئے۔

ذاکر صاحب کو جتنے ہار ملے ایک ایک کرکے سب ان بچّوں کے گلے میں ڈالتے رہے۔ ذاکر صاحب جامعہ میں میلہ بھی لگواتے تھے، وہیں سے سیکھ کر میں نے بیر نگر میں بچّوں کا میلہ شروع کیا تھا۔ ان کے ورودِ مسعود کی خبر پر یہ میلہ ذرا بڑے پیمانے پر لگایا گیا تھا۔ میلے میں بچّوں کی دکانیں مختلف قسم کی اور بچّوں کا سیلون، بچّوں کا پوسٹ آفس، بچّوں کا پولیس اسٹیشن وغیرہ تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک ایک دکان کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ بچّوں سے ان کی دکانوں پر لاگت، آمدنی، اس کے حصے دار، حساب کتاب رکھنے کا طریقہ وغیرہ باتوں کے متعلق استفسار کرتے جاتے اور جو بچّہ ضد کرنے لگتا، اس کی کاپی پر اس کی دلدہی کے لئے دستخط بھی کر دیتے۔ "بچّوں کا سیلون" پر پہنچے تو کچھ بچّے، کچھ جوان سال حجاموں کو بال کاٹتے دیکھا، پوچھا یہ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ اسکول کے طلبا ہیں، جو ذات کے حجام ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ جہاں تک یاد آتا ہے فرمایا کہ "پیشہ کوئی برا نہیں ہوتا۔"

میلہ کمپاؤنڈ میں بھرگاما بلاک کی طرف سے مقامی کاشت کی پیداوار اور مقامی گھریلو صنعتوں کی نمائش بھی لگائی گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے مقامی گھریلو صنعتوں میں خصوصاً بیر نگر کی گھاس اور بانس سے بنی ہوئی چیزوں کو پسند فرمایا۔ چنانچہ یہاں بانس کا بنا ہوا ایک صوفہ سیٹ ان کو پیش کیا گیا۔ مقامی پیداوار کی نمائش کی چیزوں کے متعلق بتانے کے لئے بلاک سے محکمہ کاشتکاری کے افسران آئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھا، اس علاقہ کی مٹّی یہاں کی بعض پیداوار، بعض چیزوں کے متعلق جب وہ حضرات بتا نہ سکے تو خود ہی بہت سی نئی باتیں بتائیں۔ انھوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ "اس علاقہ میں سفید سیمل کا درخت ہوتا ہے؟" لوگوں نے کہا کہ یہاں تو صرف لال پھول والے سیمل کے درخت ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ کیہار کے علاقہ میں کچھ سفید سیمل کے درخت ہوتے ہیں۔" نوادرات سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ جب یہاں آئے تو ان کو یہاں بھی ان کی تلاش رہی۔ اسکول میں کئی جگہ کمروں میں بھی اور جلسہ گاہ میں بھی اور پھولوں کے علاوہ طرح طرح کے کروٹن بھی گلدستوں میں رکھے گئے تھے۔ علاقہ بیر نگر میں ایک قسم کا کروٹن گھونگھریالے پتوں کا بہت خوبصورت ہوتا ہے اس کی ٹہنیاں بھی بچّوں نے مختلف کمروں میں سجا رکھی تھیں اور جلسہ گاہ میں بھی اسٹیج پر رکھا گیا تھا۔ پھولوں اور کروٹنوں پر تو وہ سرسری نظر ڈالتے تھے مگر گھونگھریالے پتّوں والے کروٹن کے پتّوں کو وہ بہت غور و توجہ اور دلچسپی سے دیکھتے اور ان کی پتّیوں میں انگلیاں ڈال کر

نہ جانے کیا پتا لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں ہر جگہ ساتھ رہا اس لئے وہ مجھ کو بار بار
کہ "یہ کروٹن آپ نے کہاں سے منگوائے، بڑے انوکھے ہیں۔ ایسے کروٹن میں نے کہیں نہیں دیکھے
میں نے عرض کیا یہ اسی علاقہ میں کثرت سے ملتے ہیں، بہت خوش ہوئے۔

بچوں کے میلے کے متعلق انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا: "محبوب الرحمن صاحب (راقم
یہاں بچوں کا میلہ لگوایا ہے۔ بچوں کے میلے جامعہ میں لگا کرتے ہیں۔ یہ انھوں نے جامعہ سے سیکھا
بچوں کے میلے سے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ یہ میلے تعلیمی ہوتے ہیں۔ ان سے بچوں میں خود اعتم
پیدا ہوتی ہے۔ کام کا منصوبہ بنانا، اس کا جائزہ لینا، حساب کتاب رکھنا آتا ہے۔ اسا
اور بچے مل جل کر کام کرتے ہیں جس سے طلبا اور اساتذہ کا ربط بڑھتا ہے اور اساتذہ کو بچ
کی صلاحیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔"

جب وہ بیرنگر سے لوٹ کر پورنیہ پہنچے اور میں ان سے سرکٹ ہاؤس میں ملنے گیا تو اخر
اور باتوں کے علاوہ پھر ان کروٹنوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ "آپ نے جو گلدستوں میں کروٹن دکھوائے تھے
وہ بہت پسند آئے۔" میں نے عرض کیا وہ تو اس علاقے میں ہر جگہ بکثرت ہیں۔ انھیں تعجب ہوا
عرض کیا انشاء اللہ میں اس کے پودے پٹنہ لیتا آؤں گا اور احاطے میں لگواؤں گا۔ فوراً بول اٹھے
"ارے بھئی میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا، آپ ایسا نہ کریں۔ اس کے لے جانے میں آپ کو بہت دقت
میں نے عرض کیا مجھے بالکل دقت نہیں ہوگی، منع فرماتے رہے۔ مگر جب ایکبار گیا تو آٹھ دس مختلف
قسم کے کروٹن کے پودے لیتا گیا جن میں گھونگھریالے کروٹن کے پودے زیادہ تھے۔ بہت خوش ہوئے
اور بڑے مالی کو بلوا کر ان کو گورنر ہاؤس کے احاطے میں لگوانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ لگ گئے تو مجھ
فرمایا "آپ کے کروٹن لگ گئے۔ آپ کا بیحد شکریہ۔"

ذاکر صاحب کا مشاہدہ اور ان کی یادداشت عجیب وغریب تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی
نہیں بھولتے تھے۔ بیرنگر کے سلسلے کے چند واقعات اور سن لیجیے:

ہمارے اسکول میں ایک نوجوان استاد تھے، چودھری منصور عالم ان کو ڈاکٹر ذاکر حسین
صاحب سے غائبانہ عقیدت ومحبت تھی، وہ چاہتے تھے کوئی موقع ملے تو میں ان کو ذاکر صاحب سے
ملا دوں۔ مختصر وقت، مختلف پروگرام اور بے پناہ ہجوم کی وجہ سے موقع نہ مل سکا جب میں نے ذاکر

صاحب کو پورنیہ کے لئے رخصت کرنے کے لئے کار کا دروازہ کھولا تو چودھری صاحب میرے بالکل قریب آگئے، جلدی میں بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور غالباً دعا کی درخواست کی۔ کار روانہ ہو گئی۔ تعارف کرانے کا موقع نہ ملا۔

پھر جب میں پٹنہ پہنچا تو انھوں نے اور باتوں کے علاوہ چودھری نور عالم کے متعلق بھی پوچھا کہ "وہ نوجوان مجھ سے کیوں ملا تھا؟" میں نے عرض کیا وہ حضور سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور آپ سے اپنے متعلق مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے کچھ عرصہ کے بعد ذاکر صاحب کو خط لکھا اور ان سے ملنے کی درخواست کی، بلائے گئے اور مشورہ دیا۔

لحیم شحیم، بلے ترنگے، سرسید جیسی داڑھی والے بیرنگر کے ایک معمر آدمی تھے حاجی جمال الدین صاحب مرحوم۔ اسکول کے پڑوس میں ان کا مکان تھا اور ہے۔ مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ مقطع داڑھی، ہر بات میں "ہو ہولا، مولا ہو" ان کا سخن تکیہ تھا۔ لوگوں نے ان کا نام "مولا جمال" رکھ دیا تھا۔ اپنی مقامی بھوجپوری آمیز زبان میں سب سے بات کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے متعلق اونچا خیال رکھتے تھے۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں ان کو ذاکر صاحب سے ملا دوں۔ مگر مجبوری تھی۔ سمجھانے بجھانے پر بھی اڑے رہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ذاکر صاحب ہائی اسکول کے پروگرام کے بعد مڈل اسکول کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ ہزاروں کا مجمع بے پناہ بھیڑ میں ذاکر صاحب کو لئے ہوئے میں ان کے آگے آگے اور ان کے ساتھی سب پیچھے پیچھے مڈل اسکول کے احاطے سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے ہائی اسکول کی طرف آرہے تھے کہ مولا جمال نے پوری عربی قراءت کے ساتھ السلام علیکم کہا اور راستہ روک کر ذاکر صاحب کے سر پر شفقت و محبت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے رہے۔ ذاکر صاحب بالکل سر جھکائے کھڑے رہے اور جب وہ دعائیں دے چکے تو آگے بڑھے۔ ذاکر صاحب نے انھیں یاد رکھا اور جب وہ صدر جمہوریہ ہو گئے تو بھی ایک خط میں ان کا ذکر فرمایا، ان کو سلام لکھوایا اور ان کی خیر خیریت پوچھی۔

دیدار بخش ہائی اسکول سے متصل ایک مدرسہ تھا "امداد الغربا"۔ یہ مدرسہ اب وہاں سے منتقل ہو کر گاؤں میں چلا گیا ہے۔ میں نے اس کا بھی معائنہ پروگرام میں رکھوا دیا تھا۔ مدرسہ کے احاطہ میں پھوس کے چند مکانات تھے۔ ایک مکان بہت جلدی میں ذاکر صاحب کی آمد کی خبر سن کر بنوایا گیا تھا۔ مدرسہ والے مشغول تھے۔ مکان میں کھڑکیاں وغیرہ نہیں تھیں صرف اگلی چھت میں ایک بہت ہی چھوٹی سی کھڑکی مزدوروں

نے لگادی تھی۔ ذاکر صاحب مدرسہ کے آفس وغیرہ کا معائنہ کرنے کے بعد اس مکان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور مجھ سے پوچھ بیٹھے "کیا یہ پوسٹ آفس ہے؟" ذاکر صاحب سمجھتے تھے کہ یہ مدرسہ کا مکان ہے مگر اس میں کھڑکیاں نہ ہونے کی وجہ سے اس کو پوسٹ آفس کہکر یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ مدرسہ تعلیم کی جگہ ہے۔ تعلیمی و تدریسی کمروں میں روشنی اور ہوا کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور مدرسہ والے بھی بہت جھینپے اور ان کے انوکھے اندازِ تربیت سے لطف لیتے رہے۔

ذاکر صاحب کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی مشہور تھی۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ سن لیجیے جو بیرنگر میں پیش آیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ان کے ساتھ شریک دسترخوان ہونے والوں کے لئے مختلف قسم کے ناشتے پھل، مٹھائیاں وغیرہ رکھی گئی تھیں اور چیزوں کے علاوہ بیرنگر کا کھاجا بھی پیش کیا گیا تھا۔ بیرنگر کا کھاجا مشہور ہے۔ یہاں کے حلوائی سے بڑے اہتمام سے بنوایا گیا تھا۔ بہت ہی مختصر سائز کا تہہ دار اور دبیک کھاجا اپنی شکل و شباہت کے لحاظ سے کیلا جیسا لگتا تھا۔ ذاکر صاحب نے میٹھی چیزوں کو تو ہاتھ نہیں لگایا، غالباً ان کو میٹھے سے پرہیز تھا۔ لہٰذا بیچارہ کھاجا بھی ایک کونے میں پڑا رہا۔ چونکہ یہ کھاجا ذاکر صاحب ہی کے اعزاز میں یہاں کی پبلک نے بنوایا تھا اور وہ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھ رہے تھے، ایک صاحب کی نظر پڑ گئی جو مقامی لیڈر تھے اور ذاکر صاحب سے قریب بیٹھے تھے، درخواست کی کہ حضور یہ بیرنگر کا کھاجا ہے۔ یہاں کا کھاجا مشہور ہے۔ حضور والا ہی کے لئے بنوایا گیا ہے۔ ذاکر صاحب نے تعجب کے انداز میں برجستہ فرمایا "او ہو یہ کھاجا ہے! میں نے تو کیلا سمجھا تھا" پھر دلدہی کے لئے ذرا سا توڑ کر چکھ لیا۔

ذاکر صاحب دیدار بخش ہائی اسکول تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس اسکول کے بانی حاجی دیدار بخش صاحب مرحوم تھے، انھوں نے اس اسکول کے قیام و بقا کے لئے بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا۔ ذاکر صاحب علاقہ بیرنگر کی تعلیمی پسماندگی اور حاجی دیدار بخش صاحب کے جذبہ خدمت و ایثار سے بہت متاثر ہوئے۔ چونکہ حاجی صاحب ورودِ مسعود سے قبل ہی وفات پا چکے تھے لہٰذا انھوں نے ڈائننگ ہال ہی میں ان کے دونوں لڑکوں تیسیر الدین صاحب اور محی الدین صاحب (مرحوم) کو بلایا اور نصیحت کی اور فرمایا "آپ لوگ دل جمعی کے ساتھ اسکول کو چلاتے رہیں، جو کام حاجی صاحب مرحوم کر گئے ہیں وہ اب آپ کے کرنے کا ہے" تیسیر الدین صاحب نے ان سے درخواست کی کہ "حضور ہم لوگوں سے جو کچھ بن پڑتا ہے کر رہے ہیں مگر اسکول کو منظوری نہیں ملی ہے۔ جس سے نقصان ہو رہا ہے" اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا: "میں یہاں

ابھی نہیں آیا کہ اسکول کو منظوری مل جائے۔ میں تو جہاں جاتا ہوں بے غرض جاتا ہوں۔ اس کام کے لئے آپ کے نمائندے موجود ہیں۔" یہ سودھانسو جی کی طرف اشارہ تھا جو پاس ہی بیٹھے تھے۔ سودھانسو جی متوجہ ہوئے اور وعدہ فرمایا کہ میں اس سلسلے میں کوشش کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے اس معاملے میں دلچسپی لی۔

ڈاکٹر صاحب تعلیمی اداروں اور تعلیمی کام کرنے والوں کو آزاد رہ کر تعلیم کا کام کرنے کے قائل تھے۔ وہ ان کو سرکاری روک ٹوک سے بری دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے کئی بار تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں ان سے عرض کیا کہ اسکول کو منظوری نہیں ملی ہے، اس لئے لڑکے کم آتے ہیں اور جو بھی آتے ہیں چند سال رہ کر چل دیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے فرمایا کہ "آپ تعلیمی کام کرتے رہیے، اچھی تعلیم دیتے دلاتے رہیے، منظوری کی زیادہ فکر نہ کیجیے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا، تو منظوری کی ہرگز کوشش نہ کرتا۔" اس سلسلے میں جب میں پریشانی کے عالم میں لکھتا تو جواباً فرماتے "آپ مجھے لکھتے رہیے، حالات سے باخبر کرتے رہیے۔ میں آپ کے لئے کچھ کر نہیں سکتا مگر دعا تو کر سکتا ہوں۔"

میرے اسکول اور تعلیمی کام کے متعلق برابر اپنے گراں قدر مشوروں اور نصیحتوں سے نوازتے رہے۔ ایکبار فرمایا "اس کا خیال رکھیے کہ اسکول کا کوئی گوشہ اجاڑ اور سنسان نہ رہے۔ اسے پھولوں اور پودوں سے سجایئے۔ اگر قیمتی پھول نہ لگا سکیں تو 'وگین ویلیا' کی بیلیں ہی سلیقہ سے لگوا دیجیے۔" اسی سلسلے میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "میں جب علی گڑھ وائس چانسلر ہو کر گیا تو یونیورسٹی کے احاطے کے کچھ حصے پھولوں اور باغوں سے خالی اور جھاڑ جھنکاڑ سے پُر تھے، مجھے اچھے نہیں لگے اور ان میں چمن بندی کرائی۔"

ایک بار میں نے عرض کیا کہ اسکول تو منظور ہو گیا مگر حضور والا کے بقول اس میں سلیبس اور کوڈ کی لال کتاب کی پابندی ہے، ان پابندیوں میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں ہو سکتا، فرمایا "اسکول کو ہر طرح سے مکمل کیجیے، سائنس، کامرس وغیرہ کے شعبے بڑھایئے، ڈرائنگ کے اچھے استاد رکھیے، ڈرائنگ خوشخطی کا پہلا اسٹیج ہے۔ آج کل اسکول کالج کے طلبا اکثر بدخط ہوتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ڈرائنگ پر توجہ نہیں دی جاتی۔"

یہ بھی فرمایا کہ "آپ کے ضلع میں جو تاریخی اور نادر چیزیں ہوں اپنے اسکول میں ایک میوزیم بنا کر ان کو جمع کیجیے۔ اس سے تعلیمی فائدہ ہوگا۔" اور فرمایا کہ "اسکول کے ریزلٹ کی طرف خاص توجہ دیجیے۔"

ایک بار فرمایا "اچھے اسکول کے لئے اچھے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کے انتخاب میں خوب جانچ پرکھ سے کام لیجئے، جلدی نہ کیجئے کہ جو اساتذہ بحال کئے جائیں وہ آپکے ڈھب کے ہوں۔ اگر اس میں چوک ہوگئی اور ایک بھی غلط استاد بحال ہوگیا تو ایک مچھلی سارے پانی کو گندہ کردے گی"

علاقہ بیرنگر کے عوام نے اپنے سپاسنامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس علاقہ میں سڑک نہیں ہے، سڑک نہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ پسماندہ ہے اور تعلیم کے کام میں بھی دقت پیش آتی ہے۔ جواباً فرمایا: "آپ اچھی تعلیم کا انتظام کریں، سڑک بنوانے کی فکر نہ کریں، جہاں اچھی تعلیم ہوگی سڑک خود بخود پہنچ جائے گی"

ایک بار یہ نصیحت فرمائی "کام سب سے لیجے گا، جھگڑا کسی سے نہ کیجے گا۔ جو جھگڑا کرتا ہے جھگڑے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جھگڑا ایک مستقل کام بن جاتا ہے"

بیرنگر میں جو 'ذاکر آئیڈیل ہوم' کا افتتاح ذاکر صاحب سے کرایا گیا تھا، اس کے بعض مسائل حل میں اُن سے بذریعہ خط بھی پوچھتا رہتا تھا۔ ایکبار کئی مسئلے لکھ بھیجے۔ جواباً تحریر فرمایا "بچوں کو بچہ بچہ سمجھ کر رکھئے، سب کچھ ٹھیک رہے گا"

ایک بار بچوں نے میلہ لگایا اور مصر ہوئے کہ میں ذاکر صاحب کو اس کی خبر کردوں، تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دوں اور ان سے پیام منگاؤں۔ چونکہ بیرنگر کے میلے کا موجد میں تھا، میرے دل میں بھی خودستائی کا چور بیٹھا تھا۔ میں نے پہلے رسمی طور پر بچوں کو روکا، مگر بعد میں تیار ہوگیا اور میلے کی کارگزاری کی ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کرکے اپنی چوری کو چھپانے کے لئے یوں لکھا کہ "بچوں کا شدید تقاضا ہورہا ہے کہ آپ سے اس سلسلے میں چند منٹ ہمت افزائی کے کلمات لکھنے کی درخواست کروں" جواباً ذاکر صاحب نے ارقام فرمایا کہ "بچوں کے میلے کے متعلق پڑھ کر جامعہ یاد آگئی۔ بڑی خوشی ہوئی" مگر ساتھ ہی ساتھ میری چوری پکڑی اور سخت ڈانٹ بتائی۔ لکھا کہ "بچوں میں پیام طلبی کی عادت نہ ڈالئے" اور غالباً یہ بھی لکھا کہ "ان کا کام ہی ان کا انعام ہے" اس دن سے میں نے کان پکڑ لئے۔ یہ تھا ان کے تربیت کا انداز۔ افسوس اب ایسا مربی کہاں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے اور ان کے درجات میں ترقی عطا فرمائے۔ ان کے نقش قدم پر اس نالائق اور بدنام کنندہ کو تعلیمی میدان میں چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیّد شاہ منظر حسین

[جناب سیّد شاہ منظر حسین : (پ ۱۹۲۴ء تقر) علیگڑھ کے بی، ایس سی۔ خلیفہ باغ بھاگل پور کے گرامی قدر خاندان کے نمبر ۲، شرف عالم صاحب نمبر ۱، خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ عنایت آفتاب (عنایت حسین شاہ) نمبر ۳ آئی، اے، ایس ہیں]

جولائی ۱۹۳۸ء میں ہمارے والد مرحوم جناب سیّد شاہ فخر عالم صاحب سجادہ نشیں آستانہ پیر دمڑیا خلیفہ باغ۔ بھاگل پور نے مجھے تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی روانہ کیا۔ میرا داخلہ درجہ پنجم میں کرایا گیا۔ جاڑے کے دن تھے۔ میں کھانا کھا کر ہوسٹل کے سامنے دھوپ میں سرخ بجری پر ٹہل رہا تھا کہ اسی بیچ ملازم نے والد صاحب کا خط لا کر دیا۔ خط نکال کر لفافے کے پرزوں کو جونہی تتلیوں کی طرح ہوا میں آزاد کیا اور یہ ٹکڑے سرخ بجری پر کچھ اس طرح بکھر گئے "جیسے کسی بدتمیز نے کتھے کی کٹھیا میں چونے کی چھینٹ چھڑک دی ہو۔ اسی لمحہ ایک محبت بھری آواز کانوں سے ٹکرائی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے ارشاد فرمایا — "ان کاغذ کے ٹکڑوں کے لئے سامنے ہرا ٹین رکھا ہے، انھیں چن کر اس میں ڈال دیں۔ کیا آپ کو اس سرخ بجری پر یہ سفید پرزے گراں نہیں گزر رہے ہیں؟"

میں اپنے سامنے ذاکر صاحب کی سیاہ داڑھی اور پُر رونق چہرہ کو دیکھ کر بے چون و چرا خاموشی سے کاغذ کے ان ٹکڑوں کو اٹھا کر کے ہرے ٹین میں ڈال آیا۔ یہ آج سے ۴۴ سال پہلے کی بات ہے، اور وہ نقشہ میری نظروں کے سامنے ہمیشہ قائم رہا ہے۔

• شیخ الجامعہ کی چھوٹی سی کالی گاڑی تھی اپنے ڈرائیور کے ساتھ سڑک پر نیم کے درخت کے نیچے قیلولہ کر رہی تھی۔ ڈرائیور (۱۹۴۲ء) میں میاں ظہیر اور انوار نے کار کے قریب جا کر ڈرائیور کو اس طرح مخاطب کیا: "لے! آپ تو

سو رہے ہیں۔ ذرا مہربانی کرکے ہم لوگوں کو نہر تک چھوڑ دیجیے۔ ڈرائیور نے جواب دیا کیا خوب!! پاس ہی تو نہر ہے، دو فرلانگ پیدل نہیں جا سکتے۔ یہ کہکر وہ دوبارہ خراٹے لینے لگا۔ ظہیر کی نظر اچانک نیم کے درخت پر شہد کی بڑی مکھی کے ایک چھتہ پر پڑی جو تقریباً تین فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم لوگوں کے ذہن میں ایک ساتھ ایک ہی شرارت سوجھی۔ ہم لوگوں نے انوار کو اپنے سینئر ہاؤس والے کمرے میں اُوپر بھیج دیا جہاں سے وہ بہ آسانی ہماری شرارتوں کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ جب اس نے کمرہ میں پہنچکر شیشے کے دروازہ سے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ہم لوگوں نے شہد کے چھتے میں ڈھیلا مارنا شروع کیا۔ میرا ایک ڈھیلا ٹھیک اس جگہ پڑا جہاں شاید ملکہ تھی۔ اچانک لاکھوں مکھیوں نے اُتر کر کار کو گھیر لیا۔ ہم لوگ بھی بھاگے۔ دو ایک نے سر میں کاٹا بھی۔ لیکن کسی طرح تیز سانسوں سے اپنے کمرہ میں پہنچ گئے۔ انوار بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ سڑک پر نظر ڈالی تو کار غائب تھی۔ انوار نے کہا جونہی مکھیاں کار پر حملہ آور ہوئیں ڈرائیور نے اپنے چہرے پر پہلے ایک دو بار، پھر لگاتار ہاتھ مارنے شروع کیے اور کسی طرح اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا دہلی کی طرف چل دیا۔ مکھیوں نے پیچھا کیا اور وہ راستہ میں بازار میں پھیل گئیں اور اس طرح تھوڑی ہی دیر میں ہر حرکت کرنے والی چیز یا تو ساکت ہو گئی یا روپوش ہو گئی۔ دو گھنٹہ تک جامعہ میں کرفیو لگا رہا۔ غروب آفتاب کے بعد ایک آدمی کار کی تلاش میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد کار آئی لیکن ڈرائیور کی آنکھ، کان اور ناک کا کنٹور لال غبارہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جلدی سے لے اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم لوگ بھی پوری جامعہ کی بھیڑ کے ساتھ اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر اور کمپونڈر مکھیوں کے ڈنک نکال رہا تھا۔ اسی درمیان ذاکر صاحب بھی آگئے اور جب انھیں پوری کہانی معلوم ہوئی، تو وہ ڈرئیور سے بولے "وہ بچے تم میں زندگی دیکھنا چاہتے تھے۔ تم دن میں بھی سو رہے تھے۔ یاد رکھو حرکت میں ہی زندگی ہے، کہ سکون تو موت سے بدتر ہے۔"

ڈرائیور نے جھنجھلا کر بہت ہی ترش روئی سے جواب دیا۔ "واہ صاحب ایک تو آپ کے بچوں نے میرا حلیہ بگاڑ دیا اور اُلٹا آپ مجھ ہی کو ذمّہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔" ذاکر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ برہم ہو کر بولے "یہ تمہاری غفلت کا ہی نتیجہ ہے جس کی سزا تمھیں ملی ہے۔"

● ۱۳ر جولائی ۱۹۴۵ء کو میں ہائی اسکول پاس کر کے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے علی گڑھ پہنچا اور ۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی میں شرکت کرنے کے لیے دہلی گیا۔ ہمارے پرانے ساتھیوں میں سید منیر الدین قادری احمد آبادی جو بمبئی کے ا۔ڈ گیمیکٹ سید افتخار مظفر قادری کے بڑے بھائی ہیں اور ان دنوں یونی لینڈ۔

جناح اپنی بیگم کے میڈیکل ڈاکٹر ہیں؛ فوٹوگرافی سے لیس پُرتپاک طریقہ پر مجھ سے ملے۔ ہم لوگوں کے ذمہ ذاکر صاحب نے جوبلی اسٹال کی سجاوٹ کا کام سپرد کیا۔ ایک دن میر الدین قادری نے مجھے مہمانوں کے کارڈ لاکر دیے کہ انھیں صوفوں پر پِن اَپ کردو۔— میں نے بیچ والے صوفہ پر داہنے مولانا ابوالکلام آزاد اور بائیں طرف مسٹر محمد علی جناح کے کارڈ ایک ہی صوفہ پر پن اَپ کردیے اور اس کے بعد جناح کے پہلو والے صوفہ پر مسٹر لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر وغیرہ کے کارڈ لگائے۔ مولانا آزاد کے پہلو میں مسٹر آصف علی اور دیگر کانگریسی مسلمانوں کے کارڈ لگائے۔ ایک گھنٹہ بعد جونہی ذاکر صاحب اسٹیج پر آئے اور ان کی نظر ایک ہی صوفہ پر مولانا آزاد اور مسٹر جناح کے ناموں پر پڑی تو پوچھنے لگے:

"یہ کن صاحب نے کارڈ لگائے ہیں"

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ "جی! یہ کارڈ میں نے لگائے ہیں"۔

"انھیں الگ کیجیے۔ کیا آپ جامعہ ملیہ کو بھولو اور حمیدہ کا اکھاڑا بنانا چاہتے ہیں۔ جلدی کیجیے —— جلدی" یہ کبھی ایک جگہ نہیں رہ سکتے، انھیں الگ الگ کر دیجیے"۔

میں نے گھبرا کر پن نکالنے شروع کیے۔

"سنو میاں منظر۔ یہاں صوفوں کی تین قطاریں ہیں۔ ایک طرف لیگ کے ممبروں کی چٹ لگاؤ، تو دوسری طرف کانگریس والوں کی، اور ان دونوں کے درمیان بیچ والی صف میں والیانِ ریاست و دیگر معزز مہمانوں کے کارڈ چسپاں کرو۔ اور دیکھو اگلی میز پر بیچ والی صدر کی کرسی چھوڑ کر ایک طرف میرا اور دوسری طرف خواجہ عبدالمجید صاحب کا کارڈ لگا دینا"۔

• ایک دن میں نے ذاکر صاحب کو کھانے پر مدعو کیا اور انھوں نے بکمال شفقت دعوت منظور کرلی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کمرہ کی سجاوٹ سے کافی مسرور ہوئے اور بولے "عموماً لوگوں کے کمرے سفیدی (چونا) سے پُتے ہوئے ہوتے ہیں۔ ارے بھائی سفید قلعی تو اسپتالوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم تو بسکٹ رنگ کا ہو، کھانے کا کمرہ گلابی، اور سونے کا کمرہ ہرا ہونا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمھارا یہ کمرہ بسکٹ رنگ کا ہے اور نیچے کا حصہ ہرا، جہاں شاید تم لوگ بیٹھتے اور پڑھتے ہو۔ اور میں نے عموماً یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ اپنے کمرہ میں خود اپنی ہی تصویر لگاتے ہیں۔ لیکن تمھارے کمرہ میں سینیریاں ہیں اور تمھارے ہاتھ کی بنائی فریم ہیں جب

سے تمہارے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ایک چیز کی کمی ضرور میں نے محسوس کی ہے کہ تم نے اتنا لذیذ کھانا کھلایا لیکن کلوروفل (chlorophyll) قسم کی کوئی چیز کھانے میں نہیں تھی۔“

میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور بولا ”ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کو مغل ڈش کھلائی ہے۔ اس لیے سلاد نہیں رکھا، سلاد تو انگریزی کھانوں کی ڈش ہے۔ ہمارے ملک میں پانوں کا رواج اسی لئے ہے کہ ہم کلوروفل کی کمی پوری کر کے مرغن غذا کو ہضم کر سکیں۔“ یہ کہکر پان کی ٹرے ان کی طرف بڑھا دی ذاکر صاحب نے کہا ”میں نے زندگی میں کبھی پان نہیں کھایا لیکن تمہارے کہنے سے آج کھاتا ہوں۔“ یہ کہکر انھوں نے چھ سات پان یکے بعد دیگرے کھا لیے۔ پھر بولے: ”اپنے باورچی کو بلاؤ یہ کہاں کا رہنے والا ہے۔“ میں نے کہا: ”ہمارے بدایوں والے خالو کا پروردہ ہے اور خالہ نے یہاں بھیج دیا ہے ہم لوگ ڈائننگ ہال سے آج کل کھانا نہیں منگواتے، بلکہ یہی باورچی ہم چھ بھائیوں کا کھانا بناتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے حمید بیرا کو آواز دی کہ باورچی کو بھیج دے۔ باورچی ادب سے آکر کھڑا ہو گیا۔ ذاکر صاحب نے اس سے کہا کہ بھائی اگر میں کبھی تم کو اپنے یہاں کھانا بنانے کے لیے بلاؤں تو کیا تم آؤ گے۔ اس نے جواب دیا خوشی خوشی آؤں گا۔“ پھر ذاکر صاحب نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اُسے انعام میں دیا جو اُس نے سر جھکا کر قبول کیا اور سلام کر کے چلا گیا۔ ساڑھے نو بجے رات میں ذاکر صاحب خوش خوش واپس ہوئے۔

● میرے امتحان کا نتیجہ نکلا اور میں فیل تھا۔ جب میں علی گڑھ پہنچا تو اپنے نجی اثر و رسوخ سے اپنے نمبروں پتہ چلایا۔ معلوم ہوا کہ کیمسٹری کے ایک پرچہ میں زیرو (zero) ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مقصود بھائی سے ملا اور انھوں نے جب کاپی نکلوائی تو پتا چلا کہ جوابات کے آگے تو نمبر درج ہیں جن کی مجموعی تعداد سترہ ہے لیکن اسے کاٹ کر 0 صرف سرورق پر ڈاکٹر عزیز کے دستخط سے کر دیا گیا ہے۔ ان کے مشورہ پر پہلے میں رجسٹرار مسٹر اے۔ ای۔ زبیری سے ملا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نتیجہ میں کافی تاخیر ہو گئی ہے اس لیے اب صرف ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنے اختیار سے آپ کی کاپی کے جانچنے کا دوبارہ حکم دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اور عنایت آفتاب ان سے ملنے وی سی ہاؤس گئے اور ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اصل موضوع پر آگئے:

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ ہم لوگ جب گھر کی تعطیل کے بعد یہاں آئے تو معلوم ہوا کہ میں فیل ہو گیا ہوں اور کیمسٹری کے ایک پرچہ میں صفر ہے، باقی تمام نمبر بہت اچھے ہیں، چونکہ نتیجہ نکلے ایک ماہ سے اوپر ہو گیا ہے اس لیے زبیری صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ اس تاخیر پر وائس چانسلر ہی دوبارہ کاپی جانچ کرانے کا آرڈر دے سکتے ہیں۔“

جواب دیا کہ یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ زبیری صاحب نے کیوں تم لوگوں کو میرے پاس بھیجا۔ یہ کام تو امتحانات کے رجسٹرار کا ہے یا پھر خود ان کا شعبہ اسے درست کر سکتا ہے۔

منظر: چونکہ تاخیر کافی ہو گئی ہے اس لئے انھوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں۔

منظر: آپ یونیورسٹی کے مختار کل ہیں، آپ کو اگر مجاز نہ ہوتا تو زبیری صاحب ہم لوگوں کو آپ کے پاس کیوں بھیجے۔

ذاکر صاحب: کیا تمھیں پتا ہے، میری لڑکی بھی دینیات (Theology) میں فیل ہے۔

منظر: یہ ممکن ہے کہ میں اس پرچہ میں فیل ہوں۔ لیکن صفر آنے کے معنی ہیں کہ میں نے سادی کاپی داخل کی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن یہ بتاؤ آخر صفر ملنے کی وجہ کیا ہے؟

منظر: میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن آپ جب پوچھ رہے ہیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید یہ علی گڑھ کی ہال پولیٹکس کا نتیجہ کہیں نہ ہو۔ کیونکہ یہ کاپی ڈاکٹر عزیز احمد کے پاس تھی۔ وہ ڈائننگ ہال کے صدر ہیں اور ایس ایس ویسٹ کے وارڈن ہیں، ہال میں کچھ لوگ مجھے عنایت آفتاب اور ہمارے دوستوں کی بڑھتی ہوئی پوزیشن کو حسد سے دیکھتے ہیں کیونکہ ہمارا گروپ کسی نہ کسی کمیٹی، کلب، یا ادارہ کا سکریٹری یا صدر ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن ڈاکٹر عزیز صاحب کو تم سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

منظر: میں چند ماہ پہلے جب فوڈ مانیٹر بنایا گیا تھا تو میں نے مطبخ کی کچھ بدعنوانیوں کی روک تھام کی تھی جس پر سینئر فوڈ مانیٹر نے میرے کمرے میں مرغ اور پلاؤ کی اسپیشل ڈش بھیجی تھی جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن ہی مجھے 'مانیٹرشپ' سے ہٹا دیا گیا۔

ذاکر صاحب: مگر اس سے ڈاکٹر عزیز صاحب کا کیا تعلق ہے؟

منظر: ان بدعنوانیوں کی سرپرستی میں ان کی بھی شہ تھی۔

ذاکر صاحب: تم اپنے ایک استاد پر الزام لگا رہے ہو۔

منظر: یہ الزام نہیں ہے، حقیقت ہے۔

ذاکر صاحب: اس کا تمھارے پاس کوئی ثبوت؟

منظر: افسوس تو یہی ہے کہ میں اس لمحہ اس کا ثبوت آپ کو نہیں دے سکتا۔

ذاکر صاحب: (ترش رو ہو کر) میں ایسی جہل باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

منظر : میرا اس وقت یہاں آکر ڈاکٹر عزیز کی بدعنوانیوں کی شکایت کرنے کا خیال تک نہ تھا، ورنہ میں تمام ثبوت
کے ساتھ آپ کے پاس آتا۔ میں تو اپنی کاپی کی دوبارہ جانچ کے لئے آپ کا حکم نامہ طلب کرنے آیا تھا۔ اگر آپ
اس کی اجازت دے دیں تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ (دراصل میں ذاکر صاحب سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں خود اپنی
نظر سے کاپی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ کیونکہ اگر یہ کہتا تو جتنے بھی Dealing clerk تھے ان کی نوکری پر بن آتی)

ذاکر صاحب: میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ اب تم صبر کرو۔ برداشت کرنے کے باوجود میں غصے سے کانپ گیا

ذاکر صاحب: کیا تم خفا ہو گئے؟

منظر: میں آپ سے غلط کام کو کہنے نہیں آیا تھا میں چاہتا تھا کہ آپ اجازت دیدیں لیکن آپ مجھے صبر کی تلقین کر
رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں صبر ہی کروں گا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْن ۝

ذاکر صاحب: کیا تمھیں اس پر یقین ہے۔

منظر: بحمد اللہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان کو اللہ پر بھروسا ہوتا ہے اور ہر پریشانی میں وہ اس کی
رضا کا قائل ہوتا ہے۔ انشاء اللہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

ذاکر صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ہاتھ پیچھے کر لیے اور دو چار قدم چل کر پلٹے، منیر صاحب کو بلانے کے لیے انھوں نے گھنٹی بجائی۔ ڈاکٹر عزیز صاحب نہ صرف سر سید ہال مطبخ اور فوڈ منسٹری کی صدارت سے ہٹائے گئے بلکہ ان پر کچھ ایسی بن آئی کہ وہ خود ہی مسلم یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر دہلی ہمدرد دواخانہ میں ملازمت کے لئے چلے گئے۔ لڑکوں کا کھانا جو کمروں میں جاتا تھا وہ بند کر دیا گیا اور ڈائننگ ہال سسٹم پھر سے شروع ہوا۔

تحائف نوصولہ

• **بے نام** : سرشار صدیقی (پ ۱۹۲۶ء) کا مجموعۂ کلام (غزلیں اور نظمیں) ۱۹۸۳ء-۱۴۴ص

— ۱۹۵۵ء تک وطن کانپور، پھر 'نیا مدینہ' کراچی : نہ زمیں ملی نہ زماں ملی ✣ جو اماں ملی تو کہاں ملی!

— سرورق کا شعر : رنگ ہوں، بُو ہوں، حرف و نوا ہوں، محسوس و معلوم ہوں میں

یاس و یگانہ کا لہجہ ہوں غالب کا مفہوم ہوں میں

— ایک اور شعر : اسی کاوش میں عمر ہو گئی صرف ✣ لکھ سکوں اپنی سوچ حرف بحرف

• **ادعیۃ القرآن** : مؤلفہ ڈپٹی نذیر احمد۔ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی تصحیح اور مفید مقدمہ کے ساتھ۔ ڈپٹی نذیر احمد تعلیمی ٹرسٹ کراچی ۱۹۸۲ء- ۱۴ + ۱۰۰ص۔

• **آتش فشاں پر کھلے گلاب** : آصف فرخی کے افسانوں کا مجموعہ۔ ایک دل آویز، خیال انگیز اور خوش اسلوب پس گفتار کے ساتھ۔ ۱۶، بی، الہلال سوسائٹی۔ کراچی۔ ۱۹۸۲ء - ۲۵۵ص

— مظفر علی سید نے آصف کو خطرناک حد تک تازہ کار، خطرناک حد تک بڑھا ہوا جِن، خطرناک حد تک حقیقت شناس اور بصیرت مند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے "نہ تو اس کو اپنے دور میں مدغم ہونا گوارا ہے اور نہ اس سے دائمی گریز۔ ابوطالب کلیم کے الفاظ میں :

درمیان من و تو الفت جمع است و کنار ✣ روز و شب با من و ہر لحظہ گریزاں از من"

• **قاموس الاقبال** (فہرست کتب اقبالیات) : ۲ جلد۔ عبدالجبار شاکر، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سکنڈری ایجوکیشن لاہور، ۱۹۸۱ء-ص ص ۵۹ + ۱۷، + ۳۹ + ۴۰

• **تھری ڈی اسٹورز** : (3D.STOREES)، اسد القادری، ۲۱ چیمبرس گنپت روڈ لاہور۔ ۱۹۸۳ء-۱۹۲ص-

— تاریخ اسلام پر مبنی دلچسپ افسانے۔

• **تفسیر سورۂ فاتحہ** : (انگریزی و اُردو)، اسد القادری۔ ۱۹۸۲ء: ص ص ۴۸ + ۵۲

• **نقش اعجاز** : اعجاز حسن صادق پوری کی نظمیں اور غزلیں مع اسالہ مرحوم مصنف کے والد سید احمد حسن صاحب کے قلم سے۔ ۱/۶۲ ے، شریف آباد، کراچی (۱۹)، ۱۹۸۱ء - ۱۰۴ص۔

• **مجمع البحرین :** شیعہ اور سُنّی متفق علیہ احادیث ۔ مؤلفہ محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۶۹ء ۔ ص ص ۳۶ + ۲۲۳ ۔

—— لکھنؤ اور اس کے بعد کراچی کے شیعہ سُنّی ادیبوں کے لیے توجہ طلب ۔

• **اقبال اور بزم اقبال** (حیدر آباد دکن) : از عبدالرؤف عروج، کراچی، ۱۹۷۸ء ص ۱۶۴ ۔

—— چند ابواب : (۱) حیدر آباد سے اقبال کا پہلا تعلق (۲) کچھ حسن یار جنگ کے بارے میں (۳) بزم اقبال کا قیام (۴) اقبال حلقۂ امراء میں (۵) مصوروں سے اپیل (۶) اقبال، بیرون حیدر آباد (۷) عطیہ بیگم اور بزم اقبال (۸) حیدر آباد ظلم کے نرغے میں ۔ وغیرہ

تخلیقی ادب : (غیر مطبوعہ ادبی تخلیقات کا مجموعہ) دو جلد، مرتبہ پاشا رحمان مشفق خواجہ، آمنہ مشفق، عصری مطبوعات، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ص ۲۴۰ + ۵۲۸

جلد اوّل کے مقالات : محمد حسن عسکری : انسان یا آدمی (سلیم احمد)، کلچر اور فنون لطیفہ (محمد ہادی حسین)، پاکستان میں اردو افسانہ (وزیر آغا)، مغرب میں رومانی تحریک کے منفی پہلو (ریاض الحسن)، شہرِ جدید کی فصیلوں میں نقب (شمیم احمد)، لیفے گیتوں کا تصور: روایت اور عصر جدید (جمال پانی پتی)، لفظ کا گیان اور نیا افسانہ (احمد جاوید)، سارتر کا فکری سرچشمہ (پاشا رحمان)، **عالمی ادب :** بودلیئر کی ۱۳ نظمیں (ترجمہ محمد ہادی حسین)، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ۶ نظمیں، (ترجمہ رفیق خاور)، **انشائیے**، خود نوشت، **ڈرامے :** ہجرت (وزیر آغا)، فٹ نوٹ (انور سدید)، سنہری شاخ (جمیل آذر)، مٹی کا دریا (میرزا ادیب)، جتنے دُور، اتنے پاس (انور عنایت اللہ)، **شاعری :** محمد ہادی حسین، احسن علی خاں احسن، غالب احمد، صدیق کلیم، توصیف تبسم، مہتاب ظفر، سیدہ شاہین حنیف، انور غالب، انور شعور، راشدہ مغنی، پاشا رحمان اور مشفق خواجہ کی غزلیں اور نظمیں ۔ **افسانے :** غلام عباس، ممتاز مفتی، میرزا ادیب، سید انور، حمید کاشمیری، ہادی حسین، رضیہ فصیح احمد، رشید امجد، سلیم اختر، صلاح الدین عادل، مرزا حامد بیگ، اختر جمال، رحمٰن شاہ عزیز، انوار احمد، قیوم راہی، شہزاد منظر، ظفر خاں نیازی، طاہرہ بلوچ۔ **شخصی خاکے :** کنہیا لال کپور، ڈاکٹر تاثیر، محمد حسن عسکری، سید جعفر طاہر، ابراہیم جلیس ۔

جلد دوم : اردو ادب کے دس سال (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۹ء) : مقالات از محمد علی صدیقی،

راحمد، شہزاد منظر، عتیق احمد، میرزا ادیب، انور سدید، جمیل آذر، غلام حسین اظہر، معین الدین
ل، احمد ہمدانی، نظیر صدیقی، تحسین فراقی، فروغ احمد، **میرزا یگانہ — شخصیت اور فن :**
ات از خاصہ خاصانِ ادب (غیر مطبوعہ تحریر) یگانہ، ممتاز حسین، سلیم احمد، سید قدرت نقوی،
اقبال بیگم (بنت یگانہ)، تابش دہلوی، شیخ انصار حسین، دوار کا داس شعلہ۔ غیر مطبوعہ غزلیات،
ات، اشعار، رباعیات اور یگانہ کے غیر مطبوعہ خطوط بنام دوار کا داس شعلہ۔
صدیقی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) کی کتابیں :-

- **نقش ہائے رنگ رنگ** (رشید احمد صدیقی کی مختلف النوع تحریروں کا مجموعہ)، ۱۹۷۷ء، ص ۳۰۱-
— گزارشِ احوال واقعی، از نظیر صدیقی، معروضات از لطیف الزماں خاں، **تنقیدی مضامین**
رشید اور علیگڑھ، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، اکبر پر ایک نظر، اقبال، کچھ حسرت کے بارے میں،
غزل، ترقی پسند ادب، غالب کی شرح بیانی، اردو طنز و ظرافت کا سرسری جائزہ، مکتوبات نیاز،
ب کی پروردہ اردو شاعری، ادب میں ابال) اور چودہ **انشائیے**۔
- **شہرت کی خاطر** (انشائیے اور طنزیہ خاکے)، ۱۹۷۹ء، ص ۱۸۳-
- **حسرتِ اظہار** (مجموعۂ کلام): ۱۹۷۷ء، ص ۸۸-
- **جان پہچان** (شخصی خاکوں کا مجموعہ)، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۴۱
— **خاکے** : وحشت کلکتوی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ممتاز شیریں، ایڈ-اے
ی، آغا محمد طاہر، ارشد کاکوی، صادق القادری، شکیل ملک، سوز حیدر آبادی، شورش کاشمیری،
صدر کار عظیم، کرشن چندر سے دو ملاقاتیں، ابن انشا — سرسری جن سے ملاقات عمر بھی لگا ہے گا ہے،
احسن فاروقی، جوش ملیح آبادی، اے، کے بروہی۔
- **شیرازۂ خیال** (مجموعۂ مضامین رشید احمد صدیقی): مرتبہ نظیر صدیقی۔ کاروان ادب، ملتان،
۱۹۸۴ء، ص ۲۶۳-
— **خطبات اور صدارتی تقاریر** : خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد، صدارتی تقریر (کل بہار ریاستی اردو
کنونشن مئی ۱۹۵۱ء)، عرضِ حال، علیگڑھ — ماضی و حال، خطبۂ افتتاحیہ (مشاعرہ جشن جمہوریت، دہلی،
جنوری ۱۹۶۰ء)، اردو شعر و ادب، نیا شعر و ادب، اردو رسم الخط، **شخصی خاکے** : ڈاکٹر ضیاء الدین احمد،

محمد فاروق دیوانہ 'صدیق مرحوم' **مقدمے ، دیباچے وغیرہ :** مقدمہ دیوان فانی (اردو شاعری پر ایک نظر)، کلام فانی پر ایک نظر، پیش لفظ (حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے، از ڈاکٹر ذاکر حسین)، مقدمہ (نقوش اقبال، از مولانا ابوالحسن علی ندوی)، جگر میری نظر میں (آتش گل، کا مقدمہ)، مقدمہ (دنیائے تبسم، از شوکت تھانوی)، مقدمہ (شام ہوتی ہے۔ ڈراما از جلال الدین احمد)، پیش لفظ (بہار کے نو چراغ، از پروفیسر سید محمد حسنین عظیم آبادی)، اما بعد (ناشاد کے مجموعۂ کلام کا دیباچہ)، تعارف (ادیب سہارن پوری کا مجموعۂ کلام)، پیش لفظ ('عمل' مرتبہ موجد بدایونی)، تقریظ (رعنائیاں از شکیل بدایونی)، تعارف (ادب کا مطالعہ، از اطہر پرویز)، تعارف (قصاید مومن از ظہیر احمد صدیقی) پیش لفظ (زاویہ نگاہ از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)، تقریظ (گل بانگ۔ حرم)، تعارف (کلیات میر جلد اول، از ظل عباس عباسی)، **تنقیدی مضمون :** ترقی پسند ادب۔

- **جستجو** (مضامین) تحسین فراقی۔ استاد شعبۂ اردو، ایم اے او کالج لاہور، ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۳۱۔

—— **مشتملات :** (۱) اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیشکش کا مسئلہ (۲) اردو تنقید کے دس سال، (۳) بھٹائی اور اس کی شاعری (۴) اقبال اور تنائے خواب (۵) اقبال اور ابوالعلاء المعری — چند مماثل پہلو (۶) اکبر الہ آبادی (۷) محمد حسن عسکری اور جدیدیت (۸) بشنو از بے چون حکایت میکند۔

- **شخصیات و مباحث** از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، پروفیسر گورنمنٹ پریمیر سائنس کالج، کراچی ۱۹۸۳ء ص ۲۲۴۔

—— مشتملات :۔ آغا شاعر دہلوی، سرفراز حسین تسنیم، ابن انشاء، اقبال عظیم، ڈاکٹر اکبر حیدری، دوست علی خلیل، سید احد حسن جمیل بڈولوی، میر جان اللہ شاہ اول، زبان کے مسائل، اردوئے معلیٰ، عود ہندی، صدر الاخبار آگرہ، ڈاکٹر عبدالحق اور معرکہ مذہب، اقبال اور پیغام انسانیت، ستار وارثی، آصف برخیا کا فن شعر گوئی، مشکور حسین یاد، سعید زبیری سہسوانی۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل، ۴۸۳/۵۱ کورنگی، کراچی (پاکستان) کی کتابیں :

- **تحریک آزادی میں اردو کا حصہ**، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۱۴۔
- **اشاریہ کلام فیض**، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۷۷ء ص ۱۳۶۔
- **تحریک پاکستان اور مولانا مودودی**، خیال نو، کراچی، ۱۹۷۱ء ص ۱۰۴۔

••

خدابخش لائبریری کی مطبوعات

• خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی تحقیقی مجلہ) ۱۹۷۷ء سے جاری: اب تک ۲۳ شمارے چھپ چکے ہیں۔ فی شمارہ ۱۵ روپے۔
• ڈسکرپٹو کیٹلاگ (خدابخش کے عربی، فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست انگریزی میں) شعر فارسی،
تاریخ ہند، فقہ اسلامی، قرآنیات، حدیث، تذکرہ = ۱۲ جلدیں۔ فی جلد ۳۵ روپے۔
• خدابخش مخطوطات کی مجمل فہرستیں (فارسی ۳ حصے، عربی ۳ حصے، اردو ۱ حصہ) مجموعی قیمت: ۶۵ روپے۔
• شمس البیان فی مصطلحات الہندستان (شاہ عالم کے عہد میں مرزا جان تپش دہلوی کی لکھی ہوئی محاورات اردو کی لغت: ۶۰ روپے
• تصویر محبت (شمس الدین فقیر کی فارسی مثنوی، جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ بنی) ۱۰ روپے
• بارھویں صدی کے شعرائے فارسی کے معاصر تذکرے: ■ خان آرزو کا مجمع النفائس؛
■ نقش علی کا باغ معانی ■ علی ابراہیم خلیل کا صحف ابراہیم ہر ایک ۱۰ روپے۔
• خدابخش خطبات: فارسی اور ہندوستان (نذیر احمد) • میری تنقید - ایک بازدید
(کلیم الدین احمد) ہر ایک ۱۰ روپے • افکار رومی (عبدالسلام خاں مکتبۂ جامعہ) ۴۰ روپے۔
• خدابخش خطبات (انگریزی میں): عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو (ہاشم امیر علی) • صوفی لٹریچر عہد
سلطنت میں (بروس لارنس) • صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ۔
(سید حسن عسکری) ہر ایک ۱۰ روپے • فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ، جدید تحقیقات کی
روشنی میں (امیر حسن عابدی) • افکار اسلامی: بدلتی دنیا میں (پروفیسر سید وحیدالدین) ۱۰ روپے • اسلام کی
چودہ صدیاں پوری ہونے پر چند خیالات: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں
(بدرالدین طیب جی) ہر ایک ۱۰ روپے • خدابخش: صلاح الدین بخش: سچدانند سنہا اور جادو ناتھ سرکار
کے قلم سے ۱۰ روپے • خدابخش لائبریری: ایک تعارف (اسکاٹ او کونر کے قلم سے) ۱۰ روپے • تاریخہای
پیدائش و وفات: (شمس العلما محمد سعید حسرت عظیم آبادی - م ۱۳۰۴ھ کے قلم سے) ۱۰ روپے • کنز تواریخ
(…غلام… عظیم آبادی کے قلم سے)؛ تیرھویں صدی کی تاریخیں۔ ۱۰ روپے • یو پی کانگریس کے پہلے اجلاس
کا خطبۂ صدارت (موتی لال نہرو) ۱۰ روپے • فرہنگ آصفیہ: ایک جائزہ (قاضی عبدالودود) ۱۰ روپے۔
• رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت: پہلی جلد 'ادیب' (الہ آباد)؛
دوسری جلد 'العصر'؛ تیسری جلد 'صبح امید'؛ چوتھی جلد 'معیار' ہر ایک ۴۵ روپے
• تدوین متن کے مسائل (خدابخش سیمنار) ۱۵ روپے۔

بیان ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸

۱- مقام اشاعت	:	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
۲- وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی۔
۳-۴- پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محبوب حسین۔
قومیت	:	ہندوستانی۔
پتا	:	رمنہ روڈ، پٹنہ ۴۔
۵- ایڈیٹر کا نام	:	عابد رضا بیدار۔
قومیت	:	ہندوستانی۔
پتا	:	ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴۔
۶- ملکیت	:	خدابخش لائبریری، پٹنہ۔

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محبوب حسین

۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء

many mundane matters, considered from Sufic view point. Sometimes the clarity of expression found in the Makhdum's own letters (e.g. Maktubāt-i-Ṣadi) is lacking in the reports on various questions and answers related in Malfuzāt such as Khwan-i-Pur Ni'mat.

---

union or the uuion of the body with body being a genuine union In the view of 'Ainul Quḍat and others Ma'iyyat, of God meant Ihātat or encompassment. The encompassing of a thing by other depends on subtleties and refinement; what is most absolutely refined (Latif): encompasses it completely. In such encirclement there is no union of body with body and substance with substance.

Replying to a question of Zain Badr about the meaning and scope of what was called the essense and attributes of the Divine Being, Dhāt-o-ṣifāt, the Shaikh said : To know the essense of the One True Being it should be realised that he is not a substance or matter (Jauhar). nor does He come in these terms of body. He has no width or breadth; is inconceivable by all thoughts and imaginations; and is other than what you see around and all before yourself comprising the universe of which he is the maker or creater. His essense is external, powerful, perfect, and so are the attributes of the One Real Being. In chapter 15th the dialogue between him and his Shaikh brought out some very interesting matter regarding the latter. We learn that the Makhdūm was virtually always ritually pure i.e. with ablutions intact and, after the performance of two genuflections of prayer, used to renew the ablution. When asked as to whether he observed the fast of the days of Bīz (i.e 13, 14 & 15 of every month), he replied in the negative

On 17th Shawwal 780 the ceremony of shaving the head of the infants within 7, 14 or 21 days of birth, giving gold and silver weighed against the hair and slaughtering of one or two goats or sheep in case of a female or male child, which was called 'Aqiqah, came up for discussion. Zain asked if the barber also had to be given something from other source. The talk switched on to the ever-increasing gathering of men and women and the elaborate arrangements made for treating the guests and the celebration with guests not only on this but also on the occasions of 'Taṭhir' (circumcision) and betrothal and wedding (Tazwij). There were many other such customs or activities which were miscalled Sunnat implying that they were in accord with traditions.

Thus Zain Badr 'Arabi set down on paper the teaching discourses of his spiritual master on a variety of subjects which were not confined to Law (Shari'at) and the Path (Ṣufi way or Ṭariqat) but what embraced

Questioned as to whether a student, who has got no source of his own, should ask for paper, pen and some thing for his sustenance, the Sheikh said that he should not make a request, for it was possible that he could earn something by doing some part-jobs and devoting the rest of his time to his studies. In case the seeker of knowledge could not help being busy throughout day and night with his books, it was the duty of others to meet his necessary wants. Begging becomes Mubah (allowable) but at the last extremity, after all avenuse of earning had been blocked and exhausted.

In chapter III of M.M, we get that Zain Badr during the course of lesson imparted in the Khānqah on the text of 'Aqāid-un-Nasafi, recited a verse from the Quran, "Every one would get his necessary sustenance from God, whether lawful or unlawful". The Sheikh said that this had become a subject of controversy between the Sunnies and the Mutazilites. And he himself explained, at some length. the view of the orthodox Muslims about it. Zain put in another Quranic verse in the discussion, "There is none of the crawling being on earth for whose sustenance God is not responsible" He asked whether this did not indicate an element of obligation to which the Shaikh replied that there was no obligation but a promise of benefaction towards the weak and the infirm. Questions were followed by supplementaries. The saint was asked on topics of scholastic, theological and mystical, social and on tradition and law (Fiqh), and Zain used to be a participant.

On the question of (Ma'iyyat), derived from the Quranic verse, "Wa Huwa Ma'akum Aynma Kuntum" (He is with you wherever you be), which was interpretated by Ibn 'Arabi, the exponent of unityism or identity of God, women and man, and was questioned later by the 17th century Mujaddid, Sarhindi, Zain Badr said that it had been found recorded in some books of Masters of Mystical knowledge, particularly 'Ainul Qudat and others like him, indicating that they affirm their belief in the oneness of God with all the existing beings of the universe in essence and in knowledge and they disciplined the minds of beginners and the average men in that directions. The Shaikh said that one should hesiiate in either affirming or denying such notions. He referred to the case of Mansur-al-Hallaj and the attitude of men of ecstatic contemplation. It was said further that there was no question of corporal

ing blamable qualities, but that could not be said to be the case with the virtuous attributes. The saint said that viewing without approval or contemplation of praiseworthy virtues constituted a veil. concealing the reality (of Ujb or conceit). He quoted a few Arabic expressions implying that self conciousness of learning piety or worship, aeted as a veil for the 'Alim, Zāhid and 'Ārif.

Raising the question of bestowal and returning of gift (Hibah) between husband and wife, Zain asked the saint whether it was permissible to take back what had been given. He said that (Rujū') (getting back) is not sound and proper in seven cases· A prohibitory verse in Arabic was quoted, and the words and letters analysed so as to throw light on the significance of Dama'-i-Khazaqa (tears in the eye socket) occuring in the verse. Some of the prohibitive occasions arose when there was an increase in the transfer of the property, the donee died, and the question of compensation arose etc (K.P.N. 32).

Participating in a discussion in Majlis 44 on the lawfulness or otherwise of asking, begging, and the advisability of uttering falsehood or truth and the types of food and drink. Zain Badr referred to the saying of 'Ainul Qudat that on occassions things lawful became unlawful and vice versa. The saint was requested to specify such occasions. Among other things he said that lying was doubtlessly prohibited; but occasions might arise for speaking falsehood lo save some one or oneself from the oppression of a tyrant. There was a further dialogue between Zain Badr and his Shaikh concerning 'Suwāl' (beggary) which was prohibited in principle, but certain conditions and circumstances rendered it lawful Emphasis was laid on earning or vocation, "Kasb", which was healthy practice, giving up the old ascetic ideal of renunciation; on ostentatious display of charitable deeds which was a bad and a deplorable practice; on much too exaggeration of wants as one's needs, and insistence on their fulfilment; all these were forbidden. As such an attitude implied a sense of dissatisfaction with God, it lowered the dignity of man and led to laziness. As the plethora of able-bodied aggressive type of beggar in Muslim society has no parallel in other communities of Bihar, one should pay special attention to what Zain quotes from the Makhdum on 'Kasb'.

consider only a few, taken at randum, from different places, and not on any selective basis. On Saturday R.I., 760, Hāji 'Arifi asked the Shaikh as to whether the compilers of the Malfuzāt wrote the actual words of their spiritual guides or made some changes; and he was told that in case he did not remember the words as exactly uttered, but was conscious of their meaning and spirit, he might put the sense in an apt form. The talks led to the ways of the traditionists, and Zain Badr said that in Mashariq ul-Anwār some of the traditions, covering 2, 3 or even 4 pages were found. Now, could so many words uttered continuously be all retained in memory ? The saint said that much at that time was spoken orally rather than written and men were possessed of purer ears and mind. "Waḥy" (divine revelation) should not be confused with Ilhām and Riwait which were of feeble authority, (GLY). Once in Shawwāl 759, seeing that his holiness the Khwajah (M. Sharafu'ddin) was in a happy mood, Zain, (the poor helpless dog of the threshold) having placed his head on the ground made bold to submit that he was involved in debts. He invoked the blessings of the Shaikh for his firm resolve not to leave the world till he had paid off his debts personally or through his friends. The saint said "Be it so : if God the most high so wills". Then he asked him to sit down and advised him to repeat a thousand times the expression, "there is no power nor strength except in God, the most high and exalted". This should be done in days and nights, prefe-rably at night, so long as the debts were not wiped out (TG).

On fourth Ramadān 760 Zain Badr asked the saint about the authority of the four doctors for the justification of some of the practices to which people had become accustomed such as bowing the head, and doing obeisance on hearing the names of Sultans, Maliks and nobles, and offering thanks-givings to God on sneezing and after taking water. The saint replied that there was no such authority for such things; but if the people of any religion had become accustomed to do something that had no sanction from the Qurān and Hadith, but there was a possibility of meeting with harm by abandoning them, the same might be allowed. But one shouid not become habituated to that; one should not become an idol-worshipper by being addicated to anything (GLY).

Talking about purity in the 11th Majlis, the saint observed that a disciple should purify himself as much of bad habits as of laudable qualities. Zain Badr said that pur fication could be attained by abandon-

His holiness the Makhdum, directed as he was by the light which was ever illuminating, brought this on his blessed tongue 'Oh Badr I have accepted you, your house, and your illustrious family (Khail Khānah) which has been closely attached to me. Be at rest. If my honour and esteem remain, I am not one who would abandon anyone". I, the helpless one, submitted. "Even the slaves of the Makhdum have enough honour and esteem'. He added "There are hopes for that".

The Urdu biogarphies have added, in the Wafātnāmah that the Makhdum said that Zain Badr 'Arabi used to help him in putting on his clothes and this responsibility would devolve on his discendants. They don't say who was to be dressed? Another apocryphal matter is the display of the Chishti saint, Ashraf Jahāngir Simnāni on the scene, just after the death of the Makhdum. It had been predicted that such and such person with such and such qualifications would come and take the lead in offering the funeral prayer. It is also interesting to know in this connection the introduction of a couplet of the Persian poet, 'Urfi, of the 16th–17 century, in the printed copy of Ma'din ul-Ma'ani. In chapter 25 p. 222 we get this 'Ashiq ham as Islām Kharāb ast-o-ham az Kufr; Parwānah chirāgh-i-haram-o-dair na-dārad (The lover is made miserable by both Islam and infidelity—The moth does not distinguish between the sanctuary of Mecca and the temple of the magi). The two mss. in Khudabux Library, two of Bihar Sharif, and three of Phulwari Khānqah Library, consulted by the writer; are all free from these spurious insertions.

Before we end, it is worthwhile to say something about the numerous searching questions which Zain Badr himself posed to his revered Pir. In some Majlises (e g. 7th and 8th, 26th in Khwān-i-Pur-Ni'mat) he monopolised the attention of the Shaikh. The catechetical or the conversational part of the oral teachings, involving questions and answers between Zain, the desciple. and the saint his spiritual guide, include a variety of subjects such as 'Dhāt-o-Ṣifāt' (essence and attributes of God), 'Hibs' between husband and wife), which was deed of gifts, 'Ma'iyat', (coexistence or communion) 'Kasb' (acquisition by labour), Khuzu' (concentration, veneration, humility or submission) Zuhd (abstinence) La'nat-e Yazid (imprecations on) if justified or otherwise etc., Mashiyat (will of God), Irādat (purpose or will) Sahw (Sobriety—recovering from impiety), Sukr (drunkenness), Ru'yat (vision of God) etc. We can

As for himself we get very little from him. As stated above it is in the Wasaya, the last of the Malfuzāt, recording the affairs of the 16 hours before the death of the Makhdum, which he compiled at the instance of his friends, that he had to refer, among others, to himself also. The printed text (Mufid 'Aam, Agra 1921) is named. Wafāt Nāmah. Before considering what is real and apocryphal, it is worth while to offer to the readers what the credulous author of Mānaqib-ul-Asfiya puts in the mouth of Zain. "What has been heard from Shaikh Zain Badr 'Arabi is this : "In my days of adolescence I approached my mother in a state of drunkeness and asked her for something in cash. She said, "Oh my son ask me for something which you might have given to me". Feeling ashamed he came out entered the Khānqah and saw the Makhdum sitting on the prayer carpet with his face towards the west. He turned towards me and told me to get near him. He lifted up a corner of the prayer carpet and allowed me to take but no more than two handfulls. I saw stream of wealth flowing beneath the prayer carpet. I extended my hands and grasped what filled my two fists. With that I went to my mother who shouted out, "Oh my son, the enemy of God you have put your request to such a (spiritual) sovereign". Then I came to myself and thought that I had blackened my face and was determined that I would sin no more".

The above has been copied verbatim in two Urdu biographies of the Makhdum, Sirat-us-Sharaf[1] and Tarikh-i-Silsilah-i-Firdausiya and they have introduced things, which we don't find in the manuscripts. The copy of Wasaya, a Phulwarisharif manuscript, has this "After this I, the poor wretched one, with head bent towards the ground weeping and trembling, was presumptuous enough to take hold of the august hands of the sovereign of the knowers with a view to soliciting the renewal of homage and reiteration of penitence. "I kissed the hands and placed them on head and on the pupils of my eyes. Enquiry was made "who is there?" I submitted "It is the wretched scabby dog of the exalted threshold of the sovereign of the knowers who seeks permission to pay homage again and express his remorse or penitence".

---

1. The respective author of the two were Maulana Zamir'uddin and Moin'uddin Dardai of Bihar.

heir heads like Hindu women, but he would not like the Muslims to articipate in the colourful festival of Holi Saturnalia.

Much more important than these things are the biographical otes in Khwān-i-Pur-Ni'mat and in Ma'din-ul-Ma'ani and also reference o the lessons and lectures imparted in the Khānqah. The Makhdum poke about his revered teacher and namesake whom he called Maulana Lākā, and his sweat-voiced brother, Zainu'ddin, who was the Ḥāfiz r the memorizer of the Qurān but was also an expert in the art of music and was preferred as Imām in prayer by Ṣulṭān Shamsu'ddin[1] Firoz of Bengal (701-722) and Shahzadah Qatlgah Khān, his son who was killed by his brother Bahadur); significant and fairly detailed information is furnished about Maulana 'Alau'ddin Jeuri[2] of Delhi who imparted lesson on different branches of high knowledge to a set of persons, and about Shaikh Ruknu'ddin[3] who did much for the popularisation of the Firadausi order of Sufism, and was the first to introduce the practice of celebrating 'Urs or death anniversary of saints along with Samā' in Delhi. The Khānqah of Bihar was a seat of learning. Many of the books specially on mysticism, law traditions, and commentary etc., on which lesson were imparted in the Khānqah have been mentioned, Primary education was also not neglected Boys and girls were brought for the initiation of the Bismillah[4] or the Maktab ceremony, and the description given in the account of several Majlis (assembly) shows that what Makhdum did or thought on occasions has still its echo in present times. In short, for the variety of information, some new and interesting, and the glimpses of the remote past that we get from the Malfuzāt, we are all indebted to Zain Badr 'Arabi.

1. There are many references to this good and religious-minded king, the 3rd of the Bengal Branch of the house of Balban, in the various malfuzāt, and these are of historical and cultural interest.
2. The printed text of K. P. N. mis-spells jeuri as Jonpuri. None of the three-four manuscripts in Khudabux Library is free from such mistakes. In one copy of K. P. N., there is much of Malfuz-us-Safar; such hodge is found in many mss.
3. K. P. N., Majlis 47.
4. Ma'din-ul-Ma'ani.

and foibles which persist till the present times. Then as now, there was the calling of Adhān in the ears of the new born child; 'Aqiq (shaving the infant's hairs of head); Taṭhir (circumcision), Siyum (ceremony of the third day), reading of the Qurān on the tomb; throwing dust of clay in the tomb. Talqīn (funeral services), placing flowe on tombs and offering Fatiḥah (prayer offered to the soul of the dead); the use of Haft[1] Dānah (called Satnaja or the seven cereals) on Āshur or 10th Muḥarram; and also of the appliation of coligrium to the eyes on that day; Rozah-i-Maryam; demand of 40,000[2] Tanka (rupee) as dower money for bride. People believed, then as now that the sitting near the door frame, burning[3] the crusts of garlic and onions in houses, making use of common or broken combs and of common towels caused poverty and separation. We get frequent references to Sehr (Sorcery) Fāl (omen or augury) and Ta'bīr (interpretation of dreams). The Makhdum was asked about the miracles of the saint of Bahrāich, Syed Sālār Mas'ud Ghāzi ((called Ghāzi Miyān), the reputed nephew of Maḥmūd of Ghazni, and he said how such men[4] became mythical figures. A festive fair is still held in commemoration of his tragic death in the beginning of May in Maner and elsewhere.

The testing of the Kaftār (Kutni) or despoiler of the dead by drowning her, and the thief-catching process by causing a 'Badhni-i-āb'[5] (small water pot) with grains on its cover to revolve by the recital of some Qurānic verses, were considered by the Makhdum as Satanic. He was liberal enough to justify the action of Muslim employees of Hindu lords and master addressing them as Thakkar or Khudāwand, and Muslim women applying Shangarf[6] or vermillion on

1. Mukhkhul Ma'ani.
2. Bahrul Ma'ani or Tuḥfa-e-Ghaibi = (TG).
3. Ma'din ul-Ma'ani and also K.P.N., See also Aḥsān-ul-Akhlāq, an 18th Century work by Mīr Mazhar 'Ali Rajgiri poetically named Ṣād.
4. Muniṣ-ul-Muridin, See also Rasail-ul-Ijaz of Amir Khusrau where Masood. Ghāzi and Behraich, his burial place, have been mentioned and the myth around him has been referred to
5. Ganj-i-La Yafna = (GLY); Bahr-ul Ma'ani
6. Mūniṣ-ul Muridin.

who were addicted to drudgery and toil, earned their bread by the sweat of their brow, or who were poor and distressed. He would recommend[1] others but would have nothing for himself from kings and rulers. He denounced the 'dignity-seekers' and 'sellers of faith', the hypocrites who posed as Shaikhs and Sajjādahnashin and put on patched garments, and those who took recourse to clever devices to escape from payment of Zakāt, and ignored the dictates of Shar'. He had no sympathy with clean-shaven Qalandars; nor did the Hindus who resorted to satanic Subterfuge escape his attention.

In the first Maltūz we read that a certain cheat who had managed to occupy at the trunk of a huge tree, had become for the blindly credulous an apparition and an object of worship Foolish people assembled in large numbers to offer their homage to the invisible deity who appeared to speak from within the tree. They painted the trunk with vermillion; and it was strewn with flowers. One, reputed to be an ascetic, had discovered the game of the trickster; but allowed his mouth to be sealed with money. The Makhdum would admire, even if he did not approve of, the intensity of love which made Hindu men and woman sacrifice themselves for the object of their worship. A man on Raigir[2] hills has been seen standing night and day, gazing constantly on a stone idol in his left hand for so many years that his elongated nails could be folded up round the hand. When the idol fell down the man destroyed himself. We get references also to self-immolation of widowed[3] woman on Rajgir Hills; to cells with idols in front of which the love-stricken women stood with folded hands and head bent down, refusing the offer of food and drink, becoming more skeleton, and ultimately dying after setting fire to the scanty clothes. There were Siddhas and Jogis also who claimed to bring down rains, fly in the air, float or walk on the water. They practised what they called 'Kāchak' or 'Kapāri' (a votary of Shiva who carries a skull in his hand and a chain of these round his neck). Even in these days one gets echoes of such things in Bihar.

We naturally get much more about the Muslims, their manners and customs from birth to death, their beliefs and practices, fault

1. Many instances of recommendatory letters written by the Makhdum with his own hands occur in the Malfuzāt,
2. Khwan-e Pur Ni'mat = (KPN); Ma'din-ul Ma'ani = (MM).
3. Ma'din Ma'ani.

the wayward Tughlaq Ṣulṭān Muḥammad, (probably in 739 i.e. 15 years before 754) who had also sent, for Makhdum, a Jāgir in Rajgir and a Bulgarian prayer carpet. The Jāgir which the Makhdum had to keep reluctantly at the entreaty of the governor, was returned 15 years[1] later, to Ṣulṭān Firoz Shah when he visited the Makhdum in Bihar, while he was on his first expedition to Bengal against Ḥāji Ilyas in 754. This suggests the date of the bestowal of the royal gift, and order in 739. There was a few years later, something like a formal installation of the Makhdum whose remarks preserved both in Ma'din and Manāqib about the seat being the site of a 'But-Kadah' is significant.

The Khānqāh was thronged by men from far and near, Indian and outsiders, high and low, rulers,[2] high officials and functionaries, scholars, seekers, of knowledge. Zain tells us at different places in the Malfuzāt which he compiled and we also get something in Sharḥ-i-Adab-ul-Muricīn, about the Kām Karan who worked as daily labourer, the Kanizagān or the slave girls, who aplashed[3] their feet in mud and water on the edge of walls and tanks walked bare-footed in the mosque, and offered their prayers; the Kushāwarzān who made use of their "Hulla" a plough to produce grains and various classes of artisans. and also minstrels and instrumentalists like Chhaju Gawāi and Ḥāji Rabābi. The Makhdum of Bihar was not out of touch with the reality of life and did not neglect those

1. Maktubāt-e-Mu'iz Shams Balkhi (Let. 98) says "would my spiritual guide" may his secrets be sanctfied accept (keep) this village from the King for 15 years, if in this respect there might have been any fault or harm. Perhaps he had no reliance on himself or was afraid on account of God's creatures; and he abandoned it when that fear was gone, after the death of the donor. "Magar tawakkul ān dāsht wa ya az khauf khalq kard: chun khauf raft, ān gāh tark āward"
2. Among the persons who came to pay their respects to the Makhdum of Bihar some worth mentioning included two men sent by Khan-e-Zīshan. Prime Minister of Firuzeshah Tughlaq; the wife of Ṣulṭān Ikhtiyāru'ddin Ghāzi; the deceased of Bengal, Sarkhail Mukhlis, Naib of Daud Khān; Maulana 'Alau'ddīn Mi'bri. (of Madurai); Maulana Jalalu'ddīn Multani, Maulana 'Ali Khurāsani, Shamsu'ddīn Damishqi, Shaikhāzda Chishti.
3. Khwān-i-Pur Nemat, see also Sharḥ- Adabul Muridīn.

and read them himself, word for word, and corrected and amended the lapses. He sometimes added illustrative ancedotes and verses, couplets, quatrains, quite apt and appropriate to the occasion. Arguments and objections (Īrādāt) which had been raised were also incorporated, along with the replies given and the collection was named Ma'din-ul-Ma'ni.

Some of the smaller treatises such as Maghz-al-Ma'ni and Mukh-ul-Ma'ni were 'Malfuzāt-i-Istikhrāj Karda', that is based on extracts from other works. They had also their contents checked up and were brought before the Shaikh who read them from beginning to end and made amendments and corrections in several places. In Tuḥfa-ṭ-Ghaibi Zain Badr 'Arabi writes that he had listened to the discourses on several occasions and had striven to treasure them up in his memory. Having correctly written out the whole things, he submitted the collection to the great Shaikh who, with a view to making it more beneficial, wrote something with his own blessed hands on the margins. He is much more brief in another collection (Ganj Lā-Yafnā). Many life-nourishing discourses which had fallen to his ears from the pearlscattering lips of the venerable Shaikh, the sense and meanings whereof had been grasped and understood thoroughly by him, were packed up and put together in this store house of permanence, "and yet this polluted dog of the exalted doorsteps" and this "ragwearing beggar" hoped that the collection (would come under the persual) of the spiritual master so as to be embellished, and have its value enhanced so as to prove to be cherishing to those who were mad after love (Divānagān-i-Muḥabbat).

As already noted, the earliest biggest and the most important of the series is a compendium not only of religious thoughts and teachings from Sufie standpoint but also of diverse matters of general interest. The wealth of information in Ma'din - al - Ma'ni has been arranged not chronologically but systematically under definite headings, all largely, of course, of mystic import. But there is much in it, and also in other Malfuzāt compiled by Zain Badr of narrative, descriptive; biographical nature and of historical and cultural interest. Here are a few points culled from the Malfuzāt literature. The Ma'din, as well as Manāqib say that the Khānqah of Biharsharif was built by the then military Governor, Zainu'ddin Majdul Mulk, Maqta i-Bihar.[1] at the orders of

1. The other Maqtas or Governors of Bihar mentioned in verious Malfuzāt were Malik Nathu, Malik 'Alau'ddin, Malik Mu'izu'ddin Ghori, deceased. The high functionaries referred to here and there were Sepah-Salar, Mutaṣarrif, Qāzi, Ḥakim, Kotwal Katib etc.

The fullest idea of the method and techniques adopted was provided by the compiler himself in Ma'din - al - Ma'ni. The essentials have been detailed as follows:– Every one of the sincere seeker and devoted disciple, present in the assembly and other places, could, according to his capacity and worth, put questions, cite passages or precedents from works and would like proof for what might be to the contrary. Many of these were interested in principles and doctrines of the path, law, knowledge and Reality. The Makhdum gave adequate and convincing replies and his observations, full of matchless hints and allusions, pregnant with meaning, were couched in clear and intelligible language. The compiler while sitting[1] there, exercised the best of his efforts and capacity to preserve in his memory the dialogues and discussions which he put together in the collection. As far as it was possible he left out nothing, word or expression: If per chance, due to his faults or failure of mental power he forgot the things as they had been actually uttered, and the talk did not remain with verbal exactitude in his memory, and yet he was quite concious of the sense, he put the main drift in an appropriate language, as it was the sense which really mattered. He was, however, also careful that there should not be the slightest change and deviation from the original sense and meaning. If he thought that he had missed the main purport of some talks, he was careful enough to leave some pages blank, and submitting that on some other occasion to the Shaikh, filled up the gaps After having had the approval of the members of the assembly, he put the whole thing into black and white. Feeling that there might still be some loopholes, mistakes, or variations somewhere, he submitted some portion of the compendium (Majmuah) to the venerable Shaikh and solicited his permission to read out the things to him The Shaikh was gracious enough to take

1. He was himself one of the most prominent of qusestioners. His object in posing questions was to shake off some of his doubts and difficulties and get himself enlightened on matters of doctrines, beliefs, and ritualistic practices. Whenever we get the word "Bechara" in the Malfuzãt compiled by him, we can take it that he means himself. Some of the questions and their supplementaries put by him appear to have been very pertinent and arose from subject matters of talks or the lessons delivered on books of mysticism, law and traditions.

sins be forgiven). Ganj-i-Lā Yafnā[1] (imperishable treasure) ntains the discourses from Rabi 1st Sunday 2 to Ṣafar I Wednesday 7 1 A. H. Malfūz-us-Ṣafar,[2] probably the 7th compiled by Zain, was collection of Ṣafar and succeeding months upto Jamadi II of 762 H. Tuḥfa-i-Ghaibi (heavenly gift) also called Bahrul-Ma'ni commen- from 12 Shabān Friday 759 to 770 A H.; and though it goes down seventy seven, Bahrul-Ma'ni has been described as the fourth Malfūz Charumin Bahr ast az Bahr-i-baqa-i-lafz-i-Pīr", that it is the fourth of Sea for the permanency of the words of discourses of the Pīr (spirit- al leader). Tuḥfa-i-Ghaibi also came in from the hands of Zain who described in it briefly "meaner than the dust in this path"; strangely nough, however, in two places, Zain Badr, the compiler refers the "first" and the "fourth"[3] Malfūz (19 & 11 Zilḥijja 759 A. H.). Malfuz-u-Safar, dated Saturday 12 Jamadi 1, 762, Zain refers amore exhaustive treatment of the relevant topic in Vol. IV the Malfūzat. Again, under the date, Saturday of the Rabi 762 he refers to the 5th and 6th Malfūz for more detailed infor- ation on the subject. None of the Malfūz except those which were inted are completely free from disarrangement. Parts of one are und incorporated in others. Thus there are variations and discre- ancies, here and there. There are smaller tracts[4], Irshad-us-Salikin, rshad-us-Ṭalibīn, Kanzul-Ma'ni, Maghz-ul-Ma'ni etc., the names f whose compilers have not been specifically mentioned. Ashraf Rukn alkhi compiled the small treatise; Aswila-wa-Ajwiba, and he also collaborated with Zain in compiling in 769 what is wrongly called Maktubāt-i-Do or Seh Ṣadi

1. Azin Ganje ke Lā-yafnā ast Yārab; ba bakhshaish bar ahl-e-Ishq kun bakhsh - Ṭufail - i - ān hama Sherān-e-shahbāz : Sag-e-dar Zain rā yak Ḥubba - i bakhsh.
2. The rare copy of Futuḥa Khanqah manuscript is defective, incomp- lete and overlapping and portions are rewritten in different hands.
3. The names of the 3rd to the 6th Malfūzat referred to here have not been mentioned. There are references in Malfūz-us-safar to third, fourth, fifth and sixth Malfūz compiled by Zain but they remain un-named.
4. The Futuḥa Khānquah - Library is very rich in the Malfuzāt, Maktubāt and other works of Ḥazrat Sharafu'ddin. There are works of other saintly personages of various orders of Ṣufis.

such as Fawāid-e-Rukni[1] with its eleven or twelve profitable notes or significant observations of spiritual value provided for or written at the instance of Hāji Ruknu'ddin, were also compiled by Zain Badr 'Arabi and may be taken, along with others, as his legacy to posterity.

The first, and by far the most detailed Malfūz, compiled by Zain Badr 'Arabi, Mā'din-ul-Maāni (Mines of meaning) of which the printed text consists of 500 pages, is divided into 65 chapters, called Bābs, covers the period of the forties upto Shābān, 746 A. H. The copy is marred by certain interpolation. The letters in the collection known as Maktubāt-i-Ṣadi start from 747. Khwān-i-Pur Ni'mat[2] (spacious tray full of delicacies), divided into 47 Majlises, is the second and supplementary volume. It is of small size and contains the discourses of the Makhdum from 15 Shābān 749 to the end of Shawwāl of 751. Mukh-ul-Ma'ni (the marrow of meaning is undated and has been wrongly ascribed by the author of Sirat-us-Sharaf to Shihābuddin Imād Halifi. He does not mention his source, and nowhere in its 53 Majlises we get any trace of the compiler. But the brief prefatory note, specially the expression. "Sam'-i-Qāṣir" and "fahm-i-Nāqiṣ" and "Dar Taiy-i-Kitāb Āwurd" remind us what Zain has dealt with at greater length about the format and technique adopted in compiling his Malfuzāts. There is a reference in it to the vagaries, eccentricities and cruel bloodshed, alternated by liberal gifts and lavish grants. made by Muḥammad Tughlaq (d. 751) who has been described as dead (Ghufira Lahu: may

---

1. This small work gives in a nutshell the spiritual thoughts of the great saint of Bihar and much of it reminds us of the contents of Maktubāt-a-i-Ṣadi and Sharḥ-i-Adab-ul-Muridin. Very similar to the Fawaid is the Ajwiba containing the replies given by the venerable Shaikh to his disciple, Zahid, son of Nizām, and the other saints and desciples and they deal with the fundamental principles of Taṣawwuf and essentials of ethics and morals. Some spurious or apocriphal matters have crept in a small work named Irshād-us-Salikīn noted with amazement by Shaikh Aḥmad Sarhindi known as Mujaddid-Alf-i-Sani.
2. Go Jahane bar khurad zeen khwan - i - pur Ni'mat madām
Zain-i-miskeen rā bas ast gar reza-i-bakhsh and azān.

The faithful ones remembered and recorded the Dialogues and Discourses in their own way and language, considering that this would lead to their salvation. Sometimes one feels puzzled to account for the apparently vague, confusing, conflicting, explanation and interpretation, coming as a sequence of a sprinkling of scriptural quotations, and it becomes difficult to accept that these actually emanated from the great Shaikh The scribes who transcribed the collections often made a mess of things. There is no questions of misunderstanding or misquotation on the part of the compiler.

Though the majority of the Malfuzāt were collections preserved by Zain Badr 'Arabi, and only a few, such as the small but highly informative Muniṣ-ul-Muridīn[1] of Ṣalāḥ Mukhlis Daud Khani, compiled in 775, are trom others; yet the range of topics covered, the style and language adopted, simple, clear and intelligible, do not appear to be the same and similar in all such works. Ṣalaḥ Mukhliṣ was not only a devoted disciple but also a builder and engineer for he raised a Qubbah (dome) on the tomb of Makhdum's Mother, and his name occurs on a big stone plaque which was originally fixed on the gate of a fort built by Sulṭān Firoz Shah Tughlaq in Saran (Bihar) and is now attached to a shrine in Tajpur[2] Basahi of the same diṣtrict and is dated 774 A. H. Abdul Ḥaq Waddin, Dāud Khān, father of Ṣalāḥu'ddīn Mukhlis figures also in Chirāghdān inscription of Amber (in Bihar) which is dated Rabi, 765 and he was perhaps the son and Successor of Malik[2] Bayyu and a Governor of Bihar during the reigns of Muḥammed Shāh and Firoz Shāh Tughlaq. Besides Maktubāt and Malfuzāt, some smaller tracts

1. A corpus of Inscription in Bihar by Dr. Q. Aḥmad.

2. See a separate paper on this warrior saint of Pīr Pahari mausoleum in Bihar and also an English Translation of Maktubāt-i-Ṣadi, by Fr. Paul Jackson and published by Pauline Press, New York (recently published.)

before him. The conservative companions came down upon the high minded chief for resorting to what they considered to be a highly irreligious act, and the quarrel becoming hot and prolonged sent the saint into a state of ecstasy which lasted for more than a day. The Manāqib also gives a hint to this episode.

We cannot expect to have a picture of anything in all its fullness or a connected account of life and conditions, socio-religious aspects of monastic life in Khānqah, its educative value, the books learnt, referred to and lectured upon.[1] But we can catch the pervasive atmosphere of the time and place of study and penance, enter into the spirit of the life, works, and thoughts, and have a fairly correct idea of the Ṣufi way, their mode of living, method of training, discipline, ideology, views and practices from essentially spiritual standpoint. There may be, in these, many points also of general interest which a researcher may utilise for a socio-historical and cultural survey of the time, place, incidents, events and conditions. Considering the setting in which Sufism of the Firdausi order flourished in Bihar and also the magnetic and towering personality of its chief exponent, his utterances and sermons which stirred the audience and made the devotees, present or absent, well-directed so as to be in the world and also outside it, we can not but take the Malfuzāt to be of inestimable value.

Of course, they have their limitations. There is much which is repetitive and overlapping in them. Different persons, at different times entered into dialogues, put questions and had answers on practically the same topics, and the Makhdum obliged them by saying what had been previously said with or without additions. There was recurrence of oral talks and exchange of views on certain controversial questions such as the relation between 'Ali and Mu'āwiah and Ḥusain and Yazid

1. Ma'din-ul-Ma'ni: Some of these are Sharḥ-i-Tajarrud of Kalabadi, Sharḥ-i-'Awarif-ul-Ma'arif, Qut-ul-Qulub, Wasilat-ul-Qulub, Sharḥ-i-Maṣābiḥ, Rauzatul 'Ulamā Hidāyah, Kashshāf, Fuzdavi, Qudūri, Mufassal, Tafsir-i-Zāhidi, Bustān-i Abul Lais, 'Aqāid-i-Nasafi, Tamhidāt-i-Abu-Sha ur Sālumi, Tamhidāt wa Maktubāt and Zubdah of 'Ain-ul-Quḍāt, Kanz-ul-Maṣabīḥ, Mashariq-ul-Anwār of Saghani Lahori etc.

ecial for him; and that other contemporary rulers and[1] Sulṭāns who ere not so obliged. But the people of Bengal and Bihar failed in their uty to preserve these valuable heritages of religious literature.

Unlike the Maktubāt, the Malfuz literature may be studied pri- narily as a source of knowledge, often with fair accuracy[2] of dates nd names of persons and places. Such species of things are not to found elsewhere. There is a general bias against hagiological liter- ture, lives mixed with legends, of medieval saints and Sufis. We can- ot expect from these any scientific methods and rational outlook accor- ing to modern standards. The votaries suffered from, and may have ecome victims of, some amount of hallucination and self-delusion, and hey went too far in glorifying their spiritual preceptors. Strange as might appear to many, even in his lifetime the Makhdum of Bihar ad become the subject of myths. The author of Manāqib-ul-Aṣfiyā lls us that a Qāḍi, a close associate of the Makhdum, asked him hether it was true that for thirty years he ate no food and there s no excretion or motion? The reply given showed that there was question of getting cereal or cooked food, and he was forced most the time, to subsist upon what he could get in and from the jungle, d at times even some grass of nutritive value sufficed for him. In Malfuzāt we get how the Makhdum was subject to the infirmities a human being. Once in his desire to clean himself so as to offer morning prayer he threw himself in the hot spring at Rajgir during old night and had to suffer from that for many days. From Ganj- ashidi we learn that once, in deep winter, with scanty clothes on his ody, he had to descend from the hills and hide himself in a heap of raw on the edge of a village. In Muniṣ-ul-Qulub we get how the ngs of hunger drove him once on the hill to a place where apparently ich Hindu had his food served before him. He fixed his gaze on menues, hastened in accepting the invitation, and fell on the food

---

But there are two letters, one written to Sulṭān Muḥammad Tughlaq in reply to the request made by him for something special, and another addressed to his cousin, Firoz Tughlaq, recommending a Zafarabadi : Maktubāt-i-Sad-o-Panjāh-o-do.

Ma'din-ul-Ma'ani and Manāqib ul-Aṣfiya are arranged not chronologically but in sections of short or long duration.

The poetical effusions of Zain are much too scarce to give him the epithet of a major or a perfect poet. The few verses we have from him do not appear to be of higher order as those in the Diwāns, big or small, of the first four Balkhi saintly disciples, scholars and poets of Bihar. Even Ahmad bin 'Isa Balkhi who called himself Ashraf Rukn and compiled, in collaboration with Zain the Maktubāt wrongly called Do-Sadi or Sih-Sadi (in 769) and also a small tract, known as Aswilah wa Ajwibah (dialogue between the preceptor and the disciple), and at whose instance and entreaty the Makhdum wrote out his well known compendium, Sharḥ-i-Ādāb ul Muridīn, showed himself more prone towards versification.[1] Both he and Zain describe themselves as 'the dust of the feet' (Khāk-i-pā) of the Makhdum and, to both, the posterity should feel greatly indebted for rescuing the letters and the discourses of the great Firdausi saint and scholar of Bihar from negligence and obscurity.

The full list of the works, so rich and unique in mystic literature, produced by the Makhdum and compiled by Zain has not come down to us. The themes and the thought-contents of ths letters which flowed from the pen of the Makhdum with the names of the addressees and with characteristic headings, could be easily put together and copied out, of course, after getting the permission, so as to be offered to a wider circle of people, present and future. The Maktubāt contained admirable exposition of matters philosophical, doctrinal, spiritual and mystical with their manifest and hidden meanings, with attempts made to establish an accord between the orthodox faith and reason. But have all such things reached us. ? We have got definite evidence that some of the valuable letters of the Makhdum were lost. But for a reference in one of the letters[2] of H. Muzaffar Shams Balkhi (d. 803 A. H) to Ghiyāsu'ddin A'zam Shāh we could not know that the Makhdum of Bihar had a soft corner in his heart for A'zam's father, Ṣulṭān Sikandar, the second king of the Ilyās Shāhi dynasty of Bengal; that he willingly wrote letters to him in reply to his queries and request for something

1. His verses in the prefatory portion of the so-called Maktubāt-i-do-Sadi and Siḥ-Sadi.
2. See "Maktūb and Malfūz Literature" published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library.

There are in Malfuzāt, Ganj-i-lā-Yafnā and others, refereneess to men in the Khanqāh of Bihar who served the great Makhdum in some capacity or other. Once when he was being conveyed in a 'Dola' (Sedan chair) to Hauz-i-Rāni,[1] Zain Badr 'Arabi walked, along the conveyance with the pair of the shoes of his spiritual leader in his both hands, and Maulana Āmun, Khwaja Zahiru'ddin Gharīb, 'Khādim-i-Shaikh,' and others followed it on foot. There are references also to 'Shaikh Sikandar' or 'Amīr Sikandar Khādim-i-Khās' (attendant in-Chief) of the Makhdum. The latter was once bold enough to ask the Makhdum as to why when the Samā' was at its height he had suddenly ordered its stoppage and the dispersal of the audition[2] assembly, and was told that the Qawwāl had abruptly switched on from Persian to the Hindi Jigari (Dhikri or Chakrī) which was usually sung by women, as some young men had managed to creep in the assembly.

One would naturally like to know the comparative position, status and functions of the various people designated as 'Khādim, 'Khwaja' and 'Amir' which should not necessarily be stretched too much to mean that they compared favourably with Zain Badr 'Arabi who was virtually a Secretary and scribe, the 'Mīr Munshi' of the Makhdum, to use a modern parlance. There is nothing on record that others were possessed of any special and superior qualification.

On the other hand, Zain-ul'Abidīn or Badr 'Arabi was a gifted person, and a man of learning and also a poet, as is evident from the few verses, couplets and Qit'ahs which we find under the poetical pen name of Zain in the prefatory portions or colophons of the Malfuzāt like 'Tuhfa-i-Ghaibi', Bahr-ul-Ma'āni, 'Ganj-i-Lā-Yafnā' and Khwān-ipur Ni'mat.

1. Ganj-i-lā-Yafnā, under the date of 28 Ziq'ad 760. There is no trace of any such thing in Biharsharif.
2. There are many references to ecstatic songs but not to rotative dances performed by Darveshes both in the Maktubāt and Malfuzāt; and constructive suggestions and restrictive instructions were laid down. Mu'izz Balkhi gives a very graphic account of Sama' showing the attitude of the saints of Firdausi order in his Malfuz called Ganj-i-la-Yakhfa.

the Makhdum said "let alone (Hallā), go at this time to your house and he did that" Obviously this does not refer to the first Lakhnauti expedition of Fīroze Shāh Tughlaq against Ḥāji Ilyās in 751 A.D. According to Sirat-i-Firoze Shāhi the Tughlaq Sulṭān, perhaps, on the second expedition to Lakhnauti, passed through the proximity of Bihar. He may have, however, met Ḥazrat Chirmposh on the occasion of the earlier expedition. According to Tārīkh e-Mubārak Shāhi Fīroze Shāh set out for Jaynagar (Orissa) via Bihar in Ziqa'd 761 or October 1360 and returned to Delhi in Rajab 762.

There is another reference, in this very Malfuz, under the date Thursday, 27 Safar; 762, to an interesting dialogue on the question of IMSĀK (abstinence) between the disciple, Zain Badr, a Sayyid, and his Pir who and his teacher, Maulāna Tawāma, appear to have evinced the impact of the views of Maulanā Taqiu'ddin better known as Ibn-i-Taimya (died 720 A, H.) The first topic of the day was 'Sirrhā-i-Qazā wa Qadr' (the secrets of fate & pre-destination) which were too subtle and time-taking, difficult but not impossible to explain away. Then the talk switched on to the question of imprecation on Yazeed, Son of Mu'āwiah. The Makhdum said that one should not curse Yazeed or any campanion of the Prophet, but follow the practice of sermonisers who cursorily, or in substance (Mujmalan), referred to those who deserved praise or blame. Zain appears to have had his own views about the relation between Ali and Mu'awiah and Ḥusain and Yazeed and as regards the latter the sayyid in him burst out, Why should one not condemn the acts and curse the blameworthy one ? What could be worse than the killing of the darling (Jigar-Gosha or probe of the liver), of the Chief of the prophets with swords and arrows and making his family-members prisoners in the desert land of Karbala ? To pacify him the Makhdum said that 'Ali had come to terms with Mu'awiah and that there was no occasion for cursing or condemnation when the former had made peace with the latter. As for Yazeed there was a good deal of difference of opinion among the theologians; some held that there was no justification for condemnation of one who had been the Imām of the Musalmāns for many years. Then again the matter was controversial; it was better to avoid imprecations. Moreover, he may have repented his actions "Shāyed ki Azān Taubah Kardah Bāshad".

that the latter was a 'Ḥasani-Ḥusaini Sayyid', he said that he had heard something like that from some elderly people.

There is mention in this ms. of only four[1] generations and also of the word 'Mīr' for Zain Badr, and these raise doubts and difficulties. More reliable are incidental references in Ganj-i-Jā-Yafnā and Tuḥfa-i-Ghaibi. In the latter under the dates 22 Dhilḥijja, 760 A.H , we get that on Friday after morning prayer, Zain came to his Pīr with a tray containing betel leaves and some sweetmeats, placed his head on the ground, and reported that a son had been born to him; and he requested the saint to give the child a name and surname. As had been the case with the earlier offsprings, when asked about them, he said that the eldest, Badru'ddīn Muḥammad, and the middling, Isḥāqu'ddīn Aḥmad, had been so styled by the Shaikh. He was told to call the newly-born Qamaru'ddīn with Maḥmud as his Surname.

Without any concious effort to thrust his own personality, Zain Badr does furnish us with some personal references. In what is named as Malfuz us Safar, under the date, Saturday, 6th of Rabi. 1762, while mentioning the view of Imām Shāfi'ī of Sayyid descent - which was not the case as that of the other three eminent jurists of the orthodox school - about the justification of the use of Inshā'allah (if God willeth), he writes that when he was in Pandua (Bengal), he met the Quṭb there who made his own observations on this very topic. The same Malfuz under the date, Sunday 23rd of Ṣafar 762, tells as that when he returned from Lower region (Farodast i. e. Bengal), after a stay there for 6 months and 16 days, he came to pay his obeisance to his spiritual master and had the honour of kissing the ground at his threshold between the two evening prayers. The saint asked him about the alarm and disquititude of the creatures of God in the Farodast (Bengal) region on account of the assemblage of the huge and powerful army of Sulṭān Fīroze Shāh. After hearing him

1. "Asadullah, son of Sayyid Shāh Muḥammad who was the son of Sayyid Maḥmud, the son of Qāzi Murtaza, one of the sons of the exemplar of knowers, the cream of those who had realised God, viz. Mīr Sayyid Badr 'Arabi who was a Ḥasani wa Ḥussaini, and a Khalifah (?) of Makhdum Jahān"

Fettered by traditional views and usages, and generally unconcerned with mundane matters, which we prize so much, the mystic Sufis kept themselves in the background and were incommunicative about themselves and others also; and whenever they had to refer to themselves, they assumed very humble terms and expressions. Described as 'Dast-girafta' (protege, helper or assistant), of the Makhdum, Zain Badr 'Arabi called himself 'Bichārah-i-miskīn' (Poor helpless one), 'Sag-dargāh' (dog of the threshold), 'Gadā i-Zhandah posh (beggerly, clothed in rags), 'Khādim-i-Makhdum-i-Jahān.' There is nothing to be surprised at this, for greater men like Maulana Muzaffar Shams Balkhi always used self-humiliating and self-effacing appellations such as Maṭbakhi-Khām (raw cook) and 'contaminated dog' etc. for himself; and even the great Shaikh himself, in reply to the letter of Dāwar Malik,[1] the sister's son and son-in-law of Sulṭān Muḥammad Tughlaq, called himself as 'Mudbir' (luckless wretch), Makhzul (forsaken), 'Sag-i-ru-siyāh' (black-faced dog), Sag-i girgin-i-āstān-i 'ulamā (the scabby dog of the threshold of the learned ones).

It is a pity that posterity has forgotten many great celebrities of the past, and at this great distance of time it is no easy task to penetrate into obscure corners, to know the truth end clothe and animate the dry bones of vaguely-remembered individuals. Even the present representatives of Zain Badr know little or nothing authentic or reliable about him. There is a small colony of people on the north-eastern corner of the campus of the Dargāh which contains the final resting place of the Makhdum, his mother and also of others, who claim direct descent from Zain Badr 'Arabi and feel proud of, and are still glorying in, being called 'Khuddāmān' (servants). I asked the most learned of them an ex-principal of an Arabic college, whether he knew anything about the early life, geneology, education, activities, of his ancestor; but I failed to bring out anything from him. When I told him that the scribe of an old manuscript of Maṭlub-ul-Mubārak, the Malfuz of Maulāna Āmun, in Pulwarisharif Khānqah Library, had claimed, in the colophon, his descent from Zain Badr 'Arabi, and written

1. See Maktub-i sad-o-panjah-o-do. Dāwar Malik was the son of Khudāwandzāda, the sister of Muḥammad Tughlaq. This shows that the Sulṭān had a daughter who was married to his sister's son.

It is a pity that antecedents, character, personality, position and contributions of one who did so much to preserve for poster- the records of teaching, learning and the ways of the Ṣufi celebrities Bihar of byegone times and circumstances, who enlightened and nabled us to know what was said and written, and how and what eople who assembled in religious houses, hospices or Khānquahs, hought and acted, are shrouded in obscurity. Zain Badr 'Arabi con- ibuted much to the survival of the genres known as Maktubāt and la'fuzāt which had been cultivated greatly in the 14th century, perhaps uch more in Bihar than elsewhere in India. Except the meagre formation supplied by the credulous author of Manāqib-ul Aṣfiyā, ne of the contemporary producers of religous and mystic literature red to review or survey the learned utterances and teachings of the oneer of the Firdausi order of Ṣufiism in Bihar, Shaikh Sharafu'ddin hmad Maneri, and none has left behind anything worth knowing bout him despite the very close association with him of countless umbers of ardent devotees and disciples. The little that is found even n later[1] works is not free from what may be taken as unwarranted and pocrypha, as we shall see hereafter.

Why has no one cast his glance and set his mind on Zain? Is t because he was too insignificant to be noticed? But do we know uch about such a personage as Shamsu'ddin more than that he was he Qāzi or Hākim of Chausa; that he was the recipient of 98 out of 100 etters in Maktubāt-i Sadi; that he was one of the many querists when- ever he happened to be present in the Majlis or the assembly; that he was addressed in and after 747 as 'brother'; that when he came near the death-bed of his great spiritual guide in 782, he was lovingly address- ed as 'Farzand' (son); and that he was the first to be embraced? Even for these meagre information we are indebted to Zain Badr.

---

1 Sirat-us-Sharaf by Maulvi Zamīru'ddīn of Bihar.

The story given in Manāqib-ul-Aṣfiyā, that Zain was a drunkard, and being chided by his mother and favoured by the Makhdum, became a changed man, though not wholly improbable, reminds us of the way how saints were made.

This article

for the first time

sheds light on the

selfless person

who

did so much

to preserve for posterity

the works

of

the Makhdum of Bihar.

ZAIN BADR 'ARABI

(A Short Sketch)

by
Prof. S. H. ASKARI

رام و اچهمن و کارست سوگند　　به سیتا و هنومانست سوگند
به بشن و کرشن و اقبال جگنات　　به جاه سومنات و رتبه لات
بتان از هر طرف برهم دویدند　　بهیکدیگر چو رنگ گل رمیدند
گریبانها ز مستی چاك کردند　　حساب رنگبازی باز کردند
چه حاصل نکهت از طول کلامست　　تمام است و تمام است و تمام است

There is a reference to several important places all over the country, such as Patna, Akbarabad Hyderabad, Bengal and Rajputana where this festival is celebrated with extreme gaiety and mirth:

تماشا بین ز نزدیکان و از دور　　ز پتنه تا جهان آباد و لاهور
ز سرهند و حصار و اکبرآباد　　ز برهانپور و ملك حیدرآباد
ز بنگاله و ملتان و بنارس　　ز گجرات و سروج و از کلارس
ز سورت و ز اجین و شهر اجمیر　　ز ملك راجپوتان تا برانبیر
ز بیجاپور و شولاپور و راچور　　ز میلاپور و سالاپور و ایلور
ز کشمیر و جلال آباد و کابل　　بچندین رنگ دل صبر و تحمل

Mushāfi writes "sometimes back I came across a couple of Mathnawīs composed by this poet in the metre known as Hazzāj One of these Mathnawīs describes the charms of spring and the other portrays the festival of Holi. A study of these Mathnawīs shows how much pain the poet has tāken in composing them[1] Khushgo says, "He was gifted with wonderful memory, and whatever he composed preserved in the book of his bosom. That is the rsason why, after his death, his poetical output had been lost to us.[2]

****

1. 'Iqd-i-Surayya (Jami'a Barqi Press, Delhi 1934), P. 58.
2. Safina-i-Khushgo (Patna 1959), P. 210.

رفیق ما پسر گجراتیان اند ٭ که مطوعند و مقبول جهان

He also mentions Khattris, Brahmins, the people of Banaras d others who participated in this festival :

بهار عیش کهتر زادگان است   رفیق ما فلان است و فلان است
برهمن زادگان را در حواشی   ز بعد رام رام و رنگ باشی
بنارس‌زادگان شوخند بسیار   بهم گستاخ و چشمك باز عیار

The mathnawī makes an interesting reading and is characterised th fluency and use of Hindi words, as is evident from the following es :

شود چون نغمه ها مایل بسارنگ   ز روی گل دوپهری می برد رنگ
پکهاوج طرفه ساز بی نظیر است   بلند آوازه و عشرت خمیر است
بیا ساقی که جام باده نوشیم   بهم چون صاف و درد می بجوشیم
که امشب تا سحر در صحن گلشن   چراغان راگ دیپك کرده روشن
ز شوخ نو بهار رنگ بازی   به بزم رقص و تال دف نوازی
گلال و زعفران و ابرك و رنگ   نوای مطرب و قانون و آهنگ
نی و طنبور و بین و چنگ و مندل   گلاب و عطر و مشك و عود و صندل
می و رقاص و جام و تال و مردنگ   اصول و شوخی و آواز تهوچنگ
برنگ سبحهٔ صد دانه گشتند   بشیخ و برهمن همخانه گشتند
دو چندان بیرهٔ ... و طلائی   مرصع پاندان پان طلائی
در و لعل و زمرد نه عیانست   مگر کان جواهر برگ پان است
دوچندان زان سپاری هم بسازند   که برهمن زادگان لبریز نازند
بیا بنگر که خوبان درچه کار اند   بهم یارند و عزم جنگ دارند

Ṭughra had travelled throughout India and had seen all its important cultural centres, and was very much impressed by our various festivals. The author of the Ṣuḥuf i-Ibrahīm writes that he used to accompany Holi processions and throw colour on them. In the following qāṣīda he describes Holi and uses a number of Hindi words:

گردیده مینا راگ خوان رنگ صدا گشته عیان

و ز نغمهٔ آب روان در جوی تکرار آمده

شد وقت هولی باختن با رنگ و بو پرداختن

خود را چو گلبن ساختن باغ ارم خوار آمده

آن شوخ کنترائی لقب چون رخ کشاید نیم شب

پیدا شود صبح طرب خورشید رخسار آمده

رجپوتنی دل می‌برد جان نیز غافل می برد

ایمان ز کامل می برد از بسکه طرار آمده

گردن بگردن مالها یك مه فگنده هاله ها

نی نی که هر سو ژالها با شاخ گل بار آمده

Besides this qaṣīda, there is a rare and colourful Holi Nama[1] by Muhammad Yusuf Nighat Burhanpuri, entitled Sukhanwar Khān, who has praised 'Alamgīr in these couplets:

گل اورنگ زیب نو بهار است ○ که هم تخت آفرین هم تاجدار است

بدور شاه عالمگیر غازی ○ که دارد یك جهان عالم نوازی

The poet went to Karnataka, where he watched with amusement the festival of Holi in the company of Gujarati youths:

مرا شور تماشا در سر افتاد ○ که از من ره بچندین کشور افتاد

و لیکن چون بکرناتك رسیدم ○ تماشائی که می بایست دیدم

1. MS. No. 175, Govt. Oriental MSS. Library, Madras.

., chanbeli, kewra, Jubi, bandali, nagkesar, pyari suhagan, kela, hal, kamrakh haryarewri, mor Munir accompanied Saif Khān to ngal and travelled from Patna in a boat, which is praised in these es:

کاتش گفتم و الحق همانست — سیه ملاح او زاغ کان است

شبیه او همه از چنگ جویند — و لیکن اهل هندش نای گویند

Mulla Ṭughra Mashhadi (d. 1689), the secretary of Murād khsh and one of the great masters in the art of ornate prose writing, peculiarly interesting. Although an Iranian, he deliberately used numerable Hindi words like paisa, rupaya, Hali, dakchowki, dewhara badal, katahra, dagla, tel, hal, bans, palki, dupatta, jogi, kara and la throughout his writings to adorn his Munsha'at and give them an dian environment. Ṭughra wants to see Hindi penetrate into Persian add to its beauty and richness. The field of simile, metaphor and e atf is also widened with the help of indigenous Hindi language. sides, words like saheli, mahavat, hathnalchi, kalawant, tal, jharoka, pari and jhalar have been integrated with Izafat-i-tāshbihī. Moreover, mpound epithets, compound participles and compound nouns have en introduced by combining Hindi and Persian or Arabic words.

Ṭughra leads us away from the conventional and foreign rroundings to an increased appreciation of the more familiar indigen- us environments. Instead of calling us to appreciate the beauty of aucasus, Khallukh, Naushad and Khata, he finds tremendous baauty the various corners of India like Gujarat, Somnath, Agra, Jaunpur, engal and Ambala.

Ṭughra was not only a great prose-writer, but also a notable eet. One of his qaṣidas is in praise of Maharaja Jaswant Singh of odhpur, in which Hindi words like naulakha mantar, sendoor and rchha occur. In one of his Tarji'bands, the line 'na lena na dena khana na pina' is repeated at the end of every strophe. In addition the Saqi Nama, he has used Hindi words like pan, tika, tel, tal, nyasi, hathphul, phuljhari, hathi palki ghoryal, ghari, pakhavaj, juti, chkari, chhit, chusni, rag, har, pankha, kathal, kela, chuna, supari, ar, sahu, mahajan, jogi, chhatta, malmal, sur, kahar and chanbeli

Nazuk-Khayalāt, the Persian translation of Shankracharya's Atam Vilasa. which was published by the Anand Press, Lahore, with an introduction by Munshi Mohan Lal, an employee of Maharaja Ranjit Singh, has been mistakenly ascribed to Chandra Bhan Brahman. The letters of Nazuk-Khayalāt give the year of the translation as 1708 – 9 which means that the book was translated forty-seven years after the death of Chandra Bhan Brahman. Another proof of this mistake is that the translator of this treatise is the author of the Chahār Gulshan, Mirātul-Tawḥīd 'urf Gita and Mirātul 'Arifin, and we know definitely that Chandra Bhan Brahman was not the author of any of these books. There was another Chandra Bhan (Kaesth, Saxena), who wrote the Chahār Gulshan, the MS, copy of which exists in the 'Abdus-Salām collection, Aligarh Muslim University. The name Chandra Bhan appears to be the translator of the Nazuk Khayalāt also.

The reign of Shah Jahān is distinctly noteworthy in regard to indigenous elements. It is in this period that Indo-Persian literature is truly Indianized and absorbs the spirit of the land, which is signalized by the assimilation of Hindi words even by Iranian writers. Abu Ṭalib Kalīm Kashani, (d. 1651) the Poet Laureate of Shah Jahān, coming from Iran. is so charmed by the Indian environment that he feels tremendous pleasure in using Hindi words, even if they are not indispensable. In his Mathnawis including Shah Jahān Namā and a mathnawi in praise of Agra and Bagh-i-Jahān Ara, the words of Mahajan, hira, Dhobi, Rajput, Pathani, Champa, nim, mulsari, Kanwal, Keorah, Kathal, chhappan, rupayah, lakh, lut, Tal, Barsat, torah, ghari, bal, darshan, sagar, barut, hun, jag, Raj, have been frequently used.

Zafar Khān Aḥsān (d 1662/63) the governor of Kashmir, used many Hindi words in his mathnawi in praise of Kashmir, like bansuri, haryal, falsa, ber, jaman, kela, pan, and kanwal. Yahya Kashi (d. 1654), the librarian of Shah Jahān, has used a number of Hindi words in his Kulliyāt, like bahla, damri, pan, paisa, banya, chawal, dal, khana, kapur, madari, talwar and katari.Fani Kashmiri (d. 1670-71) has got a qaṣida in praise of Shah Jahān, in which these Hindi words occur : pan, rag, basant, kalyan, champa, har, chanbeli, bel.

Abul-Barakat Munir Lahori (1610-1645) composed a mathnawi in praise of Bengal, in which these Hindi words have occurred :

Panchkrohi, Kashi Mahatmaya, Bhagvata Purana, Tarjuma-i-Dib, Khulasa-i-Dharmashastra, Karmavipaka, Vishnu Purana, Puranartha Prakasha, Harivansha Purana, Mahatmaya Ekadshi, Baḥrun-Najat, Kashi Khand, (Baḥrul-Ḥayat) Gya Mahatmaya (Khayalul Falal). Chitra Rekha (Kashful - Anwār) Atma Sambiti (Nazuk-Khayalāt), Vilasa, Sudama Cahritra. Ganesha Purana.

Another eminent literary personality of this period is that of Munshi Chandra Bhan, pen-named Brahman (1662-63). He is one of the greatest Hindu scholars in indo-Persian literature. Shah Jahān gave him the rank of thousand, and used to call him "Hindu-e-Farsi Dān" (The Persian knowing Hindu).

The importance of Brahman lies not so much in poetry as in prose, because he had a unique simplicity of his own. Among the most important of his prose works is the Chahār Chaman (Four Orchards), in which the first Chaman describes the various events and festivals at the court of Shah Jahān. The second Chaman describes the various cities and provinces of the Mughal Empire; the third Chaman deals with the life of Brahman and some of his letters; in the fourth Chaman Brahman has expounded moral and religious thoughts.

This is well-known Chahār Chaman, many manuscripts of which are found in various libraries. But I have recently come across another Chahār Chaman by the same author, the only manuscript copy of which — a specimen of the fine calligraphy — exists in the Tonk collection of the National Museum, New Delhi [1] Unfortunately a few folios towards the end are missing.

In this Chahar Chaman, the first Chaman deals with the life of Shah Jahān and the events of his royal court. The second Chaman consists of letters sent by Brahman to his mother, brothers and the dignitories of the period. The third and fourth Chamans consist of letters sent to his brother and son, Uday Bhan and Tej Bhan respectively.

1. No. 3340.

and Ramachandra in his dream. In that dream Vasishtha told Rama-chandra to embrace the prince. Besides, he handed him sweets to feed him with his own hands. After waking, Dara Shukoh became keener and keener to get the book translated afresh.

Here, it may be mentioned that this book had already been translated. But Dura Shukoh did not fully approve of the earlier translations. One of the valuable translations was rendered by Nizam-mu'ddīn Pānipati, during the reign of Akbar, at the instance of his son, Prince Salim, who later ascended the throne with the title of Jahangir. Mīr Abu'l Qasim Findaraski (d. 1640–41), a great Iranian philosopher has written marginal notes on Nizammu'ddīn's translation, and has prepared a glossary named Kashful Lughāt-e-Kulliyāt-e-Jog Bashist.[1] Besides, he has composed, verses praising the book. He says :–

همچو آب است این سخن بجهان ◦ پاك و دانش فزای چون قرآن
جون ز قرآن گذشتی و اخبار ◦ نیست کس را بدین نمط گفتار
جاهلی چون شنید این سخنان ◦ یا بدید این لطیف سر و بیان
گر بصورت بدین نه پیوندد ◦ زانکه بر ریش خویش می خندد[2]

(Clear like water is this speech,
Sacred and illuminating like the Holy Quran.
Except the word of God and the Traditions
No utterance is as subtle as this.
When a fool hears these words
Or sees the superb expression conveying this subtle mystery,
His mind touches but its surface,
And he laughs at his own stupidity.)

A large number of Sanskrit works have been translated into Persian during this period. Among these are Bhagvad Gita, Harivansha, Rajatarangini, Gulzar i-Ḥal, the Persian translation of Prabodha-Chandrodaya, Shrimad Bhagavad, Devlok Hajati, Brahmaiyana,

1. MS. No. 246/256, Tehran University Library.
2. Kashful-Lughāt-i-Kulliyāt Jog Bashishta.

"Inasmuch as Banaras, which is the seat of their learning, has been these days my habitat, I brought together (at this central place) the leading Pandits (learned men) and Saniyasis (ascetics) and the renowned scholars of the Vedas and Upanishads. In their midst I translated in 1067 A. H. (1656-7 A. D.) this abstract of Divine Unity (Tauhīd) namely the Upanishads or hidden secrets, the acme of the subject-matter of all the sayings of the saints of God. All those difficult and lofty thoughts which I had been seeking and had not attained as yet, I discovered in this resume of ancient revelation, which is the best of all heavenly books and which is also the rock of all research and the ocean of Divine Unity (Tauḥid) and, to crown all, is in consistency with the great Quran and commentaries. It is crystal clear that this Quranic verse is about this book :"

> 'Verily this illustrious Quran is in that hidden book ;
> It is not to be touched except by pure (and holy) persons.
> It is a revelation from the sustainer of the worlds.'

Evidently this verse pertains neither to the Psalms of David (Zubūr) nor to the Books of Moses (Taurait) nor even to the Gospel (Injil). The word 'tanzil' suggests that the said verse does not refer to the Preserved Tablet (Lauḥ-i-Maḥfuz) either. Inasmuch as the Upanishad, which literally means hidden secret, is the origin of this revelation and because the Quranic verses find in it their exact essence, I hereby verily that the "Hidden Book" is this ancient book. From this (revealed) book I — this meek fellow — was able to understand the un-understandables and to grasp the un-graspables (of all kinds) ...

"May all those who, renouncing the desires of wretched self and spurred under lucky stars, by genuine wish to please God, happen to read and understand this translation entitled Sirr-i-Akbar considering it a version of the word of God and abandoning all prejudices, attain eternal salvation as well as freedom from apprehensiveness and worry of this mundane earth."

But since he could not do the whole job alone, he wanted the scholars to take up this task. One of the valuable Sanskrit works named Yogavasishtha was translated into Persian under his guidance. According to the introduction, Dara Shukoh once saw Vashishtha

was short and ambiguous (or cryptic) ... I wondered as to how in India, the manifester of Divine Unity, there has been much talk about the Unity of God and what was the cause (or causes) behind the fact that neither the materialistic nor the divine doctors (pandits) of ancient India ever refused to acknowledge the unity of Godhood (waḥdat), nor did any of them dispute this with the monotheists (believers in Tauḥid), rather they considered Divine Unity as a settled fact. Reverse is the attitude of the ignoramuses of this age who style themselves as 'ulama (religious authority), and entering into pretentious arguments with the godly persons and monotheists, torment them, declaring them as infidel. Furthermore, they rescind the entire wording of the praiseworthy Quran and the authentic sayings (ḥadith) of the Prophet regarding the unity of God setting themselves thus as brigands in the way of God."

"After the investigation of these facts it became clear that four heavenly books namely Rigveda, Yajurveda Samaveda and Atharvaveda were revealed to the prophets of that time before every other revelation. The greatest of these prophets was Brahma who was (no other than) Adam Safiullah (the Pure or chosen one of God). The Vedas were comprehensive revelations containing all the commandments."

"It is evident from the Great Quran that no nation could remain without a heavenly book and prophet. It says, we do not punish (the sinners) unless and until we have sent a prophet (to admonish them) ... It follows that there has never been a community or people without a prophet established amidst them —."

"These four books, which contain all the secrets of Divine unity, are abridged in the Upanishads ."

"Since I am essentially the seeker of the element of monotheism, and no linguister dabbling in the (philology of) Arabic, Syriac Hebrew and Sanskrit languages, I desired that I should translate — these Upanishads, which are the treasure of Divine Unity — into Persian and understand why these people (monotheists) of the Upanishads are segregated from the Muslims and what is the mystery behind this?"

Besides Diwān, Dara Shukoh is the author of Safinatul-Awliya, Sakinatul-Awliya, Risala-e-Makātib, Ṭariqatul—Ḥaqiqat, Bayaz-e-Dara Shukoh and Goshti Baba Lal Dayal. One of the treatises, which has been recently discovered by me, is named Suwal-u-Jawab-i-Dara Shukoh and Fatḥ 'Ali Qalandar (Questions and Answers of Dara Shukoh and Fatḥ 'Ali Qalandar). The only manuscript of this treatise exists in the Zamin Ali Library, Shahganj, Agra,. Answering one of the questions of Dara Shukoh, Ḥazrat Shah Fatḥ Qalandar quotes a Hindi line from Kabir:

کبیرا بلی جائیے وہ پرش کے جو من ھی مسجد جاے

(O Kabir I am willing to die for the sake of the man who worships in the temple of his own heart.)

Dara Shukoh wanted Sanskrit works to be translated into Persian, so that Persian-knowing people, especially Muslims, may utilize them. He himself translated fifty Upanishads within six months with the name of Sirr-e-Akbar or Sirrul-Asrar. The introduction of this Persian translation is also significant, as it brings out the inner feelings of Prince Dara Shukoh. He says: [1]

"Since I had the splendid opportunity of meeting gnostics from all sects and inasmuch as I had heard from them high arguments about the unity of God, and also because I had read good many books on Taṣawwuf (mysticism) and produced some treatises on this topic and because my thirst for the limitless ocean of divine unity (Tauḥid continued to enhance every moment, it dawned on me that the ultimate solution of the problem of Divine Unity (Tauḥīd) would not be possible without basing my studies on the word of God as well as on evidence and proof of the existence of that Endless Being. Further, since (the majority of the verses in) the glorious Quran ... are ambiguous (or mysterious) ... I desired to make a survey of all the heavenly books; for ... if the points at issue be cryptic and reticent in any one of these, an elucidation might be seen in another ... Accordingly, I studied the Books of Moses (Taurait), the Gospel (Injil), the Psalms of David (Zubūr) and other revelations But, inasmuch as the statement about Divine Unity (Tauḥid) in all of them

1. Sirr-i Akbar (Chap-i Tehran, 1961) Pp. three – six.

poetry. He used to compose verses in Hindi, while in Persian he is the author of a Diwan, named Iksīr-e-A'zam. Some of his verses and quatrians may be cited here :

بهشت آنجا که مُلای نباشد   زملّا شور و غوغای نباشد
جهان خالی شود از شور ملّا   ز فتواهاش پروای نباشد
درآن شهری که ملّا خانه دارد   در آنجا هیچ دانای نباشد

Paradise is there where no Mulla resides
Where there is no argument and tumult with him.
May the world beoome free from the noise of the Mulla.
May no one pay heed to his Fatwas
In the city where a Mulla resides,
No wise man is ever found

کافر گفتی تو از پی آزارم   این حرف ترا راست همی پندارم
پستی و بلندی همه شد هموارم   من مذهب هفتاد و دو ملت دارم

To revile me thou has termed me an infidel;
I, too, consider thy talk as true.
Disgrace and glory have become alike to me —
My religion is that of the two and seventy sects.

زابلیس به بوالبشر چه انکار رسید   حق گفت حسین بر سر دار رسید
از شومی شرّ ملّایان است   با هر نبی و ولی که آزار رسید

What disavowals did Satan hurl at Adam ?
Said Husain Manūsr Hallaj 'I am the truth' and got the gallows,
Every prophet and saint, who suffered affliction and torment was due to the vicious and ignominous conduct of the Mullas.[1]

1. (Dara Shukoh) Dr. B. Hasrat, Vishvabharati, (1953). pp. 139, 146, 155.

fate so ordained that I had to leave the service of His Majesty, and was attached ... to the court of Prince Daniyal ... with the help of the souls — of the masters of this art ... such as Sūlṭan Aḥmed Siwi and of the illustrious ... ancestors and forefathers of this nonentity and particularly ... ʿSaiyid Shamsuddin Muḥammed Najafi ... this work has received the impress of completion."

Such literary activities were carried on with remarkable earnestness during the golden periods of Jahangīr and Shah Jahān, two of the greatest royal patrons of arts and letters. Innumerable poets and writers, like Ṭalib-i-Amuli and the authors of Shah Jahān Nama and Amal-Saleḥ, flourished during this period, Kami Shīrazi, 'Uvais Beg Fiṭraṭ, ...'i, Aṣlāḥi and Badi, the important poets of this period, have not been mentioned by biographers, while their diwans have been recently discovered and introduced by scholars. A distinct and welcome feature of this period is its increasing absorption of indigeneous elements.

Culturally and academically the period of Shah Jahān (1628–1658) may be called the period of Dara Shukoh, (d. 1659) one of whose achivements was to produce unity between Hinduism and Islam, through the intermingling of Sufism and Vedantism. He had been one of the great thinkers of the world, as he wished not only to bring through pantheism the two great religions of India, Hinduism and Islam, nearer each other, but also wanted to produce a spirit which may be more and more in keeping with the Indian enviroment. Sufism and Vedantism seek to synthesise the diverse faiths, while Dara Shukoh may be regarded as the highest symbol of this synthesis. He tried to bring about spiritual and national integration through inherent unity of the diverse religions. If, on the one hand, he used to like the company of Mulla Shah Badakhshāni (d. 1661/62) and Sarmad (d 1660), on the other hand, he enjoyed the company of well-known Hindu mystics, especially Baba Lal Dayal; if he studied Hinduism and Islam, he never neglected Christianity and Judaism.

Dara Shukoh was well-versed in Arabic, Persian, Sanskrit and Hindi and has left a number of valuable works in both prose and

ـه جای شکار ... از غایت رغبت شکار و نهایت رحم دلی ... برجمیع

ـوانات جاندار شکار ... بآهو اختیار فرموده که هم صیدی بـاین حسن

و زیبائی بدام آید و هم قصوری و فتوری در زندگی حیوانی راه نیابد

.. بمقتضیات صغر سن و عهد شباب بحضرت شاهزادهای برخوردار ...

ـور فرموده ... این غریب را ... معرفتی ... درین وادی بود . .

در اواخر ایام ... حسب الحکم جهان مطاع ... در ملازمت ... سلطان

... درخدمت جانورهای آن سرور منسوب بوده ... بحسب تقدیر از

ـدمت ملازمت آن سرور جدا شده در بندگی شاهزاده دانیال ... طریق

ـدمت معهود ... قرارداد ... باستعانت ارواح ... استادان این فن

... خواجه سلطان احمد سیوی و بزرگان ... سلسله آباواجداد کمترین

ـخصیص ... سید شمس الدین محمد نجفی ... بسمت اتمام پذیرفت ۰ -

"This humble writer ... Saiyid Arab Najafi ... travelle from his native place ... situated — in the vicinity ... of Balkh to the great Indian sub-continent and was blessed with the good fortune of joining ... the service of His Majesty — Jalālu'ddīn Muḥammad Akbar the crusader ... At this time His Majesty, who is between forty and fifty ... does not feel inclined to shed the blood of an animal; no, he would not inflict the least injury even on an ant, what to say of hunting ... Due to his extreme fondness for hunting, which he combines with a remarkable compassion towards all animals life, ... he chooses to track only the deer, so that he could catch in his snare such a graceful and charming game without causing any injury or disability to the animal life. This be suggested ... to the young p inces who were in the prime of their youth ... As I was — familiar with that valley (Care of animals) ... I was ... subsequently assigned the duty of ... looking after the animals — by His Majesty's decree ... which was obeyed by the whole world ... The

Mulla 'Abdul Qadir Badāyūnī, the translator of the Ramayana writes:

"The emperor commanded me to make a translation of the Ramayana, which is a superior composition to the Mahabbharata ... ... nine hundred and ninty - seven ... I finished the translation which had taken me four years. ... when I wrote at the end of it the couplet:

We have written a story, who will bring it to the Emperor?
We have burnt our soul, who will bring it to the Emperor?

It was much admired ... He commanded me to write a preface to it ... But since it was no such great recovery from my former falling out of favour ... I dissimulated" [1]

There are a number of such important introductions in non-historical sources, which should be studied in depth to have a comprehensive idea of the inner mind and vision of men like Akbar. For example, there is an introduction to the Baz Name[2] written by Saiyid ...ab Najafi, who served Akbar, Jahangīr and Prince Daniyal (1572–1604 A. D.) and was perhaps incharge of the royal stable. In the introduction the author writes about himself and presents a picture of the tender-heartedness of the emperor. He says:

فقیر ... سید عرب نجفی ... از وطن مالوف ... که در
حوالی ... بلخ ... واقع است بسواد اعظم هندوستان عبور نموده بسعادت
خدمت و ملازمت حضرت خلیفه ... جلال الدین محمد اکبر غازی ...
فایض گشت ... درین ولا که سنین عمر گرامی او در اواسط اربعین
خمسین است ... بخونریزی حیوانی حتی سرموی آزار موری اقدام نفرم

1. Muntakhab ut-Tawarikh, Vol. II, P, P 346–8, translated by G.S,A, Ranking. Baptist Mission Press, Calcutta.
2. MS. No 1958, Central Public Library, Patiala.

PART III

The Persian Literature produced in India reached its zenith in the Mughal period. Babur himself wrote prose and poetry in Turkish and Persian, while Humayūn has to his credit a complete Diwān. The Persian and Turkish Diwans of Bairan Khan have been edited by Sir Denison Ross. But I have traced a manuscript of his Persian Diwān,[1] which contains a large number of verses not included in the published Diwān. Besides, there are some quatrains which could be found neither in the manuscript nor in the published Diwān.

The reign of Akbar is the most glorious chapter in the history of Indo-Persian literature, and has been enriched by Abdur-Rahīm Khān Khānān, Abul-Faḍl and a host of other poets, writers and patrons of arts and letters. With the stabilization of the empire, Akbar earnestly tried to introduce Sanskrit traditions into Persian language. The two great epics, Mahabharata and Ramayana, were first translated into Persian under his royal orders and guidance. There are more than twenty versions of the Ramayana in Persian literature. In 1587 Abul Faḍl wrote an important introduction to the Razm Nama, the Persian translation of the Mahabharata, in which he says.

"Having observed the fanatical hatred prevailing between Hindus and Muslims and convinced that it arose only from their mutual ignorance, that enlightend monarch wished to dispel the same by rendering the books of the former accessible to the latter. He selected in the first instance the Mahabharata as the most comprehensive, and that which enjoyed the highest authority, and ordered it to be translated by competent impartial men of both (communities). By this means he wished also to show to the Hindus that some of their errors and superstitions had no foundation in their ancient books, and further to convince the Muslims of their folly in alligning to the past existence of the world so short a span of time as seven thousand years."[2]

1. Ms. No. 885 State Archives, Srinagar.
2. Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum, Vol. I. p. 57.

The Lodi period has been generally considered barren from the point of literary and artistic activity. Contrary to this popular notion, however, we find that a monumental bock on Indian music was produced in this period. It is entitled Lahjat-i-Sikandar Shahi The author of this book is Ibn-i-'Umar Kabuli. In addirion to this valuable work, I have been able to trace a manuscript[1] of unknown treatise on music, written under the guidance of Qasim Kahi, (d. 1580). The author opens the introduction with the following observations :—

«اما بعد ... عرضه می دارد که بجهت گردش ... دوران
از مکان اصلی انتقال کرده در کشور دلکشای هند اکثر اوقات شباب
بمباحثهٔ علم موسیقی ... صرف می کرد ... در ملازمت فضلای کرام
... خصوصاً حضرت ارشاد پناهی میان قاسم کاهی ... دلایل نکات
می شنید ... تا اندك بهره ... ازین علم شریف ... یافته و خلاصه
آنچه درین شیوه بکمینه رسیده مختصری تالیف کردی».

"And now ... I submit that the vicissitudes of life brought me from my native place to the delightful land of Hindustan. Here in my youth I used to spend hours at the feet of learned men ... discussing problems of music ... and I specially benefitted from the discourses of the great master Maulana Qasim Kahi ... who dealt with many subtle points ... of this branch of knowledge. so that I could acquire some degree of proficiency ... in this sublime art. And in this book I have briefly concluded all that I know about music"

Apart from these works, we come across a number of other books original as well as translated dealing with music. For example, there is the Ghunyat ul-Munya. Among the translations, mention may be made of Prijataka and Rāg Darpan. Tānsen has been credited with the authorship of a book on music entitled Budh Parkash, which is in Hindi. While the original work has been apparently lost to us, its Persian translation is fortunately extant

1. MS. No. 2655, Jāme Kabīr Collection, Public Library, Bursa (Turkey).

۶ - رخت را در صفت مه می توان گفت - ۷ - دوش ز عکس عارضت قرص قمر بتاب شد - ۸ - ای داغ کش دل جوانان ه ۹ - سجده که می کنند سوی بارگاه شاه - ۱۰ - از ما چه دیده ای که چنین زود می روی - ۱۱ - نخاست از صدف حسن گوهری چو توئی - ۱۲ - از شمع رخت یك شب گر پرده براندازی - ۱۳ - بیا که بر همه خوبان شهر شاه توئی - ۱٤ - ای سرو نو رسیده خه از کجا رسیدی - ۱۵ - کجائی ای مراد زندگانی -

FRAGMENTS

۱ - جماعتی بعرب باده نوش می کردند - ۲ - خواجه برخیز یکدم از سرچاه -

QUATRAINS

۱ - شاهی که مه آسمان اوگیرد - ۲ - ای دل در حق زایله نتوان کردن - ۳ - شاهنشه عشق چون که درکار آید - ٤ - ای رسم کفت جو بحر گوهر بخشد - ۵ - خواهم ز خدایت ای شه بنده نواز - ۶ - چون شاه کند لشکر اقلیم کشای - ۷ - درسایهٔ هر درخت کان خالی خاست - ۸ - از عدل تو ای شهنشه دین پرور - ۹ - شاها کف تو ابرشده تیغ چو برق -

The value of the Bhopal MS. is further enhanced by the fact that it is the first to record in complete form the following quatrain, which has appeared incomplete in the published Diwān :—

زلف تو که کار بنده نکشاید[1] ازو ० چون دیده و دل مرا همی باید ازو
جان می دهدم هم بیهای اوّل ० بفروش[2] که بوی مشك می آید ازو

1. Published Diwān : بکشاید
2. Published Diwān. : نفروش

Next to Amīr Khusrau comes Khwaja Amīr Nizam'uddīn Ḥasan Sijzi known as the Sa'di of India. The published Diwān of Ḥasan Sijzi is based upon a number of valuable manuscripts. Besides, there are quite a few other precious manuscripts of his Diwān. One, of Majlis-i-Shura-i-Milli, Tehran was transcribed by Maulana Jafar Tabrizi Bayasanghari. (d. between 1456 – 58) the pupil of Mīr 'Ali Tabrizi (d. 1446—47). The other valuable manuscript which is richly illuminated and illustrated, belongs to the Topkapi Sarayi Museum.[1]

I came across the most interesting but defective manuscript of his Diwān in the Maulana Azad Central Library, Bhopal.[2] At the end of the qasidas, with which the manuscript begins, there is a note saying that it was transcribed by Mirza Maqṣūd Hirati on the 9th Rajab. 700 A. H. (1301) This note does not appear to be in the handwritting of the scribe.

Ḥasan Sijzi died in 1337 – 8 It, therefore, follows that this manuscript was transcribed thirty eight years before the poet's death. But Mahdi Bayani, the author of the Aḥwal - u-Athar - i - Khushnawisan, on the authority of Aīn-i- Akbari, has referred to Maqṣūd -i-Harawi as a courtier of Emperor Humayūn. Thus, the date of the transcription of the above mentioned manuscript seems to be in the first half of the 16th century A. D.

However, the following ghazals, fragments and quatrains in the Bhopal manuscript are missing from the published Diwān,[3] :—

GHAZALS

۱ - ای خم زلف تو سرتا سربلا - ۲ - این منم یارب که خوش دریافتم مقصود را - ۳ - ای که قدش طعنه زده سرو چمن را - ٤ - زهی روی چو ماه و شکل مرغوب - ٥ - قرب و لقا که مشرب اهل سعادت است -

1. MS. No. R. 961,
2. No. 59 Farsi Adab.
3. Diwān-i-Hasan Sijzi Dehlavi, Maktaba-i-Ibrahimia Mashin Press, Hyderabad, Deccan, 1933/34,

composed by Ḥayati Gilāni. Ḥayati Kashi was in no way connected with the Mughal court, nor was he a contemporary of Akbar and Jahangīr, while Ḥayati Gilāni was intimately attached to the Mughal Court. This conclusively proves that Ḥayati Gilani was the author of the supplement. Most of the biographers have also confirmed it.

From the following prose lines of the Allahabad manuscript it appears that the incomplete Tughlaqnama had ended with the four couplets, which are not found in the printed text.

«گذارش گفتار در تهمت نمودن سخن سازان بدگمان ... که
رگشتن ملك تغلق غازی از برابر غنیم و منزل چند واپس نشستن نبوده
کر در ساختن با دشمن و با سراسیمگی و دل بباد دادگی، چنانچه
ز مضمون این سه چهار بیت تغلق نامه امیر خسرو مفهوم میگردد که
خرین داستان نا تمام این کتاب است :—

چو بر غازی ملك شد روشن این حال
بحیله رای شان را کرد پامال
بتدبیر سره در قلب کوشید
اگرچه قلب لشکر زان بجوشید
دو منزل باز گشت از رفتن پیش
همه کس بد خیال او نیکی اندیش
گمان این شد بدلهای پریشان
که یا ترسید و یا شد یار ایشان»

I was also fortunate to have discovered the oldest manuscript of Diwān-i-Amīr Khusrau dated 1419 A. D. in the Public Library of Bursa, Turkey.

yaki. But the greatest Persian poet of India, who flourished dur- g this period and adorned the courts of seven Kings, is Ḥazrat mīr Khusrau entitled Ṭuṭiy-i-Hind (d. 1325). His works enjoyed de popularity during the later Timurid period. A number of ustrated manuscripts of his mathnawis found in the great libraries d museums of the world belong to the Hirat School and were doubtedly transcribed and illustrated by the best calligraphists d painters of the age including Ṣulṭān 'Ali Mashhadi (d. 1514) d Behzād (d. 1537).

Tughlaqnama is the last poetical work and one of the historical thnawis of Amīr Khusrau. It was found incomplete and defective d was later supplemented by Ḥayati during the Mughal period. But there were two Ḥayatis, Ḥayati Gilāni and Ḥayati Kashi, the biogra- ers and writers have confused one with the other in regard to the real thorship of this supplement.

Tughlaqnama was composed at the instance of Ṣulṭān hayath'uddīn Tughlaq (1320—25). It consisted of about 3000 uplets and dealt with the murder of Quṭb'uddin Mubarakshah [1316–), a few months of Khusrau Khan's rule (1320) and the accession of hayath'uddīn Tughlaq. During the reign of Emperor Akbar the royal brary contained a manuscript of the Tughlaqnama which was defective d incomplete from both sides, while the complete manuscript was ailable with Raja 'Ali Khan Farūqi, the ruler of Khandesh. It ems that the Mughal court could not get a complete copy of s mathnavi. So Emperor Jahangīr ordered his court poets to apply eir poetic talent to complete the mathnavi. Ḥayati's composition won much admiration of the emperor that he got him weighed against old and silver.

The Majlis-i-Makhṭuṭat-i-Farsi, Hyderabad, published the riginal but incomplete Tughlaqnama along with Ḥayati's supplement in 933. But recently I have come across a manuscript of Diwān-i-Ḥayati hich is to be found in the Allahabad Museum.[1] It contains the supple- ent also, which is very different from the printed one. Moreover, S. ashmi Faridabadi, who edited the published mathnavi has ascribed the pplement to Ḥayati Kashi, whereas according to my assessment it was

1. MS. No 168.

بیم خواستن و یافتن چه فخر کنی

تفاخر آزا .. کو را مکارم است وسخاست

تو هرچه یافته ای من ندانم ار دانم

که نظم و نثر تو یکسر معلّل است و خطاست

Amīr Muizzi (d. about 1126) has praised Mas'ūd Sa'd Salmān in the following fragment :—

شریف خاطر مسعود سلمان را

While the latter has paid back the compliment with these hitherto unknown lines :—

اگر ندیدی بنظم بدیع مرجان را ◦ که آن غذا شده مرطبع را و مرجان را

شعر امیر معزّی وحید اهل سخن ◦ نگه کن و بتر از وی سخن بسنج آزا

عجب نظمش نشناخت نظم لولو را ◦ غریب وزنش ننهاد وزن مرجان را

بماند خیره در وطبع رجان و دو غم و رنج ◦ بماند طبع غمی را و جان رنجان را

مزاج خاطر بادش قوی که خاطر او ◦ ضعیف کرد بقوت قوی مرا جان را

From among his published qaṣidas, the following qaṣida has been specially selected for its artistic beauty. For while reciting its lines our lips do not touch each other :—

ای آذر تو یافته از غالیه چادر

In the printed copy of the Dīwān بافته has been substituted for یافته which does not seem correct. Besides, it shows that the editor and the scribes have not discovered the rhetoric device employed in this qaṣīda.

Other Indian poets, whose compositions have been included in this bayāz are Sirāj'uddin Sistāni or Khurasāni and Amin'uddin

صفات مشك مگوی و ز زلف باد مکن
اگر توانی بدانم که این قصیده تراست
جز آن قصیده که از روزگار برنایی
که کار پیر نه چون کار مردم برناست
و گر بخواسته آراسته نشد تن تو
رواست کایزد جان مرا بعلم آراست
بدان که بیخردی را درم فزون باشد
بفضل ... کی آخر برابر داناست
بهیچ حال ابو جهل چون محمد نیست
و گرچه هر دو بنسبت ز آدم و حواست
مرا ز دانشی رنج تن است و راحت جان
شناخته مثل است این که خار با خرماست
مرا به بی‌درم و بحکا چه طعنه زنی
بدان قدر که پسندست حال من بنواست
بهیچ دقنی آزار تو نه بجستم من
تونی که سوی منت سال و ماه قصد جفاست
بطبع دشمن آنی که دانشی دارد
شگفت نیست که ظلمت همیشه ضدّ ضیاست
بشعرت ار چه عطای بزرگ داد ملك
هنر نه از تست آن بارش بزرگ عطاست

مرا بسوی شما آب نیست و مرتبه نیست
سوی شما همه جاه و بزرگ آنکس راست
که شعرهاش چو تعویذ های کالبدیست
درست و راست نماینده نه درست و نه راست
بشعرهای لبیبی شما نگاه کنید
که شعرهای لبیبی چه بابت عقلاست
همیشه رغبت اهل هنر بشعر من است
بسوی اوست شمارا همیشه میل و رواست
بدستهای ریاحین کس التفات کند
ستور سر زده جائی که دستهای گیاست
مرا بگوی که یك شعر نابایسته
کز و مثل زد شاید ز گفتهاش کجاست
نه هر چه نظمی‌ای دارد ز گفته ها نیك است
ز هرچه رنگشی باشد ز جامه ها دیباست
ز مشك و زلف در آن کار بسته معنیها
چه خوشی وچه شگفتی وزان چه خواهد خاست
بنظم و نثر سخن را نهایتی باید
کزو مثل زد شاید کزین چه‌گفت و چه خواست
برین طریق بگویش که یك دو بیت بگوی
برین قیاس که من گفته ام گرش باراست

From among the first rate Indo-Persian poets, only Masûd Sa'd
nān has found the pride of place in this anthology. From among
hitherto unknown poems in a qaṣīda after the model of Labibi :-

سخن که نظم دهند آن درست باید و راست
طریق نظم درست اندرین زمانه چراست
سخن که من بنگارم بنظم اگر دگری
به نثر خوب گذارد چسار گذارد راست
ز حسن خاکی دارم ز لفظ ناقص پاك
درست و راست زبان بسته نه فزون و نه کاست
مرا سخن به بلندی سماست و معینها
از و درخشان بگوئی که آفتاب سماست
بصنعت و بمعانی و نازکی و خوشی
یکی قصیدهٔ من هم ز مایهٔ شعر است
و گر گواهی ای خواهد یکی برین دعوی
همین قصیده بدین گفت من بسنده گواست
مرا چه باید گفت این سخن که نیك افتاد
چو آفتاب دو خشان ز آسمان پیداست
بصنعت سه روان شعر من چو جان درین
بلی و آن دگر کس بسان باد رواست
ایا گروهی کین شعرها همین خوانیت
بحلق و خنجر و گوئی که زیر باد دوتاست

ز بهر فتنه چو با من جهان بکین پیوست
فرود حادثه تا خورد خون من غمخور
ز جور چون کمری بست بر میان بکشد
بسوی من ز جفاهای بیکران اشکر
چنین قصیده که من در ثنات گفتم نیست
ز گفتهٔ شعرا در قصیده ها بنگر
دروز بیت و دو بحر آفریده ام ابیات
چنانك رسم موشح بود غریب و غرر
نبوده کس ببینین جز تو لایق این مدح
که تو کریم زین خالقی و همی پرور
همی نتایج لفظت چو صیت جود تو هست
ز عزّ و جاه و جلالت بحر به بحر و ببر
مطهّرست چو نامت دلت ز غم که سزاست
سپهر هست غلامت که پیش نیست کدر
همیشه تا که بود روزگار عمر تو باد
بهرچه رای ترا کردگار داده ظفر
زبانت باد سرایندهٔ ثنای خدای
بقات باد فزایندهٔ بقای پدر
ز بهر شکر تو بادا جهان کشاده زبان
به پیش امر تو بادا زمانه بسته کمر

کف تو فرش سخن در نوشت بی دهشت
محل تو ز فلك برگذشت بی رهبر
بقای تو بجهان بر نثار کرد سعود
عدوی تو ز سعادت نیافت هیچ ثمر
چو بر جهان ز ایادی نیافتی با خود
بفضل حق همه شادی بیافتی همبر
تو آفتابی و از چرخ کی شگفت ار هست
شگفته دایمی در مهر تو چو نیلوفر
بهر زمان چو همی بگذری برین گردون
چرا برحم همی ننگری یکی بقمر
مگر که ماه بهمت که اندرو بندی
کسند بدست ز چشمت کمال با محشر
چو رفت چرخ برای تو گشت با رفعت
چو گشت ناصحت اقبال یافت زینت و فر
ایا که بخت ترا رام شد و زین حسرت
بغصه خصم تو ناکام شد بسوی سقر
تو ساز در غم دهر حرون مرا درمان
تو باش در ستم چرخ هون مرا یاور
ز جورم آن ببلا می در افگنند هردم
ز قهرم این بجگر برهمی زند خنجر

برون برد بزمانی کدورت از دلها
ز لفظ چون بزمین بر کند نثار درر
ز جود او دل خلقی شود بهر ساعت
شگفته چون گل سوی ز قطرهای مطر
صبا اگر بکف آرد نسیم خلقش را
ز نارون بدماند برون گل احمر
مهابت کرمش ریخت خون آز و نیاز
بر اختران قدمش شد مقدم و مهتر
ایا رسیده ز لطفت بهر مراد رجا
بعمر خوف نباشد ترا ز هیچ خطر
نگفته عقل که یك دل رسد بدانش تو
ندیده چشم کست یار در جهان بهتر
بدیدن تو ز جان خرمی شود پیدا
همیشه در دل تو مردمی بود مضمر
مراد تو ز فلك راست شد که گوهر تو
ز بس شرف بجهان شد مثل چو اسکندر
ز سروری بهنر کام تو شدست درست
بمهتری ز کرم نام تو شدست سمر
ز روی دست تو چون شد کشاده چشمهٔ جود
رسید بپایه قدرت بگنبد اخضر

دلم کجا بطرب بی لبت کشاید چشم
ایا همیشه بلب رشك چشمهٔ کوثر
زا رسد که دهی جان صد چو من برباد
مرا رسد که ز خاك درت کنم افسر
بدولت تو ز ایام آن رسید بمن
که روح در تنم از کار او نمود حذر
غمت ز پای در افکنند خلق عالم را
رخت دمار برآورد از بت و بتگر
رضا دهند بغمهای تو زمان و زمین
مدد کنند ستمهای تو بفتنه و شر
ستمگری تو و ما را چه بیم از ستم است
کنون که باشد ما را چو تاج دین یاور
جهان حشمت و بحر کرم خداوندی
که بر اکابر سر دفتر اوست در کشور
کریم طبعی کزو بس شرف نظیرش نیست
همیشه هست بر اهل هنر کرم گستر
ز فخر بخت ببوسد همی کف پایش
که هست افسرش تاج سر قضا و قدر
ز روی مرتبه پایش فلك همی ساید
از آنك هست ز آل علك یگانه چو خور

ز مهر من چه گریزی چو کبك از شاهین
با ندهم ز چه سوزی چو مشك بر آذر
تن مرا بجفا هجر تو گداخت چنان
که شد جدا تنم از کام و باز شد مضطر
بکین من ز چه نازی چو اشك من سوی خاك
در آتشم چه گدازی چو اندراب شکر
ایا همیشه جهان را بجور بوده نظیر
بگو چه باشد اگر یابم از لب تو نظر
بود همی بجفا مبلت و شوی واله
چو من دمی بوفا گر کند دل تو گذر
بتیر غمزه گدازی هزار دل مجروح
بعکس چهره برآری سمن ز روی حجر
تراست دل بجفا بر سوار چون شاهان
مراست دل ز وفا چون عروس در زیور
همی چه دست زنی هر زمان ببیدادی
ز من چه پای کشی و ز چه در نیازی سر
چنین بدم چه نمانی چو نیك خواه تو ام
برین غمم چه فزائی چو کاست جان و جگر
نه در قران تو دل را دهد سعادت بار
نه بی وصال تو جان یابد از سلامت بر

ز چشم تیره گریبان من شود روشن
که از هوای تو در جان من چهاست اثر
چو تیغ هجر بر آرد زمان زمان خشمت
ز ترس و بیم بر آید امان امان ز بشر
کدام تن که ز جورت نماند عاجز و خوار
کدام دل که ز هجرت نگشت زیر و زبر
مرا ز عشق جمالت چو غم رسد خواهم
هم از تو داد نباشد جز این سخن درخور
اگرچه از تو برویم رسد هزار بلا
بجان تو که نگویم بجز ترا دلبر
ز دیده خواب چو شادی بشد ز سینهٔ من
شدم اگرچه نه بودم عدیل با اختر
شبی فراز دلم کرد ناگهان پرواز
بسوخت باز طرب را بجملگی شهپر
بسا شبی که به ماندم در آتش غم تو
ز بهر بوی تو گشتم ندیم باد سحر
چو درد و اندوه و غم بی تو سر کند ز دلم
نه صبر و جان و روان ماندم نه عقل و بصر
ایا دست ز وفا بر کرانه بی تو غمی است
میانهٔ جگرم در درون ز حقد و زمر

"Muḥammad Jamālu'ddīn Samarqandi says .. that when God exalted be His might, bestowed upon me a plentiful knowledge of prosody, I thought I might have a memento thereof. To that end I composed a qaṣīda in the metre of mujtas ma<u>kh</u>bun muwashshah so that it may cover all the twenty two metres, fifteen those framed by the Arabs and seven those evolved by the Persians. Each verse was composed in one of these metres. It is an extremely rare piece of poetry, the like of which has never been written before nor will ever be. Since the exalted court of my benefactor, Taju'ddīn Muṭahhar bin Ṭahir. has very graciously bestowed upon me innumerable favours and gifts, I decided to adorn this qaṣīda with his name (to dedicate this qaṣīda to him.") The qaṣīda begins with this line :—

ابا بهار سمن بر نگار حور صبور
شراب هجر چشیدم بسی بعشق تو در
دل و تنم چو ترا از برم جهان ربود
شدم به بوتهٔ حسرت درون هبا و هدر
ز گلستان رخت تا شدم جدا زان پس
ز خار هجر کشیدم بسی عنا و ضرر
از آن زمان که جدا شد ز تیر قامت تو
به پیش تیغ بلا جان من شدست سپر
چو در هوای تو یکتا رود همی دل من
مکن چو زلف دوتا هر زمانش تافته ز
رخم ز دیده به خونابه زینتی دارد
چو درد عشق تو آتش زند مرا در بر
از آن زمان که شد این دیدهٔ من از تو جدا
بخون کنار من از هجر تو شدست شمر

A special feature of this edition is that in it the second fragment reads as follows :—

ای بزرگی که از تو دلشادم ۰ شاد گشتم که کردهٔ یادم
نامـــهٔ تو رسول تو آورد ۰ غـــم گیتی بباد بر دادم
چون خط بی خطای تو دیدم ۰ سر خود بر خط تو بنهادم
حالی از لطف تحفهٔ قلمت ۰ گره از طبع خویش بکشادم
شب تاریك هم بدست رسول ۰ بادهٔ روشنت فـــرستادم
تا توآن دوسه را نخواهی داد ۰ من بنـقد این رسول را دادم

From among the figurative qasidas, the compiler has selected a qaṣīdā of Jamālu'ddīn Aruzi Samarqandi, dedicated to Tāju'ddīn Muṭahhar bin Ṭahir which can be recited in twenty two metres and in which the figure of speech known as Tauwshiḥ has been very skilfully employed. Indeed, he claims that no other poet has composed a poem employing this art.

He even quotes the poet himself :—

« چنین گوید محمد ... جمال الدین سمـــرقندی که چون ایزد جل قدرته ... مرا از علم عروض نصیبی وافر بارزانی داشت. خواستم که ازین یادگاری بماند ـ قصیده ای گفتم ار بحر مجتث مخبون موشح چنانك بیست و دو بحر از وی بیرون آید، پانزده وضع تازیان و هفت وضع پارسیان، از هر بحر یك بیت در وی بیاوردم ... و این نوع نیك غریب است و کس نگفته است و چنین کس نخواهد گفت ... و چون مجلس عالی ولی النعم تاج الدین مطهر بن طاهر ... درحق بنده اکرامی و انعامی از روی لطف بی‌حد و اندازه می فرماید ... خواستم که این قصیده بنام وی آراسته تر گردد» (ص ۷۸) ـ

آن مردهٔ روان بشکم گرد این جهان

گه رم و نرم و باز گهی تندو بر جهان

هستند زنده در شکمش بچگان بسی

خود زنده نی و زنده بدویند زندگان

زنده است بچه در شکم مرده و چو زاد

بی هیچ زخم و رنج بمیرد هم آن زمان

The fragments quoted above are fine specimens of riddles and enigmas in Persian literature

From among the selected fragments is the following request for wine, sent by Anwari (d. about 588/1192) to Shahab Muayyad :—

قاصد خویش را فرستادم ٭ بتو مهتر پیامکی دادم

سه حریفند میهمان رهی ٭ که بدیدار هر سه دلشادم

گر فرستی صراحی باده ٭ بیقین دان که هر سه را کاوم

The latter complying with his wishes acknowledged his letter in these lines :—

ای کریمی که از تو دلشادم ٭ شاد گشتم که کرده ای یادم

تا رسول تو خط تو آورد ٭ جان و دل بر خط تو بنهادم

شب تا یك هم بدست رسول ٭ بادهٔ روشنت فرستادم

تا تو آن هر سه را بخواهی کاو ٭ من بنقد این رسول را کاوم

In the published Kulliyāt-i-Nazm-i Anwari[1] both the fragments have been attributed to Anwari, under the title "Mutafarriqāt-i-Anwari".

1. Maṭba Nawalkishore, Kanpur, 1891.

Moreover, it contains the following hitherto unknown riddles and enigmas of Daqīqi, 'Asjudi (d. 1040/41), 'Unṣuri (961–1039/40) and Farrukhi (1134/35) :—

DAQIQI

بگوئی تا چه چیز است ای برادر ◦ بسی دیده تموز و تیر و آذر
ز باب و ما درست اصلش و لیکن ◦ نزاید بچـه او چون باب و مادر
گهی چون مرد باشد گاه چون زن ◦ گهی دستار دارد گاه چادر
اگر در آب و آتش جاش سازی ◦ نه آبش بشکند نی سوزد آذر
بجز در آب و آتش هر کجا هست ◦ بهر شکلی برآید تیز بنگر

ASJUDI

دمنده اژدهائی چه بود آن ◦ خر و شان و بی آرام و زمین در
شکم مالان بهامون برهمی شد ◦ شده هامون بزیر او مقعر
گرفته دامن خاور بدنبال ◦ نهاده برکران باختر سر
بباران بهاری گشته فربه ◦ بگرمای خزیران گشته لاغر
ازو زادست هرچه اندر جهانست ◦ ز هرچه اندر جهانست او جوان تر
فراوان جانور دیدم ز هرجنس ◦ ازو زاده و مانده در مجاور
سنان مانده رو بر زنده پیلی ◦ بپرواز اندر از معبر بمعبر
به پیش بحر و بر بُرد و لیکن ◦ همـه اندر شکم او ... زند پر

UNṢURI

از صفات حرام لفظی را ◦ باز گردان و بس مصحّف کن
چون بدانی که آن مصحف چیست ◦ ضد او گیر و نقش بر کف کن
بودنی دال پیش او دیگار ◦ عرب اندر عجم مؤلّف کن

ای ذات منزه تو از عیب بری ◦ بیرون ز هزار پرده در پرده دری
در پرده هزار معصیت هست ترا ◦ این شده ام ز فضلت از پرده دری

The following quatrain is also quite rare :–

ای یار عنا شخص ترا فرسوده ◦ چندین چه خوری غم جهان بیهوده
آسائش خود ز رنج بسیار مجوی ◦ کز رنج تو دیگری شود آسوده

Swami Govinda Tiratha,[1] in the Index of known quatrains with reference to a manuscript has given only its first line, and that also reads differently in this way —

ای یار عنا شخص ترا فرسوده

Besides, it contains the following ghazal of Nizami (1140–1203), which could not be traced in his published works :–

تا کی دل مسکینم از هجر حزین باشد ◦ زارم ز غمان کشتی معشوق چنین باشد
گه دیده زنان آیم گه جامه دران باشم ◦ از ناز همی گوئی عاشق به ازین باشد
جان رفت مرا از غم تن نیز کنم قربان ◦ باشد که همه رایت ای دوست چنین باشد
تو قدر وصال ما دانم که نمی دانی ◦ لیکن تو طلب می کن کار تو همین باشد
چون دل ملکیت ای دوست نمی سوزد ◦ شاید من مسکین را این روز پسین باشد
من وصل نمی جویم آورده بزهد خود ◦ گوید که بدین خوبی کی خلد برین باشد
دادی تو مرا وعده گفتی که هلا فردا ◦ گفتم که ترا وعده بسیار چنین باشد
بس گفت مرا در گوش مرزان توام خاموش ◦ پنداشت که عاشق را آرام درین باشد
برداشت نقاب از رخ گفتار چو منی داری ◦ گفتم تو چوئی هرگز بر روی زمین باشد

1. The Nectar of Grace 1941 p. 333

Amidu'ddīn Loyaki, Naṣiru'ddīn Adīb, Ziau'ddīn Abdur-Rafi bin Abu'l Fath Harawi, Latīfu'ddīn Zaki Maraghni, Naṣru'llah Ghaznavi, Nizāmu'ddīn Kātib.

The special feature of this anthology is that its compiler has mentioned the following poets whose names could not be traced in any of the tazkiras :—

Abu Said Bakharzi, Aḥmad Manshūrī Israngāni, At laha Amīr Saifu'ddin, Awhad Ṭaliqani, Burhān Samarqandi, Taju'ddin Khatīb Jajurmi, Jalālu'ddīn Fayūnı, Jamālu'ddīn Shaniqi, Jamālu'ddīn 'Aruzi Samarqandi, Hubabi, Ḥusāmu'ddīn Nabirah, Ḥāmid Simkash, Khwaja Abduh Hakīm Khiyali, Rashid Kātib Zainu'ddīn Qudbi, Sā'di Razi, Ustād Sa'd Kani, Saidu'ddin al-Muṭayyab Samarqandi, Said Yabi, Saīd Bukharushi, Said 'Usmāni, Shahgar Samarqandi, Sharafu'ddīn Khatāli, Shahābu'ddīn Adīb, Shahāb Nasafi, Said Masūd, Sadrush - Shariat, 'Alāu'ddin Zargar, 'Alvi Nasafi 'Ala Ziyarkari, 'Ali Shah, Saiyid Imād-u'ddīn, Ghawwās Gunbadi, Fakhr Alami Kamālu'ddin Qarshi, Muḥammad Samak, Muḥyi Dehqāni, Manṣūr Sarmimi, Naṣru'llah Ghaznavi, Nizāmu'ddin Darmandi, Nizāmu'ddīn Kātib, Nizāmu'ddīn Jundi, Wartiji.

The compiler has divided his selections form-wise into qasidas, ghazals, quatrains and fragments. He has further sub-divided them according to their contents. The most significant feature of the bayāz is that it contains innumerable poetic compositions and verses, which would otherwise have been lost to us, It contains the qasidas, ghazals, quatrains and fragments of some of the most renowned Persian poets including Masūd Sa'd Salmān. These compositions could not be traced in any of the published works. For example, it contains the following hitherto unknown moral and didactic quatrains of 'Umar Khayyām :—

بشنو سخنی که جز سرانجام تو نیست ٭ مرغیست مراد دل که در دام تو نیست
گر کرهٔ توسن فلک رام تو نیست ٭ دلتنگ مکن که این در ایام تو نیست

گر چرخ ترا خدمتی پیوند کند ٭ مپذیر ازو که آخرت بست کند
بگذار جهان را که ترا مست کند ٭ در گردن معشوق دگر دست کند

ای جان دل ریش بر جهان بیش منه ٭ وی کاه ضعیف کوه بر خویش منه
کوته تر ازانست که پنداری عمر ٭ چندین عمل دراز در پیش منه

I drank deep of that spring of wisdom -- once he dropped a hint -- that there could not be anything more conducive for mental recreation than poetical compositions for a study of the facts of metaphysics and a survey of the subtleties of other people's work. Thereby he implied that I might apply my mind to the compilation of an anthology of choice verses, the like of which has not been collected by any other scholar nor picked up by any other savant, because it is wearisome and boring to pore over varied calligraphies and different volumes ... In compliance with his wishes I have prepared this collection by drawing upon the springs of charming verses and a variety of works of great poets .. you would say that every qaṣīdā of this anthology is a bag of sugar ... to provide the syrup of diversion -- to the majestic assembly of the illustrious benefactor. The qasidas are divided into four catagories -- the quatrains are spread over eight chapters and miscellaneous fragments are divided in ten parts --- As fluency is to be observed in ghazals ... these are abridged in one part...If all the seventy-six chapters were to be dealt with here it would result in unnecessary redundance."

It begins with a list of poets, from whose diwans selections have been made. The names of the following poets have been mentioned in it :- Athiru'ddīn Akhsikati Azraqi, Anwari, Adīb Ṣābir, Abu'l-ula, Awhadi, Asad Shehāb, Abu'l-Futūḥ, Ajwal Qarshi Burhān-i-Islām, Afḍalu'ddīn, Ashrafi Samarqandi, Bahāu'ddīn Marghistāni, Badru'ddīn Faraḥi, Ḥamīdu'ddīn, Ḥasan Ghaznavi, Khāqāni, Dehqāni 'Ali Shaṭranji, Daqīqi Raziu'ddīn Nishāpuri, Rashīdi Samarqandi, Rashīd Watwat, Jalālu'ddīn Rūmi, Zaki Kāshghari, Sulṭān 'Alāu'ddīn Khwārazm Altāz, Sanāī, Suzāni, Sā'di, Ṣaifu'ddīn Isfarangi, Sadīd Awars Shamsu'ddīn Khala. Shamsu'l-Maali Qabūs, Shāhid Balkhi, Shamsu'ddīn Tabari, Zahīru'ddin Sajzi, 'Unsuri, Abdu'l-Wāse Jabali, Imādi Ghaznavi, Izzu'ddīn Shirwani, Asjadi, Attar, 'Abdu'r Razzaq Iṣfahāni, 'Atīqi Tabrizi, Isma'il Warraq, 'Umar Khayyam, Futūḥi, Fakhru'ddīn Razi, Fakhru'ddīn Mubārak Shah, Fakhru'ddīn Khālidi, Ḥusām Nasafi, Qatran Tabrizi, Labibi, Majd Hamgar, Maḥmūd Warraq, Manjik Tirmizi, Mujir, Mukhtār Ghaznavi, Masūd Sad Salmān, Manuchehri, Damghani, Muizzi, Minuchehr Shast Galla, Naṣiru'ddīn Adīb, Nizāmi, Naṣir Khusrau, Naṣīru'ddīn Adīb, Humām, Humām Zaki Maraghi, Sirāju'ddīn Sistani, Sharafu'ddīn Muḥammad Faḍlu'llah Shafrawah,

زبدة الحکماء ... سیدالاشراف ... عین الامرا ... معین الدوله ... مجدالملة
و الدین شمس الاسلام و المسلمین انیس الملوك و الخواقین ... را دریافتم
و مدتی از آن گنج حکمت اقتباس می گرفت ... اشارت فرمود ... که
از مطالعهٔ حقایق معقولات و نظر دقایق محصولات مرتفرج دل را ملایم
تر از سخن منظوم نیست - باید که تالیف سازی و از اشعار مختاری
مجموعه ای پردازی که مانند آن فاضلی فراهم نیاورده باشد و کاملی
جمع نکرده، که خطوط مختلفهٔ مجلدات متفاوته ملالتی می آرد و طبع را
کلالتی می افزاید - بحکم اشارت این مجموعه که ... دست انتخاب و
اختیار از عیون لطایف اشعار و متون دواوین کبار برگزیده ... گوئی
هر قصیده ازین مجموعه تنگ شکر است ... تا مجلس رفیع مولوی اجلی
.... را شرهت سلوت پیش آرند ... قصائد بر چهار اصل نهاده شد
.... رباعیات بر هشت باب ... اقسام مقطعات بعشرهٔ کامله .... بجهت
آنکه در غزلیات سلامت نگاه باید داشت .... بر یك قسم اختصار
کرده شد .... اگر تمامی هفتاد و شش فصل را درینجا یاد کرده
شدی فصول دراز کشیدی» -

"Muhammad bin Yaghmūr writes; The vicissitudes of life and the misfortunes of time brought this weak creature (the writer of these lines) to Tirmiz — the metropolis of great men ... in such a wretched condition that I had neither a knot (pearlstring) in the turban of happiness nor any cash in the purse of patience ... By a happy coincidence I attained the good fortune of reaching the exalted assembly of the model of sublimity and dignity .. the cream of wise men — the chief of the nobles .. the lord of magnates .. the support of the kingdom ... the glory of religion and faith, the sun of Islam and Muslims, the companion of Kings and monarchs. For a time

PART II

It will be convenient to divide the history of Indo-Persian literature into two distinct periods – the Pre-Mughal period and the Mughal period. The Pre-Mughal period may be further sub-divided into Pre-Delhi Sulṭanat and Delhi Sulṭanat. Saiyid 'Ali Huj-weri known as Dāta Ganj Ba<u>kh</u>s<u>h</u> (d. 1072/3) flourished during the Pre-Delhi Sulṭanat period, while his Kas<u>h</u>fu'l Maḥjūb is an exquisite exposition of Sufistic doctrines and may rightly be called the first major prose work in Persian and the first mystic work in Indo-Persian liter-ature. Among the great poets of this period were Nukati (d. after 1099) and Abu'l Faraj Rūni. But Masūd Sa'd Salmān (d. 1121/22) has been regarded the greatest and most eminent poet of this period.

I have recently come across the manuscript of a valuable Per-sian bayāz[1] , (anthology), which may throw a flood of light on the history of early Persian literature. It will not only introduce to us a number of poets who have been thrown into oblivion, but may also bring to light some of the hitherto unpublished compositions of some of the most celebrated Persian poets of Iran and India. This bayāz (anthology) compiled at Tirmiz by Muḥammad bin Yaghmūr was transcribed some time during the period intervening between Sā'di (d. 1292/95) and Ḥafiz (d. 1388/89). The manuscript is in beauti-ful and bold nas<u>kh</u>. Unfortunately it is defective in the beginning as well as at the end, and some of its folios are also missing from the middle. However, it would be worth - while to quote a few lines from its introduction :—

'چنیر گوید ... محمد بن یغمور که ... حوادث روزگار و نوایب
لیل و نهار این ضعیف را بخطهٔ مدینة الرجال ترمذ ... رسانید ... در چنین
حال نه در دستارچهٔ خرسندی نقدی بود و نه در کیسهٔ شکیبائی نقدی
... از اتفاقات حسنه سعادت خدمت مجلس عالی قدوهٔ مجد و معالی ...

1. MS. No. 183, Govt. Oriental MSS. Library, Madras.

the King of Tiham and his son, Kishwar Kusha, and his minister, the King of Kashmir, the King of Ceylone and his daughter, Mulk Ārā, Samanbar and Gulzār, the King of Qannauj and a sage.

Among other Persian works written in India and treating of indigenous stories are the Basātinu'l-Uns, Ṭūtī Nāmah, Chandayāna, 'Ismat Nāmah, Lila-u-chaniser, Dilfarīb, Sūz-u-Gudāz, Bahār-i-Dānish, Nuql-u-Sehba, Madhawanala and Kamakandala, Mika-u-Manohar, Nairang-i-'Ishq, Gul-i-Bakā'ulī, 'Ajāibu'l-Qiṣaṣ, Taṣwīr-i-Maḥabbat, Qissah-i-Sit-Basant, Mahyār-u-Chander-badan, Ḥikāyat-i-Nānakshāh, Darwish-u-Bādshāh, Sirāju't-Ṭarīq, Padmāvat-u-Manohar, Padmāvat-u-Saifu'l-Mulūk, Laddhā Faqīr Mahrū-u-Abdul-Aziz, Narsi Brahman, Gulshan-i-Ḥusn, Ḥikāyat-i-Kāshī Nāth Chitr-u-Kiran, Rāni Chandar Kiran, Baḥr-i-Wiṣāl and Himal-u-Naqrai,

In addition to the above mentioned works of fiction, there are twelve versions of Padmāvat, nine versions of Singhāsanbattīsī, twenty-two versions of Hīr-u-Rānjhā, seven versions of Kāmrūp-u-Kāmlatā, fifteen versions of Sassī-u-Punnū, three versions ot Manohar-u-Madhūmālati, two versions of Mirzā-u-Ṣāḥiban and three versions of Sohnī-u-Mahiwal in Indo-Persian liturature.

* * * * * *

Dr. 'Abdullāh has mentioned the name of Faiḍī (1547-1595/94) as one of the probable translators of the Kathāsaritsāgara, which does not seem to be credible.

"Another equally important work is Bluhar and Yuzasaf or Barlaam and Josaph or Josaphat, a Buddhist story, which went from India to Iran in the sixth or seventh century A. D. and was probably translated into Pahlavi. Later, it was translated into Syriac, Hebrew, Arabic, Ethiopiac, Greek, Latin and other languages. Prof Bapat says, "Barlaam in the story is Bhagawan and Josaph or Judasaph or Budasaph is Bodhisattva of the Budhists. They are even cannonised as saints and 7th November is observed as a day in their honour. No one seems to have taken the trouble to inquire who Barlaam and Josaph were. There are two Arabic versions which are free from every Christian dogma. One of these appears to be directly taken from Pahlavi. The other was printed in Safdarin Printing Press in Bombay. In this book, besides, the main story, there is a large number of parables which are taken directly from Indian sources".[1]

It was translated into Persian by Mullā Muḥammad Bāqir Majlisī (d 1698/9) and forms a part of his book, 'Ainu'l - Hayāt. Recently I have come across a versified Persian version of this story written in India. S. Najaf 'Alī Faizabadi, teacher of Mīr Anīs (1802 - 1874), a great Urdu poet, had been perhaps, in the service of Jawāhir 'Alī Khān, the Household Secretary of Bahu Begum, the wife of Nawwāb Shujā'u'd - Dawlah of Oudh(1753 – 1775). He has versified the prose version of Mullā Muḥammad Bāqir Majlisī in 1675 completed under the name of Naẓm-i-Jawāhir The only MS. copy of this Mathnawī and other treatises by the same author are with Mr. Khurshīd Anwār, an advocate of Ranchi.

During my visit to Turkey I discovered the Manuscript of a hitherto unknown Mathnawī entitled Jalīsu'l - Mushtāq, composed by a poet named 'Alī and dedicated to Amīr Shīranshāh. It is a collection of the tales featuring such characters as a Chinese emperor, an ascetic,

1. India's Cultural Contacts with other countries and the Role of Buddhism in Establishing the same. (Delhi University 1959) p. 9.

"That very day an order was issued that I shall translate and complete the remainder of these Hiudu tales, part of which had been translated by the command of Zainu'l 'Abidīn, King of Kashmir, and named the Baḥru'l Asmār, of which the greater part had been left untranslated. I was entrusted to finish the last volume of that book, which was of the thickness of sixty juz in the course of five months. At this time also one night he called into his private bed-chamber to the foot of the bed, and till the morning asked for stories out of each chapter and then said, 'Since the first volume of the Baḥru'l Asmār, which Sulṭān Zainu'l Abidīn had translated, is in Arabic Persian and difficult to understand do you translate it afresh into ordinary language and take care of the rough copy of the book, which you have translated.' I performed the Zamīnbose and heartily undertook the commission. I began to work and after showing me a great deal of favour he presented me with 10,000 tankas in small change, and a horse. If God (He is exalted) will, I hope to have this book finished in the course of the next two or three months, and that it will obtain me leave to go to my native country (which is the grave)"[1]

Badā'ūnī has not mentioned 'Abbāsī, nor has the latter mentioned the former in regard to this Persian version, though both were assigned by the same emperor. However, a number of points may emerge from the statements of 'Abbāsī and Badā'ūnī. It seems that the original name of the Kashmir version was Baḥru'l - Asmār. While Badā'ūnī did not change the original name, 'Abbāsī Persianised the name also by calling it Daryā-i-Asmār. Besides, according to Badā'ūnī, the Kashmir version was incomplete and the emperor had asked him to revise as well as supplement the incomplete translation. On the other hand, 'Abbāsī mentioning the defect of the style and language has not mentioned anything to show that the Kashmir version was not complete. However, since the extant MS., is not complete, it may be presumed that he had revised the incomplete copy. It may be that 'Abbāsī was assigned the task of revising, while Badā'ūnī was entrusted with the job of supplementing as well as revising the incomplete Kashmir version.

---

1. Muntakhabu't - Tawārīkh (Vol. II, p. 15 - 16) translated by Lowe.

زما را باو ترجمه می فرمائیم بسیار خوب و خاطر خواه ما می نویسد،
خواهیم که از ما جدا باشد - شیخ و دیگران تصدیق نمودند -
مان روز حکم شد که بقیهٔ افسانهٔ هندی را که بفرمودهٔ سلطان
ن العابدین پادشاه کشمیر بعضی از آن ترجمه شده و بحرالاسمار نام نهاده
ت و اکثری مانده، ترجمه کرده تمام سازد و جلد اخیر آن کتاب را
بضخامت شصت جزو است در مدت پنج ماه با تمام رساند - و مقارن
ین احوال شبی در خوابگاه خاصه نزدیك بپایهٔ تخت طلبیده تا بامدار
حکایات از هرباب پرسیده حکم فرمودند که چون جلد اول بحرالاسمار که
لطان زین العابدین ترجمه فرموده، فارسی قدیم غیر متعارف است،
رام تو از سر نو بعبارتی مانوس بنویس و مسودهٔ این کتاب را خود
رجمه کرده ای نگاهدار - زمین بوس نموده بدل جان قبول نمودم و شروع
در آن کردم - و بعد از التفات بسیار ده هزار تنکه مرادی انعام واسپ
خشیدند - انشاء الله این کتاب بزودی و خوبی درین دوسه ماه مرتب و
رداخته آید و رخصت وطن که هلاك آنست حاصل آید» -[1]

'Contemporaneously with these events he one day said to Abu'l Faḍl in my presence 'Although the guardianship of Ajmer suits so and so very well, yet since, whenever I give him anything to translate, he always writes what is very pleasing to me, I do not want that he should be separated from me.' The Shaikh and others confirmed His Majesty's opinion of me.

1. Muntakhabu't Tawārīkh Vol. II, pp. 401-2.

توجه دریافت خواص نیز مهجور گشته و بهر تقدیر نزد هر دو فرقه مفهوم حکایاتش محجوب شـده و غرض آمر که عبرت پذیری و تشحیذ خاطر است از آن رنیامده، کمترین جبهه سایان آستان عرش نهاد مصطفی بن خالقداد بعبارت زود فهم روشن معنی رقم زده کلك بیان سازد، و ترتیب نسخهٔ اصل را مرعی داشته آنچه زیاده از مفهوم و حکایت و محل مقصود باشد بیندازد» .

"The object of the author of any book is to communicate his ideas primarily to those who speak that language. Hence, the purer the language is, the easier it will be for the people to understand it. This would be specially so, if the book is intended for the common man. The writer should, therefore, avoid the use of words from any other language, in order to facilitate comprehension. Some writers, however, waste ink and paper by introducing Arabic words in their Persian texts The Brihatkatha was translated by some one into Persian, at the instance of Sulṭān Zainu'l 'Abidīn, the well known ruler of Kashmir. But the translator had used Arabic words indiscriminatly, rendering the text incomprehensible for the common people. Its meaning could not be easily grasped by scholars also, because of its defective style. During the stay of His Imperial Majesty at Lahore, the royal command of the Shadow of God was issued to the humblest among the worshippers of the sky-like court, Muṣṭafā bin Khāliqdād, to rewrite it in simple and fluent language. The assignment also involved the deletion of irrelevant materials, while keeping the work intact".

Beside 'Abbāsi the work of revising and supplementing the Persian translation of the Kathāsaritsāgara was assigned to Mullā 'Abdu'l Qādir Badā'ūnī, the author of Muntakhabu't-Tawārīkh, also. Badā'ūni describing the events of the year 1595 writes :—

«مقارن این احوال روزی شیخ ابو الفضل را بحضور فقیر فرمودند که اگرچه از فلانی خدمت اجمیر هم خوب می آید اما چون

'Abbāsī writing about the nature of his version says:-

«بهترین تکلم در روشن ترین مخاطبت اهل هر نفسی آن تواند بود که بیان آن بعبارتی تمام عیار و کامل ادا نمایند، علی الخصوص چون یکی از اهل لغت خواهد که معنی آن دیگری نماید ظاهر است که غرض او جز افهام سخن باهل آن لغت نخواهد بود - و در این صورت هر چند عبارت در همان لغت خالصتر، بفهم نزدیکتر، خاصه که سخن از آن قسم باشد که بجهت عموم فایده آنرا عام فهم باید نوشت - و برین تقدیر کاتب را واجب آید که عبارت را از آمیزش بلغت دیگر بطوری که موجب خستگی بستگی و دور فهمی مضمون باشد احتراز نماید، بل وظیفهٔ بلاغت را که استعارات آن نقاب چهرهٔ مقصود شود یا بدرازی کشیده ذهن سامع را از دریافت مدلول پریشان سازد بکلی متروک و مهجور فرماید - و العیاذ بالله که اغلاق سخن و پوشیدگی معنی از رهگذر ناسرگی عبارت و نادرستی عیار و نقصان ادا باشد، چنانکه بعضی ناقص دانشان بجهت فریب عامیان الفاظ عربی و پارسی درهم آورده نامنتظم ترتیب دهند و دوات و قلم را آزار داده رو سفیدی کاغذ را و هیچ گناهی بسیاهی بدل کنند - بناء علی هذا در ایام آرام رایات عالیه بدارالخلافت لاهور... مثال لازم الامتثال حضرت الٰهی شاهنشاهی ... صادر گشت که کتاب رهت کتها را که ... آنرا بنام سلطان زین العابدین مشهور حاکم کشمیر شخصی بفارسی ترجمه کرده - و لیکن چون مترجم بر قدر مقدور در امتزاج فارسی بعربی کوشیده و از فهم عوام بغایت دور افتاده و بجهت ناسرگی عبارت و نقصان عیار از

The Sulṭān's early association with seculars like Shaikh Nūru'ddīn had made him revolt against the fanatic and narrow-minded theologians. His ministry consisted of a Budhist, a Brahmin and a Muslim. Moreover, he invited all the Kashmiri Hindus living beyond Kashmir to return to their homeland and guaranteed complete religious freedom and equality for them. In addition, he not only revived Hindu pilgrimages and repaired Hindu temples, but himself went as a pilgrim to Hindu shrines and participated in Hindu festivals The Sulṭān used to study sacred Hindu books like Nilamatapurana, Yoga-Vasishtha and Gita Govinda. Besides, he used to practise Yogā and perform *havans*. He wrote treatises in Persian on fire-work and protechnics, and also a treatise named Shikāyat. As a patron of art and letters he encouraged both Hindu and Muslim scholars, and his court was enriched by musicians and artists, mystics and literary figures, like Maulānā Kabīr, Pandit Jonaraja, Mullā Jamīl, Mullā Udi Somabhatta and Rāmananda.

One of the chief contributions of Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn was the establishment of a translation bureau, through which a number of Sanskrit works were translated into Persian and vice-versa Mullā Aḥmad, the court poet of the Sulṭān, translated the Mahābhārata, Dasavatra and Rājatarangini into Persian while Shriwara began the Sanskrit translation of Jāmi's Yūsuf Zulaikha which was completed in 1505 under the name of Kathākautuka.

While much has been written on the scholarly contributions of Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn it is surprising that nobody has studied in depth a every valuable Persian translation of the Kathāsaritsāgara rendered at the instance of Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn, which perhaps, does not exist today. It is said that Mullā Aḥmad translated it into Persian, under the title of Baḥru'l - Asmār. However, later this Arabicised version was re-written in simple Persian by Muṣṭafā Khāliqdād Abbāsī, at the instance of Emperor Akbar under the name of Daryā-i-Asmār 'Abbāsī's version which was also lying in total oblivion, has been recently discovered by me, and its only MS., that too an incomplete one, is to be found in the State Central Library, Hyderabad, (MS. No. 2642 (Hist.), folios : 377, size : 11" × 6").

The earlier of these two versions as the Brihatkathāmanjarī (The Bower of the Great Stories) was rendered in 1037 by Kshamendra. It consists of 10 chapters with 7500 stanzas. The other Kashmir version, known as the Kathāsaritsāgara, containing about 22000 verses was made some time around 1081 by Somadeva. Of the two Kashmir versions, Kathāsaritasāgara is considered to be superior "in taste and style."[1] Besides, it "also contains.. a recast of the first three books of the Panchatantra which...had the same form in Somadeva's time as when they were translated into Pahlavi".[2]

The relation between the Kathāsaritsāgara and the Pahlavi version of the Panchatantra will become clear from the following words of Macdonell :—

> "The Kathāsaritsāgara also contains (Tarangas 60-64) a recast of the first three books of the Panchatantra, which books, had the same form in Somadava's time as when they were translated into Pahlavi".[3]

Besides, the two Kashmir versions of the Brihatkathā, there is also a Nepal version of its Sanskrit translations named "Brihatkathā's Lokasangraha (A Compendium of the Verses of the Brihatkathā). This version was rendered by Budhaswāmin in the 8th or 9th century but was discovered as late as in 1893 in Nepal. The incomplete MS. of this versions contains 4539 stanzas. It is, however, estimated that the original contained about 25000 stanzas. It may also be noted that this version differs considerably from its Kashmir counterparts. The Nepal versions may be nearer to the original, but the Kathāsaritsāgara is the best known of the three.

Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn ascended the throne of Kashmir in 1420 and died in 1470 He was one of the greatest Kings of Kashmir and is known as Bud Shāh the (Great King). He was a great administrator and builder, scholar and poet, and patron of art and letters. He was catholic in his approach and secular in outlook.

1. Ibid, p 124.
2. Ibid., p. 377.
3. Ibid p. 377.

Panchatantra, have discarded original names, which have been replaced by their Persian equivalents. But the original names have been used faithfully in Abbāsī translation.

Though the significance of the Panchatantra in the folk-literature of the world is now being increasingly recognized, there is another important collection of stories which has, as yet not received adequate recognition. Known as the Kathāsaritsāgara (The Ocean of Story), it still awaits the genius of a Burzoe to bring out its intrinsic worth. This task has been rendered difficult because its earliest and original version, The Brihatkathā (The Great-Story), has been lost to us. It is however, known to have about 700,000 stanzas, and was probably composed by Gunadhy in the Paishachi Prakrit during the third or fourth century It is interesting to note that the Brihatkathā and its different versions are closely related to the Panchatantra. Dāsgupta writes. "The various important recensions of the Panchatantra have been classified into four main groups, which represent diversity of tradition but all of which emanate fr m the lost original. The first is the lost Pahlavi version from which were derived the old Syriac and Arabic versions, and it was through this source that the Panchatantra, in a somewhat modified form, was introduced into the fable literature of Europe. The second is a lost North-Western recension, from which the text was incorporated into the two North-Western (Kashmirian) Sanskrit versions of Gunadhya's Brihatkathā. The third is the common lost source of the Kashmirian version entitled Tantrokhyayika, and of the two Jain versions, namely the Simplicior Text ... and the much amplified ornatior Text, called Panchakhyana. The fourth is similarly the common lost source of the Southern Panchatantra, the Nepalese version and the Bengālī Hitopadesha,"[1]

Three abridged Sanskrit translations of the Brihatkathā were now available. Two of these versions were translated in Kashmir. The Kashmir versions include a number of indigenous stories not found in the third version. It is obvious that these tales were not a part of the original work.

1. A History of Sanskrit Literature, Vol. I, pp. 88-90.

Mustafa Khāliqdād 'Abbāsī with the instruction that it should be translated, without any omission in the same order, so that the variations between the original and the various translations may became evident. So, according to the enjoining command, the first draft was translated in a plain and simple language. On hearing this translation what ever order is given by His Imperial Majesty, the Divine Caliph, with regard to omission, and addition, order of discourse, supplementing of extra chapters, philosophies, parables, stories, rare verses and other things will be carried out with the blessing of His Imperial Majesty, according to my ability and capacity."[1] It clearly shows that Akbar was not fully satisfied with Abu'l Faḍl's 'Iyār-i-Dānish, which was rendered earlier than the Persian Panchakhyāna, at the instance of Akbar himself.

It is difficult to state with certainty what Sanskrit text formed the basis of the translation in Persian. It is well known that Akbar was deeply interested in the religions and philosonhies of India. He had invited Sanskrit Pandits and Yogis to his court, as also Jain learned men. The presence of the last at the court has a bearing on the Panchatantra problems. It appears likely that the manuscript in Akbar's library was Jaina work, as is borne out by the title of 'Abbāsī's translations, Panchakhyana.

One of the distinctive features of the Panchakhyana is that it contains twentyone additional stories not found in the earlier editions of the Panchatantra. Keith writes, "A second Jain version was undertaken to please a minister, Soma, by a monk, Purmabbadra, in 1199 A. D. The work is marked by the appearance of twenty one new stories, including a famous one of the greatest animal and ingratitude of man, while from the Mahābrata hints are taken for the story of the pious and the hunter. Purnabhadra's version appears to rest in part on our Tantrakhyayika, In part on the prototype of the Simplicitor rather than on that text, and in part on some other unknown versions."[2] Besides, all the Persian translations of the

1. Panchakhyana, f. 4
2. A History of Sanskrit Literature, p. 261.

Anwār-i-Suhaylī by Khusro Daraī, Ray-u-Brahman or versified Kalīlah and Dimnah by Jalan Bakhsh Jamharī. Dr. Indu Shekhar has recently translated the Panchatantra, edited by Edgerton,[1]

Hitopadesha, is a Sanskrit version of the Panchatantra, written in Bangal by Nārāyana, who is thought to have lived between 800 and 1373 under the patronnge of Dhavadachandra. It was translated into Persian with the name of Nigār-i-Dūnish and Mufarriḥu'l-Qulūb [2]. The latter Persian version was translated into Urdu in 1802 by Bahādur 'Alī Ḥusainī with the name of Akhlāq-i-Hindi and into Dakhanī in 1764-5 by Shaikh Muḥammad Yaḥyā Badari.

However, it is surprising that none of the writers, scholars and cataloguers, so far as my knowledge goes, has mentioned a very valuable Persian translation which has remained in oblivion. A new Persian translation named Panchakhyāna of this Sanskrit work by Muṣṭafā Khāliqdād 'Abbāsī, at the instance of Emperor Akbar, has been recently discovered by me. The only manuscript copy of this translation exists in the National Museum, New Delhi.[3]

In his preface to the translation, Muṣṭafā Khāliqdād 'Abbāsī states that there were already several translations in existence. But the Persian renderings were not approved by the Emperor, for either they did not maintain the order of the stories of the original or contained variations, additions and commissions, and therefore, departed from the original, or their language and style were burdened with Arabic words and phrases. Akbar, who had already arranged for translations of a number of Sanskrit works, found in his library a Sanskrit manuscript of the Panchatantra and ordered 'Abbāsī to render it into Persian, which could be easily understood by readers.

'Abbāsī writes that when Akbar saw the original book, he felt "that since this book has been translated from language to language—naturally it has deviated from the original—so it is appropriate that the book be translated afresh, and the work was assigned to

1. University Press, Tehran, 1961.
2. Nawalkishore Press, Lucknow, 1890.
3. Ms. No. 62. 1005.

is unable to understand the content."[1] And that is why he was assigned the task of rewriting the book. But Sir Denison Ross writes, "It is a fact that Naṣrullah's text abounds in Arabic quotations, but otherwise the style and language are exceedingly simple, while Kāshifī's text furnished an example of that rhetorical hyperbole and exaggerated metaphor which, though giving such pleasure to those who enjoy linguistic gymnastics and furnishing an admirable text-book for students of Persian language, is wearisome in the extreme for those who merely wish to read the stories for their sake."[2]

Faqīr Muḥammad Goyā, Muḥammad 'Alī Khān Waḥshī and Jān Bihārī Lāl Rāzi translated the Anwār-i-Suhaylī into Urdu. These translations are known as Būstān - i - Ḥikmat, (1835) Ḍiyā - i - Ḥikmat (1885) and Arzhang-i-Rāzī (1872) respectively. Mirzā Mahdī of Gayā (1850) also translated it into Urdu. One of the translations is called Muntakhabu'l Laṭāif. In Dakhani it was translated by Muḥammad Ibrāhīm Bījāpūrī and published by Fort St. George, Madras in 1844.

Abu'l Faḍl abridged the Kalīlah and Dimnah with the name of 'Iyār-i-Dānish. He says, that he was told by Emperor Akbar that though the Anwār-i-Suhaylī is better suited to the people than the Kalīlah and Dimnah (of Naṣrullah), it is still not free from Arabic expressions and (rare) metaphors. So it should be rewritten in a simple style so that it might become more generally useful, rejecting some of the (rare) words and avoiding long winded phrases."[3] But Sir Denison Ross says, "This version (the 'Iyār-i-Dānish) has, however, never enjoyed the same popularity as the Anwār-i-Suhaylī "[4] Shaikh Ḥafīz-u'ddīn Aḥmad translated half of the 'Iyār-i-Dāmish and named it Khirad Afroz [5]

Other Persian versions of the Panchatantra are Jāwīd-i-Dānish, Akhlāq-i-Asāsī, Gulshan Ārā by Mirzā Iranpūr, Shakaristān or versified

---

1. Anwar-i-Suhaylī p. 6.
2. The Ocean of Story. Vol. V. p. xiv.
3. Iyar-i-Danish, p. 8
4. The Ocean of Story, Vol. V. p. xxv.
5. Majlis-i-Taraqqi-i-Adab, Lahore has published its critical edition.

been lost to us, while the Arabic version has been translated into forty languages, and gets the credit of making the book so widely popular. Māmūn (813—833) loved it so much that he had kept it in his treasury. The Bermecides also got it versified so that it could be easily memorized. Faḍl Ibn Sahl, before embracing Islam, had said that he enjoyed the recitation of the Qur'ān in the same measure as that of Kalilah and Dimnah.

Abu'l Faḍl Muḥammad Bal'amī (d. 940) translated Ibnu'l Muqaffa's Arabic version into Persian prose, at the instance of the Samanid King, Naṣr Ibn Aḥmad, (913—942) The same ruler asked Rudakī (d. 940-41) to versify it. The original manuscripts of these versions were illustrated by the Chinese painters. The author of the Shāhnāmah-i-Abū Manṣūrī writes :—

"So Amīr Sa'id Nasr bin Ahmad listened to its contents He took such a fancy of the book that he asked his minister, Khwaja Balami, to translate it from Arabic into Persian...After that he ordered Rudaki to render it into Persian verse. The manuscripts (of these Persian versions) were subsequently illustrated by Chinese artists."[1] Unfortunately Rudakī's version is non extant.

Later, Naṣrullah bin Muḥammad bin Abdu'l Ḥamīd Munshī translated the Arabic Kalīla wa Dimnah of Ibnu'l Muqaffa' into Persian (completed in 1144) and brought out its most popular version.

In the thirteenth century Baha'uddīn Aḥmad Ṭūsī versified the Kalīlā wa Dimnah in the Mutaqārib metre. It was dedicated to 'Izzu'ddīn Kaykāūs, who suceeeded his father Kay Khusrau, in 1244-45. It was probably composed in 1221.

Ḥusain Wā'iẓ Kāshifī (d. 1504-5) revised the prose version of Naṣrullah under the title of Anwār-i-Suhaylī (The Lights of Canopus), which became known in Europe through the translations of Eastwick (1854) and Wallaston (1877 & 1894). The author of the Anwār-i-Suhaylī after praising Naṣrullah for his book, says, "Owing to the use of queer words and lines, the reader cannot appreciate the object of the book and

---

1. Khirad - afroz, p. 40

But the credit for its wide popularity goes to Burzoe, the Iranian physician who was a courtier of the Sassanian King Khusro Anushirwān (331-379). Penzer writes, "The importance of the Pahlavī and its descendant is twofold. In the first place the Pahlavī is one of the oldest versions known, and must have been translated from a very ancient Sanskrit text agreeing closely with the first Sanskrit original. In the second place it is the descendants of this version which have become so familiar to us under such names as the Fables of Pīlpay, Kalīlah and Dimnah, Lights of Canopus, the Morall Philosaphie of Done etc."[1]

Naushīrwān ordained that some of the chapters of this book be treated as guide to those who carried on the administration of his empire; and this system continued till the end of the reign of Yazdgerd (632—651). One of the spies in reply to Hurmuz's (272—273) question said that Bahrām Chūbīn, Bahram the Javelin, (590—591) spends his leisure hours in reading this book.

This book has been translated into Pahlavi, Syriac, Hebrew, Latin, Spanish, Tibetan, Greek, English, Russian, French, Italian, Slavanic, Turkish, German, Polish, Hungarian, Hindī, Bengāli, Gujaratī, Marāthī, Brij-Bhāshā, Tamil, Telegu, Malay, Japanese, Ethiopiac, Chelha, Madurese, Paischachi Prakrit, Kaunada, Madi, Siamese, Laotic, Balanse and other languages.

Ibnu'l Muqaffa' the Arabic translator of its Pahlavi version, was put to death in 757 at the instance of the Abbasid Caliph, Mansūr (754—775). He was an Iranian and his original name was Rūzbah, while that of his father was Dazbah. It is said that he did not accept Islam sincerely, And further, he added the chapter on Burzoe to create doubts in the minds of credulous Muslims, in order to attract them to Maniism. In addition, he mentioned the principal tenets of Buddhism through Burzoe.

The Arabic version of Ibnu'l Muqaffa' called Kalīlah wa Dimnah is important, because the Pahlavi and the original Sanskrit versions have

---

1. Ibid Vol. V. p. 218.

PART I

The cultural edifice of a country is built on the bed-rock of its myths and folk-tales. The cultural traditions of Iran and India are some of the richest in the world and are linked together, not only because the two belong essentially to the same stock, but also because both have shared the same sources of sustenance. They have an invaluable treasure of folk-tales inherited from ancient times. They have not only provided nourishment to the towns and villages of Asia, but have helped in enriching the storehouse of the world. The Panchatantra is generally known as Kalīla wa Dimnah in Arabic and Persian. Karataka and Damanaka are the names of the two jackals in the first chapter. However it constitutes the most important link in this chain stretching across the time, and is a significant heritage for the peoples of the world through Iran and India. The stories of the Panchatantra are eternal and immortal, and are deep-rooted in our social order. These stories alongwith the game of chess were conveyed to Iran from India and in course of time enriched the literature of the world. It has influenced the Arabian Nights, Luqman's Fables, Siyāsatnāmah of Nizāmu'l Mulk Ṭūsī, Chahār Maqālah, Qābūs Nāmah, Marzbān Nāmah, the Mathnawī of Maulānā Jalālu'ddīn Rūmī, Gulistān, Bahāristān, Khāristān and a number of other works in the east and the west.

Edgerton says "Few books in the literature of the world have enjoyed such great popularity over so wide an area. It has penetrated practically all the literatures of Europe and Southern and Western Asia. It is known to exist in over 200 versions and translations in about 60 different languages and dialects, spreading from Java on the south-east to Iceland on the south-west."[1]

Penzer writes, "India is indeed, the home of story telling It is from here that the Persians learnt the art, and passed it on to the Arabians. From the Middle East the tales found their way to Constantinople and Venice, and finally appeared in the pages of Boccacio, Chaucer and La Fontaine. It was not until Benfey wrote his famous introduction to the Panchatantra that we began to realise what a great debt the Western tales owed to the East."[2]

1. The Panchatantra, p. 3
2. The Ocean of Story, Introduction, pp. xxxiv – xxxv.

Khuda Bakhsh Annual Lectures 1975

Khuda Bakhsh Annual Lectures
are delivered every year
by an eminent scholar of
Persian, Arabic or Islamic
Studies.

Mr. Qazi Abdul Wadood,
Dr. Md. Zubair Siddiqui,
Prof. A. A. A. Fyzee,
Dr. Nazir Ahmad
were the forerunners
in the series to which
Dr. S. A. H. Abidi
contributed in 1975.

Khuda Bakhsh Annual Lectures Series—5

NDIA'S RICH AND VALUABLE CONTRIBUTION TO PERSIAN LITERATURE IN THE LIGHT OF SOME RECENT DISCOVERIES

by

Prof. S. A. H. ABIDI

han to ponder on the Quranic vision of human conflicts a given in the verse :

> "To every one of you we have appointed a right way and open path. If Allah had willed, He would have made you one community but that He may try you in what befalls you. So push forward in good work; unto Allah shall you move back all together and He will let you know of that whereon you are at variance". *V - 48.*

indicative of divine presence. Even the seemingly inanimate stones are considered susceptible to divine influences. This means that Nature embraces the so-called inanimate layer. It is creation as a whole. Man's creation assumes a different status. The human soul is considered as coming into being when God breathes of His spirit into the human body. This means that the soul has a non-temporal dimension and it explains why the ultra-orthodox Ibn Hanbal considered the soul neither created our uncreated. In all considerations of religious questions it is necessary not to expect any final clarification. What matters is only to make man alert to an area of sensibility which cannot be fully rationalised.

Muslims have been often tempted to take a very static view of religion, and have failed to recognise that what is the straight path need not necessarily be a strait path where it is not possible to accommodate more than one perspective. Mohammad Iqbal observes: "The teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems"; and "Equipped with penetrative thought and fresh experience the world of Islam should courageously proceed to the work of reconstruction before them. This work of reconstruction, however, has a far more serious aspect than mere adjustment in modern conditions of life". (pp. 168-169). But their pre-occupation with issues which are not of capital importance have made Muslims uncompromising not only in inter-religious but also in their inter-Islamic dialogue where different sectarian positions are at issue. It is therefore necessary to find out what the minimum requirement is which entitles one to a place in the Islamic fold. And when the Quran invited the people of the Book not to stick to differences, but to come closer together on the basis of what it common to them, shall we not follow the same spirit of reconcilation and understanding ? Now the bare requirement of Islam in its metaphysical dimension is to uphold belief in the Creator who has created what he has created not in vain but with a meaning, and the belief in the mystery of *Ghaib*, the unknown and unknowable. It is the vision of man's life which does not come to a close on this planet but has a future which transcends all earthly futures.

In a pluralistic and multi-religious society one cannot do better

Though of course the concept of a person in its linguistic reference is modern, its inner significance has always been assumed in theistically oriented religions. My personai consciousness is disturbed and distracted continuously and my attention shows continuous fluctuation. In cases of split personality we sre confronted with the most striking demonstration of this inadequacy; but in God the personal consciousness must remain undisturbed by sleep and slumber, as the Quran says, and is secure from any eclipse of consciousness An acute German thinker G Simmel* made an interesting observation that a person or, in his language "Personality" in the human frame-work realises its full meaning only inadequetely and it is only in God as an idea that it can find its fulfilment.

Psychologists have concentrated most on consciousness and on its lower levels which are subsumed under the unconscious. But there may be higher levels of consciousness and it is possible that with the eclipse of normal consciousness some other avenues are made available to us. We do not enter into any speculation at this moment, we are only interested in the dialogircal relationship in the context of Quranic consciousness. God addresses man and man turns towards Him. The concept of 'turning towards' (*Ruju'*) plays a crucial role in the Quranic consciousness It is the condition without which man cannot open himself to divine communication. Man is left alone but he has the capacity to break through his isolation. God's transcendence and His immanence refer to two different ontological levels. Man prays and in every act of prayer he transcends his human limitation Now what is interesting to note is that man is at the same time the vicegerent of God on earth and also a rebel. But it must be clearly understood that his vicegerenc is only potential. It is for man to rise to that status by his own surrender and by assimilating to himself the attributes of God. He mav play the part of a rebel or work in consonance with the divine plan when he is honoured with the title of a co-helper. This means that he cannot claim vicegerency as a fact; he has to attain it by his own acts and deeds The Quran assigns a special place to Nature. Nature is not degraded to a creation which has no significance. Every seemingly insignificant phenomenon of nature is considered a pointer to the divine The constant transition in Nature is held to be

* G. Simmel : Philosophische Kultur Die Personlichkeit Gottes (p.211)

inferred from his outward behaviour; and how his end will be is still more uncertain. This intimate contact of man with God finds expression in personal prayer (*Du'a*) which is different from public worship as well as from the performance of the scheduled form of worship, even though they may be performed alone and in private. Associated with this is the place of *Zikr* (*remembrance*) in the Islamic Programme of piety. Now it is time that we should look a little closer on the nature of *du'a* as a personal call, which evokes God's response and consider *Zikr*, which is the remembrance of God, without being restricted to any time or place.

There are two questions which have been raised with regard to *du'a*, both in the Islamic and the non-Islamic context. Some writers have given no credit to what they call petitionary prayers. It is assumed first of all that these petitions must remain ineffective; and secondly that it is not compatible with a truly religious perception. The question is not whether these petitions can be answered or not. The fact however remains that whatever our petition may be, we do consider as a matter of faith that all that happens in this world receives its sanction from a transempirical source. It is the belief in the involvement of the unseen in the affairs of the world that entitles these petitionary prayers a place in the religious scheme of things. Secondly, in the Islamic context God askes man to call Him in moments of crises and distress and assures him of His answer. Again, within the context of Islam itself, the question about the possibility of our prayers being answered has been raised. If what is to come is already recorded in the Preserved Tablet, how can then our prayers make any difference ? Here it is necessary to distinguish between the providential record of the future and our own address to God. *Du'a* as such is a part of a dialogue though one of the partners of the dialogues, that is the divine partner, is not perceptible at the normal level. The classical example of this dialogical relationship is offered in the case of the prophet Moses as the result of which he is designated *Kalim* (the interlocutor). No wonder, the Jewish philosopher Martin Buber has made dialogue the basis of religious consciousness Anyhow, apart from dialogue as a mystic experience in which God and man are involved, it has also a profound significance at the level of normal religious sensitivity. I address to God as "thou" and expect to hear from Him a response as a person. I cannot think of Him a person on my own level but a person nevertheless in so far as I cannot translate His relation to me by any category other than that of a person.

its accent and emphasis. We should in this context pay special attention to the individual and collective dimension of Islam. Whether we consider ourselves a part of the historically-determined organization which we identify as Islam or whether we recognise Islam as God's address to an individual as an individual in his singularity, both aspects find a place in the Quranic perspective. Let us first take the collective aspect which is specially evident in its rituals and rites. The most striking phenomenon is Hajj or a pilgrimage to Ka'ba as incombent on every Muslim who can afford. This has always remained a unifying factor which demonstrates in a signal way the brotherhood which cuts across not only ethnic and racial divisions but also divisions created by wealth and power From the importance given to the community, priority accorded to congregational prayers naturally follows. Again, the economic measures like that of *Zakat* are recommended for the welfare of the community to promote economic justice. The prohibition against intoxicants has also the interest of the collectivity in view. And last but not the least is the idea of a state which rules on the basis of equal opportunities for all, consultations among themselves and preservation of the life and property of its citizens. But this is only one aspect of Islam. There is another aspect without which the collective dimension of the Islamic religion cannot have any significance. We may call it the existential dimension through which my experience as an individual who is born alone and forlorn, given to dread and cares and projected to death, is articulated. Now this individual with his I-am-ness cannot be exhausted in what he does in his collective configuration. Society and the state can judge him only from his outward behaviour and from its impact on his fellowmen and on his own surroundings. His intentions, his thoughts, his motives, good or bad, are completely hidden from us. Psychologically he may not be himself aware of his hidden motives. This is why it is said in the Quran that God only knows what passes in the mind of man. And this hiddenness of his inner life from the outward eye makes him easily misunderstood and misjudged. Now this individual encounter with God is completely taken into account in the Quranic perspective. It is categorically declared that, "no one bears the burden of another" and "one's sins are not transmitted to others". Man in his intimacy is responsible to God in His ultimacy. This is why there are certain forms of our response to the divine which are not covered by ritual prayer, and it may happen that inspite of our compliance with the scheduled prescriptions of Islamic Law, we may be still far from enjoying the divine favour. What man's station with God is can never be

him to the divine order in time, the call to be steadfast in times of troubles and disillusionment constitute a world of their own, apart from legal prescriptions and sanctions. The Islamic pattern of the criminal and the civil law in our considerations should be completely isolated from our metaphysical and theological understanding of the Islamic vision of this world and of the Hereafter. Naturally our consideration of the historical assessment of the figures who have been mentioned in the Quran calls for a separate approach. It is clear that legal injunctions do not demand any allegorical explanation. They stand as they are. But the question arises whether they are meant as fixed orders or commandments which should find their application regardless of the geographical and historical context for all times to come. Do they not allow any restriction in their application and do they not represent at least partially a continuation of the attitudes and modes of behaviour which are found in the Old Testament as well as in pre-Islamic Arab usage? It cannot be doubted that though moral values have a permanent content, their expressions reflecting the sensitivities of every epoch vary from period to period of history. Unfortunately we do not care to distinguish between different levels of reality; and the moment some satement is supposed to be vouchsafed by revelation, we think it is settled once for all and there is nothing to be thought about. The moment revelation is related to the world of action and history, it cannot but accomodate itself to the situation of the given time. The whole question boils down to applicability. Not that the revelation is invalidated, but its applicability demands adjustment and reshifting of emphasis in different ways. Islamic thought cannot be considered rigid and stereotyped but, what Mohd. Iqbal called, the principle of movement in Islam must be kept preserved. Islam cannot be called a structure which is given to us readymade but a complex of tendencies and guiding principles whose development cannot be considered closed and penned down in all its details once for all. It is for the Muslims to re-think what has already been thought and to re-examine what has already been examined. To consider every thing settled once for all and leave everything to revelation which is given once for all is to fall a prey to that fallacy which Kant called the fallacy of the 'idle reason'; in other words, reason should stir itself and not allow itself to sleep when it is the time to think.

This means Islam is also a process and a movement. Like every thing in this world, it is not a structure which resists any shift in

of secularism and western theological acrobatics ? Alas, the spectacle of contemporary Islam is not merely one of stagnation but actually of regression when compared to the creativity, vitality and capacity of positive absorption and transformation which Islam exhibited in its golden age, Contemporary Islam seems to lapse more and more into fundamentalist orthodoxy, a phenomenon not unknown also in other religions but with the crucial difference that at the other end of its spectrum Islam lacks all genuinely modernizing dynamism. The essentially unmodern, but at least in its intentions modernizing 'modernism' of earlier modernists, seems to have spent itself before reaching the point of take-off into real modernity. Much apparent self-assertion of Islam is the product not of a genuinely religious awareness but of anti-Western affects and, not infrequently, of lip-service to Islam by those who are far removed from religion but for whom Muslim identification is a convenient idiom for Arabism or for Third World Militancy in general". Further he continues: "And at the other end of the scale, Islam inevitably becomes the object of a complex and involuted anti-Islamism. The challenge of modernity is mighty and the resources of Islam may be exhausted. Or are these resources still untapped and awaiting release ? Between resurgent literalist Fundamentalism, anti-Western affects, nationalism and secularism, Islam will either disintegrate or turn into *Jinsiyah*, unless it can reassert itself as a *din-Allah* for a modern age". (pp. 81-82).

Will Islam rise to the occasion and belie the worst fears of the sceptic ? Will it be able to spring a surprise and demonstrate to the world that it has not expended its energies and exhausted its potentialities but has the power to give expression to its ethos in novel forms.

The possibility of understanding Islam requires that it should be understood at different levels, which in fact means that in the understanding of the Quran the difference of levels and, in consequence, variations in our approaches should not be neglected. The way we should look upon the statements about God is bound to be different from our approach in our understanding the destiny of man, his vocation in this world and his future in the next. Second is the ideational complex which emerges in relation to legal and moral aspects. The purely moral foundation must be distinguished from legal prescriptions. The kind of life that man is asked to lead depends on his moral stand in his relation to fellow beings. The kind of behaviour one is expected to cultivate in trials and tribulations, the response that is required of

time, or the creation of time itself, philosophical enquiry cannot go beyond considering them as Ideas which do not constitute knowledge but which can have only a regulative significance. This was indeed the position of Kant. Nor can religion pretend to give us the idea of creation or of the beginning and the end of the world as objects of knowledge but only as concerns of faith which can be understood at different levels. That the world is created out of nothing by God's creative command, by the fiat of his will, or the world was created in six days, albeit the measure with which days of God are measured is quite different, are not facts subject to rational inquiry. They are in fact not intended to offer us cosmology in the philosophical and scientific sense but only to take us to the borders of intelligbility so as to make us aware of the limits under which we can think at all. This does not mean that the idea of creation is meaningless or that the cosmological elements have no content but only that they are given in a language which must be interpretated in such a way that these ideas are not secularised and forfiet all reference to the transcendent but only to serve as pointers to the transcendent. Again, when we move down from the metaphysical level to the level of everyday life and consider religion in its legislative function, we come to a totally different level of understanding. There is no question of symbols and signs, pictorial representation or symbolic interpretation. when we deal with the matter-of-fact world of everyday life. Laws are enacted and social norms of behaviour and conduct towards one another are regulated through religious prescriptions. Here again it is neccssary to distinguish between its moral value content and its purely legal aspect. The moral content has a permanent feature whereas legislative infra-structure must not fail to adapt itself to circumstances which were not foreseen. Hence it is necessary to distinguish the legal aspects from the moral aspects. But it must not be forgotten that the Islamic laws have come into being under certain contingent conditions. To consider them in isolation from these historical conditions is arbitrary. The geographical and historical compulsions cannot be overlooked and it is their inability to appreciate situational compulsions that leads even perceptive critics to raise disturbing questions. Prof. Werblowsky's remarks in his valuable book *Byond Tradition and Modernity* deserve to be pondered upon :

"Will Islam as a religion be able to proclaim the *Shahada* in a modern and most modern age, testifying against both western notions

combat whatever appears modernistic. Modernism as such is a neutral concept and all that is modern need not be anathema to the Muslim consciousness. If one pushes the attitudes which are supposed to stand for pristine Islam to the extreme, one will find it impossible to communicate with the outside world. And the severence of a dialogue with people of one's own Age cannot but lead to disasterous consequences. Let it be noted that what is called modernism is also a historical phenomenon, and in times to come, the so called modernism of today might lose its distinctive features and will be considered an outmoded way of life; and it may also happen that modes of life which are outmoded today might be revived. Indeed we are supposed to have entered a post-modern era. There is no need for a Muslim to be allergic to social modes. He may freely identify first the values which he considers Islamic, and articulate them in consonance with the local and historical context. This is tantamount to saying that a religion which claims universal validity can preserve its universality only by delocalising its earliest expression. We are therefore to pursue in all seriousness a re-examination not only of our theoretical foundation but also of our in-built attitudes and perspectives. De-mythologisation has its own limits; and symbolical interpretations need not be pushed so far as to strip religion of its substance. But we must consider delocalisation of the original religious pattern as a necessity which cannot be dispensed with.

Islamic consciousness must be open to new perspectives which emerge now and again in the course of human thought, and it is far from necessary to react violently against anything which might appear at first sight incompatible with our traditional understanding of Islam. It means that the knowledge gained through philosophical reflection and scientific inquiry should not be allowed to go waste. "Our duty", as Muhammad Iqbal rightly points out, "is carefully to watch the progress of human thought, and to maintain an independent critical attitude towards it". (Lectures, Preface). Man's mind brings new insights and these insights might help greatly in understanding the metaphysical issues with which religion is concerned. Philosophy and science can never be substitutes for faith but can serve a most useful purpose in throwing some light on the existential issues with which religious consciousness is concerned. Philosophy and Science have their own limitation and they cannot pretend to come with readymade solutions. When a question arises about the creation of the world or its beginning in

hand we are told "What is this life on this world except a deception", and on the other we are informed that "God has not created this world in sport and in falsehood but in truth". This means that this world is far from being an illusion, is a platform for human action, an apportunity for man to show his worth as man. we are told, is pledged to his action This takes man to a totally different perspective of life. It does neither allow a quietist posture which builds indifference towards the world and its obligations, nor such an exclusive concern for this world that all that serves not the worldly interest is considered of no account This is how the way of life which Quran cultivates is built and promoted. The Quran leaves open different options. It depends on the different stations of man in this life, on his vocation and interest to find which side must dominate. Needless to say that though every man's life will have one dominant accent, it cannot but allow different and sometimes conflicting demands to prevail in accordance with one's own station in life.

Needless to sav Islam with its origin in revelation is like any other revealed religion, a religion of varied accents and nuances. It is interesting to note that when these accents are magnified or overemphasised, they assume a form which is called heretical or heterodox. But ironically enough even the orthodoxy, if by that is meant simply the majority opinion in a given community, is formed by an exclusive emphasis on certain accents and the neglect of other accents. If, for example, the forgiveness of God is taken to its extreme form, it may also develop a kind of antinomian tendencies, when any grave offence and violations of religious injunctions do not count much and God's forgiveness and mercy shelter all deviations from morality. This is how a movement, which was once a force to be reckoned with, can be explained. On the other hand if God's power as a strict judge is emphasised as was done with the Kharijites, the concept of a sinner who commits a grave sin is identified with that of the infidel who is subject to all the consequences to which the infidel is exposed. The "orthodox" standpoint, though it attempts to take a middle position has not maintained its balance in many tricky situations which beset the history of Islam. Many a Sufi like Mansur al-Hallaj was put to death and in the name of faith many deviations which may not appear to us grave were severely condemned. This means that a Muslim who lives in a pluralistic world and who is exposed to the challenges from all quarters cannot adopt a rigid dogmatic posture in an absolute sense and support ancient credal formulations with all kinds of sophistry. Nor can we

methods with which the man of science is familiar. To him what is not relevant to his world loses all significance. Any such belief which seeks to justify itself on a non-rational basis does not mean anything to him. A totally different attitude towards religion, no less negative, seeks to eliminate religion on the ground that it is the means of exploitation; and in history religion has been used to lull to sleep the expropriated masses. And hence it is not an innocuous pastime which can be allowed to go its own way but a most destructive weapon which should be fought against. The difficulty with both of these attitudes is the one that ignores its own limitations and tries to judge beliefs which are not liable to be subjected by their own nature to any scientific screening, Theologians who try to vindicate their stand by recourse to the recent revolution in physics can only derive a negative benefit. They cannot serve to vindicate any theological position for the simple reason that theological positions themselves vary from religion to religion; and any justification of a position which is specific to some religions as, for example, any preconceived idea of the after-life, cannot seek any decisive confirmation from scientific theories. Theologians have therefore to work in two different ways. First of all they have to see that their conclusions are really the basic and integral part of their religious system and that what is basic is only a broad idea which leaves many possibilities. The accretions which accumulate latter can claim only a historical and psychological relevance.

The view which tries to combat religion for its nefarious Influence on the welfare of the masses makes it clear that, when religions are identified with what their spokemen as a part of the Establishment have said about it in any given period of time, no other conclusion is possible. Islam has always advocated the equality of man before God, has not considered this world and its goods as vanities which should be shunned at all costs, and has not looked down upon human values in any way. The world given to us is the creation of a merciful God. Man is free to enjoy its fruits within the prescribed limits, and the difference of the sexes, nations and languages is considered the signs of God through which we can become aware of Him. Man is asked to think and reflect and to do good in this life so that he may flourish in this life as well as enjoy a status in the life to come. The goods (*hasanat*) of this world are appreciated with only one reservation and that is they should not be considered as ends in themselves and should not be allowed to possess the human mind in such a way that what is transitory and passing becomes the ultimate end and man becomes negligent of the eternal. On the one

who bring Law (*sharia*) are distinguished from the prophets (*nabi*) who do not bring Law (*sharia*) and serve only as divine teachers. It is further assumed that the law changes from prophet to prophet, though the beliefs do not change. Here it is not my purpose to go into the question of the changeability or the adjustability of the Islamic law, a question which may be left to the jurists to decide. One cannot help feeling nevertheless that the status of *din* as constituted of beliefs which are quickened with faith (*iman*) is different from the status of the law which is subservient to *din*. Independent of the law there grows a tradition which in course of time may become an essential part of religion, and specific features of the religious life of Muslims may show independent development. Islam in different countries under the impact of different social conditions may yield to customs evoking vehement protests from one group and finding acceptance by another. To the puritanically minded, it may seem a grave innovation, even bordering on *shirk* in some cases to see the Muslim life showing non-Islamic influences. But unless these customs and usages blatantly betray Islam, it will be highly unrealistic to insist upon Muslim mode of life and social appearance to be completely modelled on the patterns of life which were peculiar to the companions of the Prophet. Today justifiably enough we are much worried to maintain our indentities as Muslims. But it must not be forgotten that Muslims in different conditions have also what may be called a subordinate indentity which distinguishes the Muslims of one country from another; and by the very fact that Muslims speak different ianguages, have different patterns of thought and different historical precedents, they developed an identity of their own of which Islam may be a dominant factor but which cannot be considered an exclusive determinant. At one time the resurgence of national consciousness was so great that Islam as much as it was identified wtth its Arab expression was put to a great test. In nations with highly developed national consciousness a resentment grew against their exploitation, be it linguistically, economically or politically, in the name of Islam. The historv of Islamic people even today offers instructive examples of how the neglect of national and ethnic factors and the resentment born of it leads people to politiceal alienation. It is therefore necessary to distinguish the negative factors which affect Islam and the factors which affect all religious attitudes. First among the factors which affect religion negatively is the non-verifiability of its beliefs. It is difficult for one who is nurtured in the purely scientific tradition to commit himself to a belief which cannot be sustained by

specifically exposed. The problem of a personal God, the God whom we address as 'Thou' and who proclaims Himself as 'I' is the concern of all theistically - oriented religious perspectives. It is the common feature of Semitic religiosity, Judaic, Christian and Islamic, to affirm a being who in the modern terminology is called the person. The concept of person, though of Greek origin, assumed a specifically religious dimension outside the Greek thought. Hence it is better if we do not speak so much of a person as a self who is conceived in analogy to the human self and attributed with the characteristics which are human, though in relation to God these qualities and attributes assume absolute significance. If God is called powerful or merciful or loving, He is considered as all-loving, all-merciful and stripped of finitude. Hence it is open to the charge of anthropomorphism. In other words all attempts to conceive God have been considered the projection of human self in the image of God. This is the whole thrust of the critique which is initiated by Feuerbach and followed in principle by Marx. It is not so much man who is created in the image of God as God who is created in the image of man. Hence the charge of anthropomorphism is directed not only against the Islamic perspective as such but against all theistically-oriented perspectives. However religions which have not developed any of the personalistic conceptions of God may not be subject to this charge; but, as religions, they no doubt entertain the idea of the supersensible and envisage the possibility of salvation in transcending the limitations of time and change. Indeed the whole idea of salvation may we called into question. Our attention is confined at present to the Islamic theistic perspective and hence we have to see whether this can be understood in a way which will not subject it to any tenable criticism. First of all there is the question of revelation, the transmission of God's message through an angelic medium. Again there is the question of the Law which the prophet as a legislator brings. Now the question may be pertinently asked whether '*Din*', which may be constituted of certain beliefs, such as the belief in the reckoning of men's deeds, has the same status with the Law which the Prophet promulgates. These beliefs need not be construed as propositions to which the believer gives his assent. They become religiously relevant only when man's attitude to life is moulded through them, they are the part of his *Iman* or faith. *Din* is then constituted of beliefs and Faith. It is understood in the Islamic perspective that the Prophet of Islam was not unique in being the prophet for the first time and that the few prophets mentioned in the Quran are exceeded far by the prophets who are not mentioned, and the prophets (*rasul*)

philosophical thought has not been taken into account in present-day Muslim polemics and apologetics. Philosophy, as now understood, has no pre-established position to which all philosophers must subscribe. Philosophy is an open enquiry and its conclusions are not conclusive. They are subject to corrections. Philosophy in its historical development is sustained by an imminent dialectic. However convinced the philosophers may be about the conclusions to which they had been led, there is no assurance that their conclusions will not be challenged anymore. Philosophy is now split into schools and trends and philosophers are free to adopt any position to which their own thinking might lead. Hence today no philosopher would necessarily subscribe to the doctrine that God's knowledge is confined to the particulars or that the world had no begining in time and that there is no personal immortality and that there is no resurrection. These questions lie outside the purview of philosophical enquiry as, to speak with Kant, they lie outside the sphere of possible experience. There is however no need to consider all metaphysical statements as nonsensical in as much as they are not verifiable or even falsifiable. It is for the theologians to develop their own ideas in consonance with their own level of understanding and try to see how far clarity can be brought out in questions which are not strictly subject to philosophical scrutiny but which nevertheless have a deep relevance for religious consciousness. What is primarily required is the necessity to leave room for more than one interpretation and answers which may seem apparently divergent from the classical answers need not involve a radical conflict with the accepted solutions and responses. This is especially true in questions like the freedom of will and predestination. There have been traditions which do not permit discussions on the nature of God and on free will. We cannot give any readymade solution to questions which will always disturb philosophical intellect and stir theological disputes and which continue to crop up anew whenever religious consciouaness is agitated. But a new theology which is alert to the stand of the current discussion will not fail to take into account what has been said in recent thought and these recent approaches will stimulate religious thought to take a new look on questions of faith, Islam has one advantage in this respect. All its credal formulations are not official statements but only the declarations of recognised theologians. Hence they can not claim warrant in such a way that other alternative is excluded.

The challenges to which Islam has to respond include some which are common to all religions and there are some to which Islam is

estrangement between men. It is quite in keeping with this spirit that Quran calls the killing of an individual as the killing of the whole mankind, and the saving of one individual life from death as the saving of the whole of mankind. This shows clearly that the Quranic interest lies in what it calls helping God, which means to act in the spirit in which the creator created the world and brought order in what He created. Small wonder if whatever re-establishes harmony and order, be it the reconciliation of sworn enemies and the appearance of love between them, is taken as witness to the power and wisdom of God. Says the Quran, "If thou hast expended all that is in the earth, thou couldst not have attuned their hearts. Verily Allah is All-Might, All-Wisdom (Quran, 8:63).

One of the problems which faces Islam today is how to dissociate itself from historical misconceptions. In the heyday of Islamic thought there was a bitter controversy going on between *Mutakallimin* on the one side and the "Philosophers" on the other. But it must not be forgotten that when al-Ghazzali raised the voice of protest in the name of orthodoxy against the philosophers he had to do with certain schools of philosophy as they developed under the impact of Greek thought. It is to the credit of Islamic theology that it did not deign to "baptise" Aristotle but stood very critical in relation to it. Greek thought has many features and is a many-sided phenomenon. There are in Plato, for example, wonderful insights which later found acceptance in the mystic circles. And it is the great merit of Aristotle that he formulated for the first time the problem of God. And Plato's ideas on immortality have a lasting significance. It is also to be noted that the Greek thought against which the Muslim theologians were fighting was not the pure Greek tradition but heavily-tinged with Neo-Platonism. The Greeks did not give any attention to the problem of human freedom and it is only through Christian influences that freedom which necessarily involves responsibility became crucial in ethical discussion. Hence the peripatetic philosophers like al-Kindi, al-Farabi, Ibn Sina and Ibn Rushd do not communicate an unadulterated Greek tradition but a Neo-Platonic version. This Muslim Aristotelianism had features which naturally provoked great uneasiness in Muslim theology. Of these questions which troubled theological minds most was that of God's knowledge. Another issue which is also related to the first two basic questions was the problem of individual immortality. But unfortunately the changed climate of

We are now becoming more and more aware of man's historicity, thanks to the investigations of Dilthey, Heideggar, Jaspers and others. This means that man is a historical animal in a way in which other animals are not. He is conscious of his historicity. He is projected towards the future and the future moulds his present in a much more significant way than past does. Naturally in a purely religious context the future has also a meta-historical and a meta-temporal dimension. That we call here and now is considered in the context of a future which begins with the end of the space-time continuum and leads to reflections which are eschatoiogical. We are not indeed tempted to offer any speculations which go beyond the existential situations in which we are placed. The analysis of our existence will however remain very inadequate if we do not take into account the undisputed fact of the influence of the eschatological ideas on the believer's behaviour. Whether we accept future as future or whether what we call future has no meaning except in terms of the past makes great difference to us. The Quranic vision of man in his historicity, its description of religion in terms of history, requires ideas which transcend history. Following Kant we may as well call these ideas limiting concepts (Grenz Begriffe). In as much as the believer is in the world he is expected neither to be absorbed in the world nor to negate it. The world is the platform for action and as a platform of action it has ethical significance and as creation it is metaphysically-rooted. The signs of God are mirrored and reflected in the world and the world cannot be treated with contempt but with respect. In the *Surah* which is entitled "Luqman" the legendary seer counsels his son to walk on earth warily and bear himself with modesty. This means the world itself both as a historical phenomenon and as nature manifesting itself on the level of plant and animal life is a repository of mysteries. Every particle is a pointer, every event is meaningful. And man who occupies a privileged position in the universe must remember that this privilege he cannot claim by right but only by his own behaviour and conduct which must be supported by God's grace. The world as it is, can tempt man to forget himself, to forget his vocation and mission and even to rebel against God. What is this revolt ? This is nothing but alienation from his Source as a result of which he tries to "unmake" what God has made, to create disorder where God has established order, in short, to do all that which runs counter to the immanent teleology of the universe. It is, in other words, what the Quran calls '*fitna*' (mischief) which is sinister in consequences, which tries to bring about

held that he was not a Muslim, others maintained that he occupies a position between the faithful and the infidel. There was no unanimity among different schools of *Kalam* and each wing of the conflicting schools could seek support from tradition. But more serious were the differences in their understanding of the attributes of God which had a bodily reference If God sits on the throne and if a movement in space is attributed to God what should we make of it? While the Hanbalites and the Zahirites held to the letter of the Quran, other schools had to take recourse to interpretation in such a way as to eliminate the idea of bodily involvement. But even the literalists were forced to take a position which reduced the difference between them and their rivals. The literalists did not attribute to God a body like ours but only that the Quranic utterances should be taken as they are without asking how. They are unintelligible in human terms and they are to be taken amodally. In other words our discourse about God takes us to a totally different dimension and our words have a reference which defies human intelligibility. Seen deeper this means that whether they involve bodily references of psychic attribution, their meaning can not be sought in human terms or in terms of human intelligibility. If God is wroth His wrath has only an analogical character. It does not involve any disturbance in the Divine conciousness; and when it is said that He is pleased, it does not mean any transition in God's consciousness from one state to another.

With other great Semitic religions like Christianity and judaism, Islam is a religion with deep historical consciousness. First of all it places itself in the continuity of prophetic revelation, though the message is considered the last and the final one it does not really break the continuity. The Islamic revelation is embedded in history. Unfortunately in the average consciousness of a Muslim it is only the last word of God which he generally considers in isolation from the rest. The Quran refers to the prophets of old with great respect and considers the message of the last prophet as affiliated to the Abrahamic *Din*. The prophets of the old are held before the prophet of Islam as models and the Quran warns against any discrimination between them, though it is conceded that the prophets may have grades and ranks and they may have a heirarchy of their own. But apart from this they all belong to a fraternity and any rejection of one amounts to the rejection of Islam as much. No one can miss the historical orientation of the Quranic revelation.

have already been envisaged and all their solutions have been determined before hand. The idea of perfection is to be understood in a more dynamic sense; it means perfection as the power of adaptability and the capacity to respond to all changing situations and historical challenges by the Quranic directives and principles. It does not refer to particulars as particulars are unpredictable. It does not mean that we have no space left for us to accommodate ourselves in the flux of history. Religion is a historical phenomenon, however metahistorical its roots and dynamism may be. History is change and process. This is not to deny that history has a metahistorical dimension and might in the last resort be determined by the inscrutable forces beyond the human Ken. Whilst the metaphysical dimension stands by itself and whilst it will be fatal to religion to reduce it to its historical determinants and consider them as decisive, we have to admit that even our understanding of this metahistorical aspect and the peculiar symbols and parables through which it finds expression requires both the psychological and historical conditions of a given epoch and people. Even the metaphysical and metahistorical dimension of a religion without which religion *per se* cannot be conceived, demands historical infra-structure. If we cannot grant to any credal interpretation, however deeply rooted in the sacred tradition any finality, how much more pressing will be the need of re-interpretation for what is eminently historical. No one doubts the value of tradition and it has to be respected at all costs. But in any reconstruction of Islamic thought it cannot be taken in its customary presentation without any reference to the situations which evoked it. The nature of the case is such that from the very earliest times traditions have been variously interpreted and the leading schools have diverged from one another even on issues which to those who stand outside the fold might appear to be of no material significance. It may be the principles on the basis of which these divergences have taken place might be concerned with concerns of crucial importance. The major schism in Islam has also been due to the divergences of interpretations and to their acceptance and non-acceptance of different traditions and to their appeal to different criteria of judgement. As we know from the theological debates that rocked Islam and which divided the theologians, the place of the sinner who has committed a grave sin figured prominently.[1] While the Kharijite

1. See Izutsu's work : The concept of Belief in Islamic Theology, New York 1980

which always lurks and which has found deep resonance in history. That the national and local profile of a culture should not be submerged in the so-called universalism; that every local nuance should be respected and every national expression should be allowed its own freedom so long as it does not deviate from the basic principles, is the conviction which should be held tenaciously. But Islam, with its claim to Divine revelation, with its proclamation of its message as of Supernational relevance, cannot remain bound by any passing phase of its history and has to reckon as much with historical conditions as with its essential and basic intentions. If it is true that Islam being a historical phenomenon, its way of life and its structure have to be explained with reference to its historical origin, it is no less true that it has a super-historical mission. It is neither an Arab phenomenon nor a non-Arab outgrowth. It has to find out what is subject to change and growth and what is not. Muslims cannot be bound by traditional interpretation and ways of thought which were meaningful in a certain period of history but have lost their relevance today, Western scholars often tend to explain Islam as a desert manifestation which suddenly sprouted in a far off corner of the world and soon lost its momentum. Muslims have become more and more chained to the past and over-awed by tradition; they refuse to see that there can be alternatives and different possibilities. All questions, economical and social, have a historical conditioning and require solutions in consonance with the shifting situations of history. We should not adopt any extreme course and think of solutions in terms of either-or. We should not blindly follow what passes as modern, or stick to tradition where it is not compatible with the changed situations. We should be equally averse to reject anything modern simply because it has no precedent in the past. We should not forget that our knowledge of the past is historically conditioned and tranamitted in an indirect way to us, The understanding of Islam by our ancesters had no obligatory character; and, as long as we remian loyal to its metaphysical moorings and remain faithful to the religious spirit we need not feel guilty of any betrayal. There is no reason why we should stick to the solutions which were proffered to us by scholars whose memory of course we must dearly cherish but whose judgement we need not accept.

All that Islam is and can be is not exhausted in one stretch of time It is misunderstanding to think of the Quranic declaration that God has perfected Islam to mean that all concrete situations of life

Abdullah, a solitary orphan in the wilderness of Arabia, an Arab who broke through the narrow confines of his Arab origin and who taught his community to look beyond their ethnic loyalties and family allegiance. His call forced them to look to supra-national and supra-ethnic goals and to transcend their Arab affiliation. They made to realise that its Arab accent was only a historical necessity and nothing more. When occidental scholars write about the Prophet of Islam they forget that Muhammed is not only a historical figure but an experience which is always kept alive in the beliefs of the believers. As experience, he never ceases to work and influence the beliefs which again become the part of the living tradition. The so called facts which History gives are often too fragmentary to serve as faithful records of what happend. They are transmitted in the language and the imagination of the transmitters and interpreted today by worldly-orientated minds. They make sense only when they are looked with reference to the historical figure as he is experienced to day and who has assumed a meta-historical significance in the changing situations of the Muslim experience of history. Islam may be considered a living history, a present which is quickened with the past. Islam is both a fact, a haunting presence, and at the same time a requirement, a challenge. The critics of Islam speak glibly of challenges that Islam has to face but Islam itself appeared as a challenge which the world had to face. That the Word of God should be ruled effectively in life, that history should not move erratically but should be controlled and guided by Islamic norms and values is the conviction which permeates the Islamic outlook. Islam stands for wholeness, for a life which drifts not in stereotyped patterns but which moves creatively. It is wrong to think of creativity and traditionalism as excluding one another. Islam's history shows that when traditionalism and creativity exclude and mutually negate, the Islamic accent is lost. Islam is not uniformity. Is is not indifferent to historical requirements and negligent of empirical demands. Islamic history shows that at all moments Islam was confronted with two significant challenges. One is the threat which comes of the view that the Islamic pattern through which Islamic spirit can be expressed is fixed once for all and any other pattern is the betrayal of Islam. The other is the inability to distinguish between what matters and what does not matter. The peripheral issues assume the form of dogmatic exclusiveness; and, when the Islamic and non-Islamic values are discriminated on this basis Islam loses it creativity. This is a danger

Islam : Problems and Prospects

Islam is nothing if not a global manifestation and all attempts to localize Islam or to understand it from a parochial and regional angle are doomed to fail. Consequently every attempt to see Islam from the standpoint of a particular culture and consider the challenges that face Islam in a specified geographical area and in a certain historical milieu is apt to be very misleading. Most of the Western scholars are prone to consider Islam as an Arab phenomenon, and, to the Arabs it might even appear as self-evident to see in Islam the manifestation of Arab genius and to respond to it in terms of its own ethnic conditions. Nor can we ignore the inveterate proclivity of Muslims, be they Arabs, or non-Arabs to consider all that makes for progress already latent in Islam's first manifestation in the primitive conditions of the desert, and to almost identify what is non-Islamic with what is non-Arab. It is equally amazing to see the Muslims of non-Arab areas essaying hard to find in their current problems a recapitulation of their early history of Islam on the Arab soil and to ignore the problems which have a new dimension. No one can deny the Arab origin of Islam, and. the neglect of the historical conditioning of religion is apt to confuse what is universally relevant with what is historically conditioned. There is another danger to which a study of religions might become an easy prey. The idea of historical conditioning might seem to involve the elimination and exclusion of universality and to transform the religion whose message transcends national and ethnic barrier into a marvel of national genius. The prophet of Islam might then appear as a national hero who forged unity in the warring Arab tribes and who, even according to one resourcefnl writer, used religious myths to a minimum for fostering economic and social goals. On the other hand a fundamentalist approach has gained ground and it is thought that the first expression of Islam is its exhaustive expression and its first politico-social manifestation is the final one and its later manifestation in history can be judged by the patterns which were already set and new patterns can claim legitimacy only so far as they approximate to their primitive manifestation. But all these one-sided and exclussive views can hardly be expected to do justice to the rich and inexhaustible phenomenon which we call Islam and whose foundation was laid by that charismatic genius Muhammad bin

told, "what is this world but the play and deception" How are we to understand these seemingly contradictory postures. We have first to take into account the world as the totality of creation. It is not as if to pass away time that God created the world. The world as creation is always oriented towards God. Every particle of the world has a significance of its own, though we may not be aware of its significance. In the second declaration of the world as play and deception it really refers to the human world where we do not know whether what we consider success does not really portend failure, whether the persons whom we regard as friends will not betray us in the long run, whether those who are nearest and dearest to us would not finally let us down, and whether all the gains that we have earned would not finally disappear in smoke. This is the essence of the Quranic approach to the world at different levels. What amounts to total denunciation is with reference to worldliness, our constant occupation with the world to the exclusion of all that does not belong to mundane interest. This means again that the Quranic attitudes have a reference which is relative to a given context, and, the moment we lose contact with the context, we are apt to misunderstand the spirit of the Quran. This means again that the Quranic vision of the world has different frames of reference and the trouble arises when we ascribe to historical contingencies an absolute character and eternalise the temporal.

—:0:—

of the world as a human world inhabited by human persons; third, our understanding of the world as worldliness. As regards the world as nature it is not degraded to a secondary status, explained away as illusion. It is the creation of God and, as creation of God, it is full of mysteries and pointers. In fact, man's attention is directed towards God through the contemplation of Nature and through the marvels that it holds. Even the seemingly insignificant happenings in nature, the sprouting of leaves, rains which infuse life into the soil, the constant transition of seasons, are given attention. Nay, even the aesthetic aspect of nature is no less taken into account. The shepherds returning from the fields bring delight to the eyes. In other words, nature in all its phases is appreciated as God's work. Nature includes also animal life and animals though given seemingly subordinate role, enjoy a place in the divine order. What is more, it is said categorically. "There is not an animal on the earth, nor a flying creature flying on two wings but they are peoples like unto you." (VI, 38)

As regards the world which is considered in the context of social relationship between man and man, in other words, the human world occupies a privileged place, as no doubt it is to the human world that the message is addressed. This means that man in his dealings with other human beings occupies special attention. Men are distinguished between those who respond to the call of God and those who do not. In other words the human kind is distinguished by the fact that all its actions are liable to be questioned and man stands responsible to what he does. God and man stand in a special relationship. Again, there is the problem of the worldliness, the Quranic attitude to worldly values as secular ends. Strictly speaking, there is nothing exclusively secular in the Quranic perspective and everything is related to God directly or indirectly. But we may distinguish for conceptual clarification, the goals which are God-oriented from the goals which are allowed to man for his relaxation. Any occupation with leisure, any distraction which allows man to while away time, any sport or entertainment with which he occupies himself have a place of their own. These activities can be questioned only when they violate any basic principle. In fact it is necessary not to take an all too rigid a view with regard to what we may consider from purely puritanic stand-point as not worthy of occupation. The Quran is explicit on the question whether the world was created for nothing or whether it has a purpose of its own: "We have not created the world in sport, nor in falsehood but in truth". But at the same time we are

but they work at a different level. Man is tuned to the world unseen while remaining himself in the world given to him. The whole spirit of the Quran and Islam is to infuse the air of other-worldliness in man's worldly involvement, The congregational *Surah* hints at it in a very subtle way. The believer is asked not to get distracted by the noise and din of the world, but to gather himself for prayer, on completing which he can go his own way seeking the bounty of Allah. Thus Islam swings in a constant movement between this world and that. When the wordly goods are considered gratuitous favours, they assume an other-worldly dimension. Both, the scheduled prayer and the frequent remembrance of God, have their function to serve. The scheduled prayers are meant to ward man from neglect whereas the remembrance of God is meant to sustain his contact with God without interruption. No doubt in one sense God is with us, whether we think of Him or not, but in another sense His being with us assume a deeper meaning when we are aware of it. Man's consciousness of His presence transforms his life and as the Quran says, from Allah we are and unto Allah we move back. The Quranic world perspective is highly significant. The Quran does not enjoin a way of life which few can follow but envisages different grades in which our response to God can be understood. Corresponding to this graded response the station of man is also marked in the life hereafter. If there are persons who remember God in the watches of the night, who seek His forgiveness in the early morning, whose hearts quake at the mention of the word of God, there are still others who could only faintly approximate to the high station. Hence in the life hereafter three categories are mentioned, the one to the left who have fulfilled their mission in life, the one to the right who have responded to the call of God to the best of their abliities and the outstrippers (*abiqun-al- sabiqun*) who have attained a high station by their excessive zeal in their compliance with God's will This means that even those who have erred cannot have the same status. The worst of those who have erred and those who are assigned the lowest rank in God's judgement, are the *Munafiqun*, the hypocrites and dissemblers with deceptive appearances.

Now we shall see what the Quranic attitude is towards the world as it is with all evils and goods, the world as it is lived by the human person. In other words, let us look a little closer at the Quranic world consciousness. First we must make a few useful distinctions. One is our understanding of the world as nature; second, our understanding

orientation towards God, the awakening in man of God's consciousness and in considering God as the one without whose guidance man cannot prosper. We cannot fare well in this world unless we fare well with God. God is man's constant frame of reference Between two poles of Muslim religiosity, the legislative and the God-oriented behaviour, the life of a Muslim must develop. Now in seemingly exterior commands about his own scheduled worship and about his dealings with others, a deep inwards religiosity is involved. For example, the prayer five times a day might appear a mechanical routine not only to outsiders but also to Muslims who have been alieniated from their source. The same prayer indeed can be performed as a stereotyped routine without any relation to its content and meaning and it can be performed as a deep religious experience when the performer feels himself standing before God in His presence. On being asked what righteousness (*Ihsan*) is, the Prophet is said to have declared: "Serving Allah as if He were before thy eyes: For if thou seest Him not, He seeth thee".[1] Every word and every verse which he recite, he feels them in their depth. Not only the scheduled prayer but even the different ways in which God is named can provoke deep religious experience in some, while to others they cannot be more than sounds signifying nothing. Hence the name of God is more often than not repeated 'in vain'. The words 'Allah-o Akbar', God is greater, when they rang through the mouths of those who really believed in them, shook the world to its foundation; and the same words when they are repeated in a different context create nothing but mischief. This means that the seeming externality of the Quranic attitudes depends on those through whom the Quranic message and mission are proclaimed. The Quranic attitude leaves no doubt in this regard. If the change in the direction of the prayer is announced, it is clearly declared that what matters is piety and it does not matter much which way you turn; and with no less force it is declared that "withersoever you turn there is the visage of God". The same holds good for animal sacrifice. Though animal sacrifice has a place in Islamic ritualism, it is clearly declared that what reaches God is not the blood and the flesh but the piety of the believer. This means that so called external practices receive their value from the experiential and existential content. The same consideration is applied to other practices like that of fasting. They do not aim at discipline in a proper sense

1 A.J. Wensinck : The Muslim Creed, p. 23

'creature'. In other words, it is man's creatureliness which finds expression through this idea. And interestingly enough he has made relevant references to Islam in this context. Naturally he speaks as a Christian theologian, but the point is that he goes to the core of the problem. Otto's references to St. Paul are relevant enough to make us understand that the idea of predestination which is imputed to Islam is not an exclusively Islamic prerogative but is a constituent of religious consciousness as such. St. Paul says of God that "he hath mercy on whom he will, and whom he will he hardeneth". (Paul, Romans, 9, 18). And again referring to those who question God's will he says: "Nay but, O man; who art thou that repliest against God? Shall the thing formed say to him that formed it, why did't thou make me thus?" (Paul, Romans, 9, 20). This is the rsason why the *Mu'tazilah* went one way and their opponents went another. The *Mu'tazilah*, who have been called rationalists in Islam, insisted on the unity and justice of God and they were called men of unity and justice. For them any punishment which one does not deserve by his action is unjust, and God being just does not inflict on man an unjust punishment. In other words He cannot act unjustly. The *Asha'i ah*, on the other hand, thought that this would amount to an interference in God's power and they maintained that God has power to reward the wicked and to punish the just. But the question is to distinguish between what He does hypothetically and what He does factually. Hence what is needed is not to offer solution but to maintain balance in conflicting positions and to allow both the thesis and the anti-thesis some justification and not to exclude the one at the expense of the other. These questions are really challenges to human thought and we know that they have not fared better when the perspective completely changed and when the approach to these problems lost all contact with religion and completely rational solutions were attempted. A man like Kant considers freedom an Idea of the practical reason and does not ascribe to it more than a regulative significance.

The Quranic moments can be considered at different levels, though unfortunately the level which is at the lowest is given often questionable priority. No wonder then in the Western account of Islam the legislative aspect invites most attention. In other words the *Shari'ah* both in its civil and penal aspects seems to characterise Islam exhaustively. Needless to say that the juristic dimension is not the exclusive concern of the Quran. What it is most concerned with is

again there are different options open and only one option is excluded and this is to say that the world beyond cannot be held to be a replica of this world. The theological reconstruction should aim at semantic clarification.. But apart from this there are metaphysical problems in the strict sense which defy rational penetration and in consequence do not allow any solution about which consensus can be attained The problem which calls for deeper study in the Islamic context relates to the freedom of man. Traditionally the freedom of will is presented in a way which is tantamount to denying it and the advocates of different conflicting views resort to the Quranic verses in their support. The problem of the freedom of will is closely linked with that of predestination, and there are, no doubt, Quranic verses which seem to support the predestination of man. But, again, there are verses which speak clearly for the freedom of man. The whole concept of reckoning is based on human responsibility and accountability and man's ability to do good and evil. The Quran of course is not a philosophical treatise but a revealed scripture which can only be understood if we are sensitive enough to take into account the dialectical structure of its perspective. The thesis and anti-thesis are not resolved but are allowed to remain open for man to reflect upon and to acknowledge that freedom and determinism are part and parcel of human reality. That I am not all in all, that my intentions and their fulfilment are not bound together with necessity but that a gulf lies between the idea and its fulfilment, is to be recognised. The Quran insists, on the one hand, that man is pledged to his actions, that God does not allow any oppression against him, and that He is all just and the best of all judges *(Khair al Hakimin)*. On the other hand it seems as if man is completely in the hands of God. He leads astray whomso He wills and leads to truth whomso He wills. This means that man has different dimensions and God's dealings with man can be understood in two ways: in a rational way when we insist on man's freedom, and in an irrational way when we recognise man's complete dependence on God's will.

Rudolf Otto, with his acute observations on the idea of predestination, has indeed cleared some misunderstandings.[1] He has justly pointed out that this idea of predestination is primarily based on religious intuition and has its roots in one's awareness of being a

1. Rudolf Otto: The Idea of the Holy, Engl. Trans. New York, 1958, p 90.

In the history of Muslim theological thought, however, such intriguing problems like freedom of will, predestination, the attributes of God, different positions have evoked different responses. Whilst the *Asha'irah* position has been considered 'orthodox' the *Mu'tazilah* position has been held suspect. Even the *Asha'irah* position has not found favour with the so called ultra-orthodox Hanbalites who find any deviation from the literarist interpretation condemnable and prefer to impute to God all corporeal attributes as they are, but without asking how, amodally. In fact it is necessary now not to be misled by history and not to think that Islamic thought has been closed once for all, but to rethink and reformulate; the old disputes and the controversies which have no relevance today need to be shelved in the interest of the genuine philosophical and theological awareness.

What are then the main philosophical issues which all theistically-oriented religions as Islam have to deal with. The main thrust of the Quranic revelation is centered on the presence of God, His unity and attributes. It is for the theology of the future to consider the problem of God in the context of the recent debates. It must not be forgotten that for authentic religious consciousness God is not a problem at all, and when it becomes a part of a creed it is almost blasphemous to talk of God as a problem. The Quranic revelation of course tries to awaken the consciousness of God through certain lines of thought which appear as arguments. But they are not arguments in any sense of traditional logic. Suffice it to say here that though God can not be considered a problem for faith, it is to be considered a problem when doubts assail the believer. It is only in one's confrontation with the non-believer or the sceptic that the problem arises and the *Kalam* has to take it into account. Again. the revelation speaks a language which smacks of anthropomorphism and it is to be made clear how far analogical statements can be made about God. Thus the old controversy about the relation between God's essence and His attributes is to be reconsidered, as well as the old problem of the nature of creation, the place of suffering and evil, in short the problem of theodicy. The other problem that haunts mankind is the problem of posthumous existence. Here again different options are open and for each option verses of the Quran and the traditions may be forwarded. Assuming that there is a life beyond, what kind of a life it could be. The Quranic descriptions might be deemed by some to be very sensuous and as such not compatible with the world which is supposed to transcend the senses completely. Here

awareness, and when music and poetry conjoin, they become effective even more. No wonder that in Sufi circles music and poetry played a major role and there is great truth in Schopenhauer's assingning to music above all the function of delivering man from the anguish of desires and of the will to live. This means that apart from morality there are also other avenues through which the unconditional can be hinted at, though certainly in moral conciousness it comes to conceptual clarity. In our Islamic experience the recitation of the Quran subserves a role which is akin to artistic experience, albeit by its very nature it has not that ambiguity which always haunts art where the transition from the sensible to the super-sensible may not find unambiguous response. A poem of Hafiz, for instance, can be interpretated in both ways and controversies continue to persist whether a piece of poetry should be interpretated only allegorically or mystically; whereas in the Quran even the most mundane references have a religious orientation.

Now it is for the Muslims not to make their interpretations so rigid as to exclude all possibilities and to allow only one explanation as legitimate. It may be noted that in Islam there is no orthodoxy and apart from the basic tenets which are considered by all as part and parcel of Islamic conciousness, there is no authoritative formulation of the creed, *Aqidah*, through Councils as happened with the Christian Church. The statements included in the creeds[1] have more or less a personal note and as such attributed to Muslim divines like Abu Hanifa and Nasafi. They can not claim finality.

The theses embodied in the creeds which have been influencial in Sunni Islam as that of *Fiqh Akbar* in its different versions and the *Wasiyyat* Abu Hanifa do not so much breathe the spirit of Islam as reflect the intellectual milieu of the time and the sectarian conflicts. These creeds not only cover theses of theological relevance as for example the definition of faith, the uncreatedness of the Word of God or predestination but also make much of questions which cannot be considered by any stretch of im gination to be constituent of the Islamic cosnciousness. They are as much concerned with the relative precedence of the companions of the Prophet as with the possibility of the vision of God in the Hereafter. All levels of thoughts, from the metaphysical to the ritualistic, are jumbled together. It is to be observed that the metaphysically-loaded parts of the creed do not leave any room for flexibility.

1. A.J. Wensinck : The Muslim Creed, 1965.

are discriminated from the bad deeds, or the '*Kursi*' or '*Arsh*' which is the throne of God. All these references indicate a symbolical connotation which can only be understood in their trans-empirical reference and any attempt to translate them in the secular terms distorts the original intention. Again there are graphic descriptions of Heaven and Hell and Judgement which also require an interpretation in conformity with one's own level of understanding. They do not refer to facts as given in our finite experience but to totally different conditions where the requirements of this world do not obtain. To say this is not to deny the world beyond, but only to say that it cannot be translated in finite terms, in terms of time and space as known to us. Hence the only way through which they may be made accessible to us is through analogy The Christian schoolmen, specially St. Thomas, rightly emphasised the role of analogy in our understanding of God and His attributes, as God's being is not what we understand of being in our experience. This is the main thrust of his concept of *analogia entis*. Muslim theologians in their discussion of attributes have also hinted at the difficulties which follow if we ascribe to God attributes and if we do not ascribe to Him any attribute; and they also took great pains to distinguish between what they call *tashbih* and *tanzih*, between imputing to God any human attributes analogically and denying all human attributes unconditionally. This is indeed a problem which troubles all theistic thinking.

Whether we resort to metaphorical or symbolical interpretation or whether we introduce analogy to explain the transcendental data, and try to suppress the temptation to impute to God and the transcendental world attributes which are borrowed from our own experience univocally, these explanations have their limits and they cannot convey any information or knowledge which is not empirically accessible to us. Our categories of thought are applicable only to possible experience and lose their validity beyond. If the literarist's explanation fails, it does not mean that the facts and superfacts, which they refer to, have lost their meaning. Religion has rightly made use of different means to convey its meaning and, of them, art has been the most effective. Poetry, Music and painting and every expression of art do not simply entertain us; they enable us to transcend the senses through the senses. Hence it is not only through our consciousness of the categorical obligation in the moral situation that we confront the super-sensible. Music, above all, can rouse in us this super-sensible

istorical nature involving names transmitted through religious tradi-ion as that of Abraham and the sacrifice of his son, the founding of *Ka'ba* and various incidents in which prophets of yore are involved. They are of course not metahistorical in the sense in which the for-ner examples certainly are. But they are not historical in the sense n which history which unrolls before our eyes is. The ambiguity nd doubts about them are not born by lack of evidence, by confilct-ng accounts relating to them, but by lack of understanding for the purpose they are meant to serve. They are not used to serve a istorical purpose but a metahistorical, however clearly embedded in uman history they may appear to be. Consequently any charge of leviation from history has no sense; it is the tradition which must ount, and, in the Islamic context, it is the Muslim tradition which nust be given the last say.

But the situation becomes different so far as empirical sciences are concerned, and so far as they treat empirical data. No one will question the occasional references to natural events on the basis of their non-conformity with the knowledge which is gained through the empirical data. Current pre-scientific ideas are used to serve a purpose other than the scientific: whether the Heavens are seven or whether the account of the creation of the world has any scientific legitimacy, is not the question; they have relevance only in a symbolic frame of reference. In questions of scientific knowledge, tradition can not decide and the 'facts' that they refer to in the Quranic context have no empirical significance but transcendental indication. "The days" referred to have no place in our temporal scheme but allude to a different order of time. Hence religious hermeneutics should reassess the semantic equipment of a given time. If God is referred to as placing His hands on the believers in the historical pact which was concluded, what is intended is conveyed through a language which on the face of it does not require any literary interpretation. When in ordinary commerce we do not accept such expressions in the literal sense, there is no need to question any interpretation as deviation from literary usage Metaphorical expressions are part and parcel of all languages. But apart from metaphorical expressions we meet with symbols which demand no conceptual interpretation but assume sensitivity to religious language in its symbolical function. This is the case, for example, with the Book in which man's deeds are recorded or with the Prescribed Tablet or with the Balance in which the deeds are weighed and the good deeds

and they may give expression to two different perspectives and approaches We can not opt for the one as against the other on historical grounds. In neither case it is history. History does not begin with Adam but only with his children and Adam as a metahistorical figure has nothing to fear from evolutionary or other scientific or pseudo-scientific theories. His is a metahistorical figure and only through faith can we understand what he is. The whole trouble begins when we try to apply human criteria based on our empirical experience to situations which completely transcend this experience. Hence even in situations which involve history we must understand what this history is. It does not claim to be a record given by the contemporary witnesses but only records which are transmitted through revelation. We can dispute these records only when we have other records which carry the warrant of unimpeachable testimony. It has taken quite a long time for man to understand that scientific allusions in religious scriptures have nothing in common with our own scientific knowledge, and if they seem at any moment to be justified by new scientific knowledge this can not be taken as an instance through which the religious truths can be verified. The astronomical picture of the universe has changed, the biological picture of man is constantly subject to change, while what religion presents has an existential relevance which cannot be affected by the shifting situations of scientific knowledge. If Islam speaks of creation or if it speaks of the Fall of Adam and his temptation by Satan or the Covenant which has been made in pre-eternity, they are just symbols to mark God's dealings with man in a language which is itself a challenge to human understanding. Its sense must vary according to one's own level of insight. There is no question of rejecting them outright as having lost their relevance with the development of scientific knowledge; they stand unaffected in the religious perspective. They are not intended to give us information but only to awaken religious consciousness to mysteries which defy rational clarification. Their seeming ambiguity is itself a significant part of the religious situation.

Now, we have to deal with different levels of understanding corresponding to different levels of reality. On the one hand there is reference to the metahistorical situations which on the face of them clearly speak of their non-historical origin. We can count among them the 'incidents' to which we referred, like that of man's covenant of pre eternity. On the lower level there are events of seemingly

narration is the conception of a primitive state in which man is practically unrelated to his environment and consequently does not feel the sting of human wants, the birth of which alone marks the begining of human culture.[1] No de-mythologisation can be allowed to strip religion of its mystery and of its transcendental reference. The historical critique which has been so much in vogue has its own limitations. This is very much clear in the Christian context. Any hope to present the figure of Christ in a much more satisfactory way through history and in a way which would replace the Christ of faith has failed. We can of course learn much from history which is supported by archaeology, and empirical sciences can throw much light on the persons and the incidents which figure in the scriptures. But history as recorded in the scriptures has a totally different function. It is not meant as an end in itself but is used to serve another purpose: to awaken man's consciousness of the divine involvement in history, to show man in different situations both in his submission to the Will of God, his *Islam*, and more often than not in his betrayal of the divine purpose, his *Kufr*, and has a consequence in his being subjected to penalties which follow from his betrayal. No doubt great credit must be given to historical research in its attempts to unravel many problems. But, as it often happens, historical research cannot take us beyond vague probabilities and the results are constantly questioned by new findings. It is, therefore, quite understandable why Muslims have not responded enthusiastically to the so-called Higher Criticism. It is also clear why any departure in the Quran from the anecdotes and stories which are common to the Bible and the Quran does not allow any negative assessment. If it is a departure, it is not a departure from any events which we know to have happened for certain, but only from the text which can not itself claim to be an authentic historical record. Ibrahim, Ishaq or Ismail as they appear in the Quran must be taken in the Quranic context without any attempt to reduce them into Biblical figures. The figures in the Quran appear in a meaningful context; they have a Quranic relevance and they should be understood with reference to the traditions which are prevalant in a given religion. There is no question of history in either case. A classical example is the birth of Adam as the first man and his Fall due to temptation. The way the Bible relates this story and the way the Quran takes it into account shows many interesting differences

1. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Delhi, 1974, pp.84-85

Now the great problem which besets Islamic consciousness is its equivocal response to modern challenge. Religion as such is confronted with negative forces and Islam is no exception. But the negative forces, if closely examined, may not be completely negative or destructive. However our response to these forces is generally no less negative. No trouble is taken to detect their true significance. One has to know primarily the main thrust of these forces, whether they have developed on some misunderstanding of the religious position or whether they are hostile to a specific religious position or whether they are uncompromisingly anti-religious, no matter what the level of religious position might be. This is specially true about eschatological problems, the nature of heaven and hell, the account of creation, the question of the final reckoning of man before God. Now the whole problem lies in knowing whether these accounts are to be taken in their rigid literary understanding or whether they make use of the human language to convey realities which cannot be expressed except through an idiom with which we are familiar. Semantic clarification will avert much misunderstanding. Now, here, there are two attitudes which are generally prevalent. In recent Christian theology the problem of demythologisation has been much discussed. In our own context this approach may be discerned in the views of Sir Syed Ahmad Khan and, in a more philosophical cloak, in the Lectures of Mohd. Iqbal. But the whole problem lies to distinguish two different attitudes. On the one hand we can say that the so-called myths and legends of religion refer to secular and worldly realities; on the other hand we may affirm that these myths do not refer to worldly realities at all but to transcendental realities which are given expressions in terms with which we are familiar and which represent the scientific and intellectual level of the period in which the Quranic revelation took place. Hence the picturesque and graphic description of Heaven and Hell, of the temptation of Satan, of the primordial covenant (*Mithaq*) between man and God do refer to realities but of such nature that we cannot have any intellectual grasp except to divise their significance according to our own level of understanding. On the other hand Sir Syed Ahmad Khan and Iqbal no less completely ignore their transcendental character and de-mythologise them in a way which if carried out consistently would strip revelation of all its content. Commenting on the Fall of man in the Quranic narrative, Iqbal writes: "I am, therefore, inclined to think that the '*Janrat*' in the Quranic

Though it deals with perennial issues, its answers show constant shift and its response varies from school to school and from philosopher to philosopher. Muslim thought is not exhausted in what our fore-fathers thought, be they philosophers or theologians, and the stigma which has been attached to the philosophical tradition through historical conditi ons should be removed. It is necessary for the rejuvenation of thought to reasses the situation and understand what the problems are. In every period of man's intellectual history philosophical and theological thought developed its own language, and the terms used in the earlier context changed their meaning; and the problems which once had assumed great importance and provoked violent controversies have lost much of their relevance. Muslim thought cannot afford to ignore the problems which have developed in sister religions and cannot formulate its answers in its own terms unless it takes into consideration the answers given by the theologians of the affiliated traditions. Christian theologians like St. Thomas did take into account the contributions of Avicenna and Averroes though their response was different and may have been even negative. But we have to evolve our response in consonance with our own tradition. The theological issues, as that of the nature of God, the nature of soul, the problem of immortality, and the problem of freedom, when they are tackled in the light of reason, can show much common ground and credal differences do not affect their solutions in as decisive a way as one might assume in the beginning. It is of course natural that our response would evolve an eminently Islamic accent and it would lead to a formulation of the problems which fit in the old scheme of thought. On this plane theologians can seek clarification from philosophical reflection. Whether it is theology or philosophy, the solution is the product of the finite human mind; and with whatever pretence the theologian might claim divine guidance still he can falter in interpretation and cannot hope to afford a world view which cannot be disputed theologically from within the confines of his own framework. The history of theological thought in Islam bears this out completely. And though one school of the Kalām is considered orthodox and the other does not enjoy this respectability, there is no reason to think that any one side has full justification and the opposite view has no basis. Unfortunately history can be abused and the old feuds may be considered decided one way or the other by taking into account considerations which have nothing to do with intellectual integrity.

thought is active, be it at the level of philosophy, theology or mysticism, it creates a new language in consonance with the new developments of thought. But if theological thought has come to a standstill and speaks in the old formulae or through borrowed patterns of alien origin, it might easily lead in consequence to misunderstandings. It is also to be noted that even philosophical tradition does not remain stagnant and the concept of philosophy has changed in history. When Muslim theologians speak in denunciation of philosophy even today they have only the idea of philosophy against which al-Ghazzali took cudgels. But philosophy, as we understand today, is not a commitment to any pre-established position but an open enquiry into the nature of being, of knowledge and of religion. The positions are not marked out from the beginning. But the old preconceptions about philosophy still persist and the variety and diversity of philosophical perspectives are completely overlooked The relation between philosophy and theology has always been a subject of debate, though their relation cannot be equated with the relation between reason and faith.

With regard to the relation between theology and philosophy Immanuel Kant made a very pertinent observation. Kant was of course thinking of Christian theology but his observations are equally valid for Muslim theology. He observed that the view according to which philosophy is the handmaid of theology can be accepted provided we know whether she is the handmaid who goes before the Queen with the torch in hand showing the light or whether she is the one who goes behind holding the approns. Philosophical thought has therefore a very important role to play in the clarification of concepts and in the formulation of problems though, of course, it can never serve as a substitute for faith.

Hence it is necessary to respond to the intellectual situation as it is and not to offer combat to forces which are long dead. Modern philosophical and theological perspectives owe much to the Greek heritage but they do not depend on it and corresponding to the changes in the scientific knowledge shifts in the philosophical posture also take place. We still cling to old preconceptions and react to philosophy in the same way in which al-Gazzali and his followers reacted. We do not require any new **Tahafah** now but to examine carefully whatever comes in the name of philosophy. Philosophy is not a body of knowledge which is fixed once for all.

avoured the anti-religious stand and reduced religion to an alternative which could easily be dispensed with and which was not respectable nough to gain adherence in the scientifically-minded world, there were other developments which shook the complacancy of the scientifically-riented thought. It was first of all in physics that the old vision of a mechanistically-determined universe lost ground, and a rigid determinism was shattered in favour of a statistical view of casuality, and the con-ept of matter lost its classically-conceived substantiality. It is worth-while to refer to the statement of an eminent scientist who himself took n active part in the reassesment of the basic concepts in physics. Werner Heisenberg observes : "Our attitude toward concepts like mind r the human soul or life or God will be different from that of the nine-eenth century, because these concepts belong to the natural language nd have therefore immediate connection with reality. It is true that e will also realize that these concepts are not well defined in the scien-ific sense and that their application may lead to various contradictions. For the time being we may have to take the concepts, unanalysed as hey are ; but still we know they touch reality. It may be useful in this onnection to remember that even in the most precise part of science, n mathematics, we cannot avoid using concepts that involve contradic-ions. For instance, it is well known that the concept of infinity leads o contradictions that have been analysed, but it would be practically mpossible to construct the main parts of mathematics without this con-ept "[1] This raises grave doubts about the ability of the scientist even o provide a picture of the universe which would satisfy religious con-ciousness. But these developments at least favoured a view of the niverse which was till now necessarily supposed to be incompatible with the scientific spirit. Nonetheless, to see and discover what religion s, one has still to go to religions and to religious persons in whom eligion finds expression. Now when we come to Islam as a religious manifestation we have first to take into account the unfortunate fact that Muslim theology has not risen to the occasion and Muslim thought till moves in patterns which have been marked out for it at a time when Islamic theology crystallised itself in response to challenges which took shape from the impact of Greek thought. The crisis to which Muslim thought is subject today must be understood at different levels. The issues of *al-Kalam* as they were debated within the confines of the *Mu'tazilah* and *Asha'irah* perspectives need to be refor-mulated and given expression in a different language. Whenever

1. Werner Heisenberg : Physics and Philosophy, London, 1958, p. 172.

the political sphere also the pattern of the state as it emerged in the early days of Islam calls for careful study. But historical conditions change and what we know of city life today is different from what we learn of city in ancient times. The world population has increased enormously and democracy as understood by the Greeks has been completely transformed in modern conditions. Hence it is not advisable to overstress Islamic socialism because all these movements have different connotations at different times. Now Muslims who visualise a glorious future for their community mostly see it in terms of power and dream of a world when all Muslims should be united for a common cause. The world as we know it however shows a great cleavage between what is and what ought to be; between what is desirable and what is realisable. Unless we are realistic enough to know the limitations under which we labour in the conditions of history, we are apt to lose our balance and fritter our energies for ends which are not realisable in the given conditions.

Islam cannot be considered in isolation from the crisis of religious consciousness as a whole. Islam is not a regional or national manifestation but a world phenomenon and every ripple which disturbs man in the world cannot leave Islam unaffected. Whatever affects the developed nations which are subject to Christian influence affects no less violently the Muslim minds. In the recent past, man's commitment to religion has been challenged from varied sources. First it was the theory of evolution which challenged the theory of creation as it is understood under the influence of the Hebrew tradition. Earlier it was the displacement of the Ptolemic view of the universe, with man as its centre, by the Copernican revolution which made man a puny member of a vast universe. And no less disturbing was the influence which emanated from certain theories in psychology and psychopathology; and, under the influence of Freud; religion was considered nothing but an illusion born of repressed wishes. And further the situation was complicated by the so called Higher Criticism which tried to examine the Biblical data through historical evolution. Thus religion was subjected to a multipronged assault; and there came in addition the challenge from the Marxist interpretation of history which does not recognise any other determinents of history save the economical. But, inspite of the tremendous prestige of science and scientific methodology, the religious situation was not completely shaken. Religion survived all these assaults. Though its impact on the youth and its influence in terms of numbers might have decreased, it is still a force to be reckoned with. Side by side with developments which

Hence what is more important is the commitment to the creed and still more significant is the personal realisation. The state can look only to the externals, to discipline and regulation of life. It has no means by which it can judge what passes within the consciousness of man. It cannot intrude into individual privacy. While this emphasis on the state and the political dimension of life and the regulation of social conduct by religious norms cannot be ignored, Islam reaches beyond its external manifestation and its attention is not confined to this world but extends to the world which it envisages as transcending the limitation of time and space as we know them. Hence it often happens that the political quest for power becomes dominant and, if circumstances favour, it can become aggressive and militant. But the modern man in affluent societies, where economic growth and social comforts have reached their maximum limit, still seems dissatisfied and seeks his satisfaction often in oxotic experiences and as a consequence he develops strong reaction against his own past. Psychiatrists tell us that the modern man, which means for them the man of the West, has lost his zest for life, because the institution which made his life meaningful has lost for him any relevance, and the institution was religion. Dr. Frankl's observations deserve careful attention :

"Man's primary concern is to find and fulfil meaning and purpose in lite. Today, however, ever more patients relate the feeling of a profound meaninglessness or, as one could call it in contradiction to Maslaw's peak experience—an 'abyss-experience'. In logotherapy, this inner void is referred to as the 'existential vacuum'. In cases in which it results in a neurosis, this is termed in logotherapy a 'noogenic' neurosis in contradiction to the psychogenic neurosis which is the neurosis in the conventional sense of the word."[1] With the loss of religious commitment man has lost his moorings, and the existentialist therapy tries to restore meaning to him, and once he sees meaning in life he finds his full recovery. This means that Islam has a relevance in more than one dimension and any one dimentional approach to religion brings in its wake a betrayal of its original thrust.

The Muslim revivalist movements try to develop a one-dimensional consciousness. Often the mystic heritage is ignored. What is emphasised is the economic and the political dimension. No doubt the Islamic approach to economic problems deserves our attention and in

---

1. E. Frankl Universitas: Logotherapy and Existential Analysis, English edition, 1967, pp. 77-78.

from time to time by men of deep religious concern who can inform religion with life, religion soon becomes petrified and its value lies only in its social dimension which brings members of a community together and gives them a sense of identity. Our young men and women are subject to influences which are hostile and when our sources of inspiration are foreign we learn our own culture and tradition through the eyes of strangers; and what we learn from our own sources seems insipid and lifeless as against the breezes which blow from outside. In these conditions the younger generation, disillusioned with its own past, grows either actively hostile or at the most indifferent. This is really the situation in which we as Muslims stand today.

It is clear that the Muslim mind cannot be expected to respond to the challenges of the modern world in a uniform way. The present day world, especially in developing countries, is extremely politicised and existential questions are eclipsed by political considerations. When we think of the future of Islam and of Muslims we think it in terms of power politics and in terms of political future as a dominant factor in the power game. There is no doubt that politics and religion are linked in Islam and the concept of a Muslim state as a world state has dominated the imagination of Muslims. But it should not also be forgotten that power has never enjoyed the first priority and the state is never considered an end in itself.

It is encouraging to note that some of our eminent Muslim scholars have rightly questioned the exclusive emphasis which is given in some quarters to the Divine sovereignty at the expense of His other attributes. Maulana Abul Hasan Ali Nadvi's critical assessment of Maulana Maudoodi's understanding of Islam may serve as an interesting example. "That the relation of God and man finds its most characteristic expression in the relationship of the sovereign to His subjects, or of command and obedience, does not give justice to the man-God relationship".[1] It is, as Abul Hassan Ali Nadvi points out, much more. "However natural a corollary it might be of one's commitment to Islam, it is only a part and for that a limited one, of God's relationship with man, not the whole of it. It is much more subtle, more comprehensive, deeper and delicate".[1]

1. The understanding and Interpretation of *Din* in our Times, Lucknow, 1978, p. 54

Islam and Modern Challenges

The religous situation in its global perspective presents a very confused picture. It is obvious in one respect that man's commitment to religion has slackened in the last few decades and a process of secularisation has set in. The reasons are many. One of the most obvious is the mechanisation of life with the advancement in science and technology. The tremendous advancement in technology and the new social conditions created by it have shifted man's attention from the perennial problems of human existence and made him more conscious of his earth-rootedness. Even philosophy of the West, which in spite of its secular and rational stance was nourished in religious pathos, has become alienated from its tradition and the link with theological issues has been snapped in the recent past. There was a time when philosophers who did not recognise theological assumptions and even undertook to subject the traditional proofs of the existence of God always retained interest in metaphysical questions. It is even said of Hegal by his critics that he was above all a theologian and remained always a theologian. Kant's aim was not to demolish metaphysics as such but to demarcate the bounds of discursive reason and rational knowledge. However, in the recent past even when philosophers take their sustenance from the religious tradition and speak a language which is reminiscent of Christian experience, they remain earth-bound with a vengeance. This is specially true of the philosophy of Martin Heidegger. Again in the realm of practice great changes have occurred in consciousness of values. Life has been commercialised at all levels. Success has become a new idol which man worships And the brutal exploitation of developing nations by the Western powers has evoked a sharp reaction among the masses in the developing countries and, as a result, strong leftist ideologies have found a favourable soil for their propagation. Naturally the leftist perspective has always taken a rejectionist stand in relation to religion. Religion has been understood to be an opiate to the masses which is used as a means for exploitation by the rich as against the poor. This again means that dissatisfaction with religion has primarily developed in the economic context and, as the Church often associated itself with the Establishment, with remarkable exceptions of course, the ire of the revolutionaries turns with a fury against religion itself. Apart from these factors it is also to be noted that if religion is not sustained

if it provokes others to give a better perspective I will remain satisfied.

I am thankful to Dr. Abid Raza Bedar, Director Khuda Bakhsh Oriental Public Library, without whose initiative I could not have undertaken the responsibility of giving these Lectures. I really do not know how far I have been able to justify his choice for the honour that has been conferred on me. I am also thankful to Mr. S. Riaz Ali Perwaz of the Institute of History of Medicine and Medical Research for his effective help in the preparation of the manuscript

SYED VAHIDUDDIN

PREFACE

The Muslim world is in a state of turmoil. Though the Oil boom has made some of the Islamic countries richest in the world, they have yet to realise that this phenomenal afluence cannot be a lasting asset. Needless to say that wealth always brings in its wake serious risks. It creates complacency and, in countries where there is a feudal set-up, it fosters the tendency to suppress with all their might any attempt, however well motivated, to change the status quo. And it is also assumed that economic prosperity is sufficient unto itself and the temptation is strong to look down upon the fellow-believers who are wallowing in abject misery in other countries. Theological stagnation is perpetuated and there is no effort worth the name to re-think what their forefathers had thought in a given situation of history. Any deviation from the familiar pattern of Islamic living is denounced as innovation, and, instead of promoting ecumenic tendency only the school of thought to which one is committed is given theological credence and all differences are looked upon with suspicion. Hence when my friend Dr. Abid Raza Bedar invited me to deliver Khuda Bakhsh Memorial Lectures, I took this opportunity to speak to myself what I have been thinking all the time. Whatever I have written on Islam I consider more as a confession than an objective and adequate estimate of Islamic thought and experience. I have always felt that Islamic thought cannot be reduced into a monolithic structure but allows different options and alternatives in interpretation not only on a metaphysical level but also in relation to social problems and challenges. I hope all that I have written will be taken for what it is worth, and

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1979 - 80.

Khuda Bakhsh Annual Lectures
are delivered every year
by some eminent scholar of
Persian, Arabic or Islamic
Studies.

Mr. Q. A. Wadood,
Dr. Md. Zubair Siddiqi,
Prof. A. A. A. Fyzee,
Prof. Nazir Ahmad,
Dr. S. A. H. Abidi
Prof. S. H. Askari,
Dr. Hashim Amir Ali,
Prof. S. Maqbool Ahmad.
Dr. Bruce B. Lawrence,
were the forerunners
in the series to which

Prof. S. Vahiduddin
contributed in 1980.

Printed by **Hindustan Printing Works, Rampur — 1983.**

Khuda Bakhsh Annual Lectures Series—10

MUSLIM THOUGHT

In a Changing World

by

Prof. S. VAHIDUDDIN

Head, Department of Comparative Religion, Indian Institute of Islamic Studies, *formerly* Professor of Philosophy, Usmania and Delhi Universities.

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA

College and Professor Emiratus, Nalanda Medical College Patna. For details *see* p. 264 of this Journal.

* Mr. Syed Ali Abbas (b. 1911) educated at Patna University, entered in Indian Police Service (IPS) in 1936. For details *see* p. 265 of this Journal.

* Mr. Hasan Ahamad Qadri (b. 1923) educated at Nadwatul Ulama, (Lucknow), Madrasa Hamidiya, (Darbhanga) and Shamsul Huda (Patna) For details *see* p. 268 of this Journal.

* Mr. Syed Ahmad Ali Azad (b. 1907) educated at Jamia, one of the leaders of Jamia Movement. Died in 1976. For details *see* p. 269 of this Journal.

* Dr. Rashid al-Wahidi (b. 1942) Fazil from Deoband, M.A. and Ph. D. from Delhi University. Working as Lecturer in Jamia since 1973. For details *see* p. 272 of this Journal.

* Mr Sadanand Mandal (b. 1926). Graduated in Agriculture from Sabor, (Bhagalpur). Working as Incharge of Gardening in Raj Bhawan, Patna. For details *see* p. 273 of this Journal.

* Hm Ashraf Karim (b. 1923) Fazil from Shamsul Huda, Patna. Formerly principal, Govt. Tibbi College, Patna For details *see* p. 276 of this Journal.

* Mr Shahid Ram Nagri (b. 1927), formerly editor of 'Al-Kalam', Patna. Working as Chief Editor of 'Naqeeb' of Imarat-i-Shariyah, Bihar. For details *see* p. 277 of this Journal.

* Mr. Mahboobur Rahman Akmal Yazdani (b 1929) educated at Jamia, M. A. from Agra University, working in Deedar Bakhsh High School, Purnea. For details *see* p. 281 of this Journal.

* Mr. Shah Manzar Husain (b. 1924 *Approx*) A Science graduate from Aligarh. For details *see* p. 299 of this Journal.

* For others *see* Journal 1, 12, 19 & 20

- Mr. S. Bahauddin Ahmad (b. 1911) formerly District and Session Judge, Bihar, and Member Bihar Public Service Commission, Patna. For details *see* p. 224 of this Journal.

- Mr. Sayeed Ansari (b. 1904) educated at Kashi Yidyapith Banaras and Jamia Millia Aligarh; graduated in Education from Columbia University, New York. For details *see* p. 226 of this Journal.

- Hm. Abdul Ahad (b. 1912), Fazil in Tibb and Surgery from Tibbiya College, Delhi. Formerly Dy. Director, Public Health Department (Unani). For delails *see* p. 233 of this Journal.

- Mr. Oneil De (b. 1919) educated at Patna University, formerly Associate Secretary, Bihar Academy of Music, Dance & Drama (1955-1960). For details *see* p. 239 of this Journal.

- Hm. Zillur Rahman (b. 1940), educated at Nadwatul Ulama, Lucknow and Ajmal Khan Tibbiya College, Aligarh. Working as Head, Deptt. of Ilmul Adviya, Ajmal Khan Tibbiya College Aligarh. For details *see* p. 245 of this Journal.

- Mr. Naqi Ahmad Irshad (b. 1920) grandson of Shad Azimabadi, M. A. (History). Formerly ADM and Joint Secretary, Bihar. Retired in 1979. For details *see* p. 249 of this Journal.

- M. Abdul Hai Betab Siddiqi, (b. 1927) Fazil from Shamsul Hoda, Patna, one of the freedom fighters, worked as journalist and thereafter Joined Raja Ram Mohan Roy Seminary as teacher. For details *see* P. 253 of this Journal.

- Mr. Syed Mohammad Ahmad (b. 1935), Graduated in Agriculture from Ranchi University and obtained diploma in Tea from Tocolai (Assam). For details *see* p. 257 of this Journal.

- Mr. S. Shah Riyazur Rahman (b. 1921), educated at Patna University Formerly Member, Patna Municipal Corporation. For details *see* p. 260 of this Journal.

- Mr. Anwar Kareem (b. 1916), M. Sc. from Aligarh (1939); appointed as Deputy Collector in 1941 and promoted to the senior scale of IAS. For Details *see* p. 216 of this Journal.

- Dr. Masoodul Haq (b. 1901) Graduated from Patna Medical College, formerly Head, Deptt. of Anatomy, Patna Medical

Our Contributors

- Prof. S. Vahiduddin (b. 1909) educated at Osmania University, Hyderabad & Marburg University, Germany; formerly Professor & Head, Deptt. of Philosophy, Osmania & Delhi Universities. Since 1973, working as Research Professor in the Institute of History of Medicine, New Delhi, and as Head of the Deptt. of Philosophy of Religions in the Indian Institute of Islamic Studies, New Delhi.

  Author of more than 25 books on Philosophy, Mysticism and Comparative Religion as also on Iqbal, Hafiz and Goethe. His doctoral thesis on "Experience of Value", written in German Language was published in 1937.

- Dr. Barakat Ahamad (b. 1919), M. A. from Sydney, Ph. D. from American University, Beruit & D. Litt from Tehran University; formerly Indian High Commissioner/representative to various contries. For details *see* p. 154 of this Journal.

- Mr. Hasnain Syed (b. 1917) Graduated from Jamia Millia, was president of Students' Union, Jamia College and Editor of its organ 'Jauhar'. For details *see* p. 174 of this Journal.

- Dr. Riyazur Rahman Sherwani (b. 1924), specialised in Arabic from University of Cairo. Ph. D. (Arabic Literature) from Aligarh. Since 1983 working as Professor of Arabic, Kashmir University. For details *see* p. 187 of this Journal.

- Mr. Ishtiaq Mohammad Khan (b. 1931) Graduated from Muslim University, Aligarh, set music to the song of Aligarh. Presently warden of Jafar Sulaiman Muslim Students Hostel, Bombay. For details *see* p. 206 of this Journal.

- Mr. Amanullah Khan Sherwani (b. 1926) educated at Muslim University, Aligarh and Birmingham University (Britain). For details *see* p. 214 of this Journal.

- Dr. S. Abdul Majeed Shams (b. 1897 *Approx*) M.A. from Aligarh, Ph. D. from London. Formerly Principal College of Commerce, Patna. Died in 1983. For details *see* p. 224.

CONTENTS

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the material preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or having any concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

3. Notes and Addenda, by way of corrections and additions to any information published in this Journal or in any publication of the Library e. g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

Rs. 45 00 per copy
Annual subscription Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S.A. & Other Countries : 24.00 Dollars

Printers : Patna Litho Press, Patna-4—————and
Hindustan Printing Works, Rampur (U. P.)

Publisher. Mahboob Hussain, for Khuda Bakhsh O. P. Library, Patna

Editor : Dr. A. R. Bedar

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

No. 21-22-23

1982

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA - 800 004
(INDIA)